ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ

شمالی افریقہ میں المرابطین اور الموحدون کا دورِ حکومت پانچویں صدی ہجری کے وسط سے ساتویں صدی ہجری کے وسط تک تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے ـــــ یہ زمانہ اس خطۂ ارض کی تاریخ کا ایک شاندار اور ولولہ انگیز باب ہے۔

مجاہدِ کبیر یوسف بن تاشفینؒ کے بعد دولتِ مرابطین تو جلد ہی زوال پذیر ہو گئی لیکن اس کی جانشین ـــــ دولتِ موحدین تقریباً ڈیڑھ صدی تک طبل و علم کی مالک بنی رہی۔ ـــــ اگر ایک طرف افریقہ میں اس کے اقتدار کا پھریرا مراکش، تیونس، الجزائر اور لیبیا وغیرہ پر اُڑ رہا تھا تو دوسری طرف یورپ میں اس کا پرچم اقبال اسپین اور پرتگال پر لہرا رہا تھا ـــــ تیسرے موحد فرمانروا ابو یعقوب منصور باللہ کا عہدِ حکومت سلطنتِ موحدین کے منتہائے عروج کا زمانہ ہے اس کی شوکت و سطوت، معارف پروری اور جہاد کے معرکوں میں اس کی کامیابیوں نے اس کے مداحین کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔

یہ کتاب اسی عظیم فرمانروا ابو یعقوب منصور باللہ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے اسے نامور مؤرخ جناب طالب ہاشمی نے نہایت تحقیق و تفحص کے ساتھ بڑے دلآویز پیرایہ میں قلمبند کیا ہے۔ اس میں تاریخِ اسلام کے ایک اہم اور شاندار باب کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ آپ کی معلومات میں یقیناً بیش بہا اضافہ کا موجب ہو گا۔

محمد احسن

○

قیمت پچیس روپے ۲۵/-

ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ

طالب ہاشمی

قومی کتب خانہ ○ لاہور

نام کتاب : ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ

مؤلف : طالب ہاشمی

ناشر : قومی کتب خانہ لاہور

طابع : نسیم ہمایوں

مطبع : تعمیر پرنٹنگ پریس ۱۹- فیروزپور روڈ- لاہور

اشاعتِ اوّل : اگست ۱۹۸۲ء

تعداد : دو ہزار (۲۰۰۰)

کتابت : محمد حفیظ قریشی، دھیدووالی (ضلع سیالکوٹ)

قیمت : پچیس روپے صرف (۲۵/-)

فہرست مضامین

اہم حواشی

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تو نے ؟
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدّن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں اَلفقرُ فخری کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیّل سے فزوں تر ہے وہ نظّارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیّارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

(اقبالؒ)

حامداً ومصلیاً

مقدمہ

(جناب قدر آفاقی ایم اے)

کرۂ ارض کے مختلف خطوں کی حدود مختلف اَدوار میں بدلتی رہتی ہیں حتیٰ کہ ان کے نام بھی عملِ تغیّر سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ تغیّر قانونِ قدرت کی بنیاد ہے۔ اس ہمہ گیر قانون سے کسی جاندار یا بے جان شے کو مفر نہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ تغیر و تبدّل کی راہِ مسلسل پر ہر لحظہ پوری رفتار اور آب و تاب کے ساتھ گامزن ہے۔ اس کی منزل کہاں ہے۔ اور انجام کیا ہے؟ اس کا علم صرف خالقِ کائنات ہی کو ہے۔ فاصلوں میں فرق ہو سکتا ہے ۔ رفتاریں بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ مگر کائنات کا کوئی ذرّہ ٹھہراؤ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ زمان و مکان اور سکون و ثبات کے مرحلے تو انسانی شعوب و قبائل کی طرح لِتَعَارَفُوا کے مظاہر ہیں۔ ورنہ نظامِ قدرت میں تو ؎

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

کبھی بابل و نینوا کی تہذیبوں کا غلغلہ ہے تو کبھی قیصر و کسریٰ کی سطوت کے پھریرے فضائے بسیط میں لہرا رہے ہیں۔ سکندر کا باپ فیلقوس یونان کی چھوٹی سی ریاست مقدونیہ کا سربراہ ہے۔ مگر جب بیٹے کی باری آتی ہے تو وہ سکندرِ اعظم

بن کر اکنافِ عالم میں اپنی برتری کے نشان ثبت کرنے لگتا ہے۔ کرۂ ارض اور انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس جولانگاہِ ارضی میں چشمِ فلک نے بنی نوعِ انسان کی رفعتوں اور پستیوں کے بے شمار مناظر دیکھے ہیں اور یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔

ارشادِ ربانی "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خلیفہ" کے مطابق حضرتِ انسان ہی اسی ارضی دلہن کا دُولہا ہے۔ اور باقی مظاہرِ قدرت محض لوازماتی درجہ کے حامل ہیں۔ کبھی انسان شدّاد و نمرود کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی فرعون کی صورت میں "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" کا نعرہ لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قدرتِ کاملہ ابراہیمؑ خلیل اللہ اور موسیٰؑ کلیم اللہ کے ہاتھ سے نمرودی اور فرعونی طلسمات کو پاش پاش کراتی دکھائی دیتی ہے۔

فاضلِ یگانہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک مضمون میں اس موضوع پر کیا خوب لکھا ہے کہ:۔

> "یہ حوادث آباد عالم جس کو ہم تم قائم مستمر اور مسلسل جان رہے ہیں، ہر آن و لمحہ اس طرح بدل رہا ہے کہ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جو نقشہ، جو کیفیت، جو صورتِ حال اِس آن ہے وہ اُس آن نہیں، ایک مستمر تغیر اور ایک مسلسل انقلاب جاری ہے اور پردہ دار کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (ہر روز ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہے) لیکن با اینہمہ انقلاب و تغیر بظاہر اس کے قیام استمرار اور تسلسل میں فرق نہیں آتا۔ سمندر کی لہریں ہر آن بدل رہی ہیں مگر سمندر کی صورت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، صورتیں مٹتی جاتی ہیں، شکلیں فنا ہوتی جاتی ہیں مگر اس آئینہ خانہ کی آبادی اور صورت گری میں کوئی فرق نہیں آتا،
>
> خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی"

اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے وہ چاہتا ہے کہ انسانوں کی آزمائش کرے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کر کے اپنے تخلیقی نظام کی تکمیل کرے۔ وہ انسان کو نطفہ، لہو کی پھٹکی، اور جنین وغیرہ کے مرحلوں سے گزار کر احسن صورت میں اس دنیا میں لاتا ہے۔ یہ ناتواں اور ناسمجھ ہوتا ہے۔ پھر اسے بتدریج بھرپور قوت اور عقل و دانش عطا کرتا ہے تاکہ دیکھے کہ کون اپنے رب کا شکر گزار رہا اور کون منکر و متکبّر۔ کون حق کا ساتھی ہے اور کون باطل کا پیرو

اس تجزیاتی عمل کی تکمیل کے لیے حق تعالےٰ نے اپنی طرف سے سچ کے علمبردار بھیجے جن کو عرفِ عام میں انبیاء علیہم السلام کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے اپنے دور میں حق و صداقت اور نورِ ہدایت کے مینار تھے۔ سب سے آخر میں سیّد المرسلین خیر الخلائق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دنیا میں تشریف لا کر رسالت اور نبوت کے مقدّس سلسلہ کی تکمیل کر دی۔ فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والی یہ ازلی روشنی حجازِ مقدّس کو جگمگاتی ہوئی عہدِ صدیق اکبرؓ میں اقصائے عالم میں پھیلنے لگی۔ پھر عمر فاروقؓ کے دَورِ عدل گستر میں جہاں اس نورِ مقدّس نے شام و ایران اور مصر و فلسطین سے باطل کی ظلمتوں کو کافور کیا۔ وہاں شمالی افریقہ بھی اس نور کی برکات سے محروم نہ رہا۔ شمالی افریقہ، جو آجکل لیبیا، الجزائر، تیونس اور مراکش کے نام سے چار آزاد مملکتوں پر مشتمل ہے، قدیم زمانے میں یہاں بربر نامی قوم آباد تھی جو مملکتی حدود سے بے نیازانہ بسر اوقات کرتی تھی۔ ۸۳۰ ق م میں فنیقیوں نے تیونس کے علاقے میں باقاعدہ حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا صدر مقام "کارتھیج" (قرطاجنہ) تھا۔ قریباً چھ سو سال تک یہ حکومت قائم رہی۔ پھر اس کو رومیوں سے صد سالہ جنگ لڑنا پڑی جس میں بالآخر اہلِ روما کو اس سرزمین پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ پانچویں صدی عیسوی میں "ونڈال" نامی وحشی قوم نے رومیوں کو شکست دے کر اس علاقے

پر قبضہ کر لیا۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی میں اہلِ روما نے دوبارہ اس خطّہ کو فتح کر لیا اور حسبِ سابق وہاں اپنی شان و شوکت کے ڈنکے بجانے لگے۔

حضرت عمرؓ فاروق کے دورِ خلافت میں اس علاقے پر رومیوں ہی کی حکومت تھی۔ اسلامی فوجوں نے پہلے برقہ اور پھر حضرت عثمانؓ غنی کے عہد میں طرابلس الغرب (لیبیا) کو فتح کر لیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دَور میں اس طرف بھرپور توجہ دی گئی اور شمالی افریقہ کے متعدد مقامات پر پرچمِ اسلام بلند کر دیا گیا۔ آئندہ چند سال کے اندر اندر عقبہؓ بن نافع نے قریب قریب سارے شمالی افریقہ کو مسخّر کر لیا لیکن بدقسمتی سے وہ ۶۴ھ (۶۸۴ء) میں اپنے تین سو ساتھیوں سمیت دشمنوں کے نرغے میں آکر شہید ہو گئے اور شمالی افریقہ کے حالات پھر دگرگوں ہو گئے۔ ۶۹ھ (۶۸۹ء) میں عبدالملک بن مروان نے زہیر بن قیس کی زیرِ سرکردگی ایک لشکر روانہ کیا۔ جس نے اگرچہ بربریوں وغیرہ پر فتح پالی مگر زہیر اور ان کے ساتھی بھی اہلِ روما سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور شمالی افریقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۷۴ھ (۶۹۴ء) میں مسلمان پھر اس طرف متوجہ ہوئے اور چار سال کے قلیل عرصہ میں از سرِ نو شمالی افریقہ پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔ ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اندلس بھی مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور بنو امیّہ کی حکومت کے خاتمہ یعنی ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) تک اس علاقے پر مختلف امیر مقرّر ہوتے رہے۔

۱۳۸ھ (۷۵۵ء) میں ایک اموی شہزادے عبدالرحمٰن نے اندلس میں آزاد حکومت قائم کر لی۔ اور بقیہ بلادِ مغرب ۱۷۳ھ (۷۸۹ء) تک بنو عبّاس کے زیرِ انتظام رہے اسی سال بنو ادریس نے مراکش میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی۔ اور بنو عبّاس کے قبضے میں صرف تیونس، الجزائر اور طرابلس رہ گئے۔ لیکن وہاں بھی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ آخر ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) میں ابراہیم اغلب تمیمی نے ہارون الرشید کی اجازت سے افریقہ میں دولتِ اغالبہ کی بنیاد ڈالی۔

یہ حکومت ۲۹۶ھ میں اسماعیلیوں نے چھین لی اور دولتِ فاطمیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اب گویا سارے شمالی افریقہ سے عباسیوں کا تعلق یکسر ختم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد فاطمیوں نے مراکش بھی فتح کر لیا۔ پھر اٹلی پر لگاتار حملے شروع کر دیئے حتیٰ کہ وہاں کی حکومتِ قلوریہ نے فاطمیوں کو خراج دینا منظور کر لیا۔ ۳۵۸ھ میں فاطمیوں نے مصر کو بھی فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اور اسے دارالخلافہ قرار دے کر مدتوں بڑی شان و شوکت سے حکومت کرتے رہے۔

پانچویں صدی ہجری میں مرابطین کا ظہور ہوا۔ انہوں نے مراکش، تیونس، الجزائر اور طرابلس الغرب وغیرہ کے وسیع علاقے فتح کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ اندلس میں اُن دنوں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ مرابطین نے اسے ختم کر کے اندلس کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اور یوں ان کا اقتدار افریقہ اور یورپ دونوں براعظموں تک پھیل گیا۔ مرابطین کی حکومت ۵۴۱ھ میں ختم ہو گئی اور ان کی جگہ موحدین طبل و علم کے مالک بنے۔

دولتِ موحدین کا بانی محمد بن تومرت تھا۔ اس کی وفات کے بعد عبدالمومن بن علی اس کا جانشین ہوا۔ اس نے امیرالمومنین کا لقب اختیار کر کے اپنا تعلق خلافتِ عباسیہ سے یکسر منقطع کر لیا۔ عبدالمومن ایک بہادر اور اولوالعزم فرمانروا تھا۔ اس نے نارمن عیسائیوں کو شمالی افریقہ کے چپے چپے سے بزور نکال باہر کیا اور خلافتِ موحدین کو نہایت مستحکم بنیادوں پر استوار کر دیا۔

یعقوب المنصور اسی عبدالمومن کا پوتا تھا۔ وہ ۵۸۰ھ میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوا۔ مؤرخین نے اسے موحد فرمانرواؤں کے سلسلے کا گوہرِ تابدار قرار دیا ہے۔

یہ کتاب شمالی افریقہ کے اسی اولوالعزم فرمانروا کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے جسے ہمارے فاضل دوست جناب طالب ہاشمی صاحب نے سپردِ قلم کیا ہے۔

یعقوب المنصور کا شمار اُن دس "رائل ہیروز آف اسلام" میں ہوتا ہے۔ جن کے حالات قلمبند کرنے کا ارادہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے فرمایا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور وہ "الفاروق" اور "المامون" کے علاوہ اس سلسلہ کی کسی دوسری شخصیت پر کچھ نہ لکھ سکے۔ ان کے قابل جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ اس طرح تاریخ افریقہ کا ایک اہم باب شبلیؒ اور سید سلیمانؒ جیسے اہلِ کمال کی گلفشانیٔ تحریر سے محروم رہ گیا۔ جو ایک المیہ سے کم نہیں۔ بے مایہ اردو زبان کو جناب طالب ہاشمی کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس قومی فرض کو اپنی بساط کے مطابق ادا کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ انہوں نے بڑی محنت، جانکاہی، دیدہ ریزی اور تحقیق و تفحص کے ساتھ زیرِ نظر کتاب لکھ کر ایک قابلِ تحسین کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آنے والا مؤرخ یعقوب المنصور پر قلم اٹھاتے وقت ہاشمی صاحب کی اس مؤقر کوشش کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے میں کافی دشواری محسوس کرے گا۔

فاضل مؤلف کا اندازِ بیان نہایت متوازن اور متین ہے۔ اگر ان کو کسی واقعہ کے بارے ایک سے زیادہ اہم اور وقیع روایات ملی ہیں تو انہوں نے سب کا اجمالی ذکر کر کے نتائج اخذ کرنے کی ذمہ داری قارئین کے سپرد کر دی ہے۔ البتہ جہاں کہیں ضروری سمجھا ہے مدلل طریق سے اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کا حسین مرقع نظر آتی ہے۔ بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش بھی لائق تحسین ہے۔ مثلاً ملثمین کے مردوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خود زنانہ لباس اور پردہ کو اپنائے ہوئے تھے جبکہ ان کی عورتیں مردانہ لباس پہن کر آزادانہ مردوں کی طرح پھرا کرتی تھیں۔ جناب طالب ہاشمی نے علامہ ابنِ خلکان کے حوالے سے وضاحت کی ہے کہ لمتونیوں

کے گھر والوں پر ان کی عدم موجودگی میں دشمن بار بار چھاپے مارتا اور زک پہنچاتا تھا۔ ایک دفعہ دشمن کو دھوکا دینے کے لیے لمتونیوں نے عورتوں کو مردانہ لباس پہنا کر گھروں سے باہر بھجوا دیا اور خود عورتوں کے بھیس میں دشمن کے حملے کا انتظار کرنے لگے۔ چنانچہ جب دشمن حملہ آور ہوا تو مقابلہ میں ایسی منہ کی کھائی کہ آئندہ کبھی اسے لمتونیوں پر حملہ کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ یہی بات قدرے وضاحت اور اختلاف کے ساتھ ابن اثیر نے بیان کی ہے۔

اس واقعہ کے بعد لمتونی قبیلہ کے مردوں نے چہروں پر ڈھاٹا اور نقاب اوڑھنے کی رسم کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ کہتے ہیں کہ ان کے اخلاف (جن کو طوارق کہتے ہیں) آج بھی یہ شعار اپنائے ہوئے ہیں جب کہ ان کی عورتیں بے پردہ اور آزادانہ گھومتی نظر آتی ہیں۔

فاضل مؤلف نے نہ صرف یعقوب المنصور کے حالات شرح وبسط کے ساتھ پیش کیے ہیں بلکہ شمالی افریقہ کی قدیم تاریخ اور جغرافیائی پس منظر بھی مختصراً اور بالترتیب پیش کر کے قارئین کی تشنگی دور کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سلسلے میں اہم شخصیات، واقعات اور مقامات کے بارے میں تشریحی اور اضافی "نوٹ" بھی دیئے ہیں۔ اس طرح کتاب کی افادیت میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔

کتاب کا ایک باب یعقوب المنصور کے عہد کے چند ارباب کمال کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ ان سرآمد روزگار ہستیوں کے وقائع حیات اور نظریات غیر جانبدارانہ انداز میں بیان کیے ہیں۔ ایک اور باب میں فاضل مؤلف نے یعقوب المنصور کے چند ہم عصر فرمانرواؤں کے حالات بھی پیش کر دیئے ہیں تاکہ اس دور کے ماحول اور گردوپیش کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

کتاب کی خوبیاں گنوانا تحصیل حاصل ہے۔ جوں جوں قارئین مطالعہ کرتے جائیں گے

خوبیاں از خود اجاگر ہوتی جائیں گی۔ مؤلف ایک کہنہ مشق اور وسیع المطالعہ شخصیت ہیں۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی متعدد تصنیفات اور تالیفات قوم کو دی ہیں جن میں تاریخ وسوانح کے علاوہ دعوتِ عمل بھی ہے اور درسِ عبرت بھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مؤلف کی یہ سعیٔ مشکور نہ صرف اردو زبان کی خدمت کا نشانِ امتیاز ہے بلکہ پاکستان کے علمی اور ادبی سرمایہ میں بھی گرانقدر اضافہ ہے۔ اُمید ہے کہ اربابِ علم ودانش اس کتاب کی ویسی ہی پذیرائی کریں گے جس کی یہ مستحق ہے۔

مؤلف ایک گوشہ نشین آدمی ہیں۔ وہ گزشتہ تیس سال سے بڑی خاموشی کے ساتھ علم وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کو اس میدان میں بیش از بیش کارنامے انجام دینے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

احقر قدر آفاقی

لاہور - ۶ مئی ۱۹۷۸ء

حرفِ آغاز

شمالی افریقیہ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے، وہاں کے بلند ہمت مسلم فرمانرواؤں نے نہ صرف برِّ اعظم افریقیہ کی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مترتب کیے بلکہ اُس دَور کے اسلامی اندلس (ہسپانیہ) کی حفاظت بھی کی اور بارہا وہاں کے مسلمانوں کے سروں سے مصائب کے دَل بادل بھی دُور کیے۔ شمالی افریقیہ قرنِ اوّل سے لے کر آج تک اسلام کا حلقہ بگوش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ کئی آزاد اور خود مختار ملکوں میں تقسیم ہو چکا ہے لیکن بہرصورت یہ تمام ممالک الگ الگ بھی اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہیں مسلم شمالی افریقیہ یا المغرب میں المرابطون یا المرابطین (ALMORAVIDE) اور الموحدون یا الموحدین (ALMOHADE OR THE MAWAHHIDIN) کا دورِ حکومت تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے (پانچویں صدی ہجری کے وسط سے ساتویں صدی ہجری کے وسط تک)۔ یہ زمانہ اس خطۂ ارض کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مرابطی فرمانروا امیر المسلمین یوسف بن تاشفینؒ اور مُوحِّد فرمانروا عبدالمؤمن، ابو یعقوب یوسف بن عبدالمؤمن اور ابو یوسف یعقوب المنصور

بن یوسف نے شہرتِ عام اور بقائے عام کے دربار میں نہایت ممتاز مقام حاصل کیا۔ وہ نہ صرف تمام شمالی افریقہ (مراکش، تونس، لیبیا اور الجزائر) کے حکمران تھے بلکہ جزیرہ نمائے آئی بیریا (سپین و پرتگال) کے بہت بڑے حصّے پر بھی متصرف تھے۔ امیر المسلمین یوسف بن تاشفینؒ کے بعد دولت مرابطین تو جلد ہی زوال پذیر ہو گئی لیکن اس کی جانشین دولتِ مؤحدین تقریباً ڈیڑھ صدی تک طبل و علم کی مالک رہی۔ یہ ایک نہایت عظیم الشان اور طاقتور سلطنت تھی۔ اس کی حدود جنوبی سمت میں صحرائے اعظم تک شمال میں بحیرہ روم اور جبل الطارق تک مغربی جانب بحرِ ظلمات (اٹلانٹک) تک اور مشرق میں ان ریگستانوں تک جو سرزمین مغرب کو مصر سے جُدا کرتے پھیلی ہوئی تھیں۔ آبنائے جبل الطارق کے شمال میں سپین و پرتگال واقع ہیں جن کو مسخر کرنا اور قابو میں رکھنا مؤحدین کا دلی منشاء تھا اور وہ ان ملکوں کے ان تمام حصوں پر قابض بھی ہو گئے تھے جن کو ان دنوں اندلس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اشبیلیہ، قرطبہ، بطلیوس، غرناطہ، مالقہ، المریہ، جیان وغیرہ اندلس ہی کے مشہور زمانہ شہر تھے۔ نہ صرف وادی الکبیر کے تمام سواحل ان کے زیرِ حکومت تھے بلکہ شمال مغربی گوشہ میں ان کی مملکت کی حدِ فاصل وہ سربفلک پہاڑ اور مستحکم قلعے تھے جو اس کو قشتالیہ (CASTILE) کی عیسائی سلطنت سے جُدا کرتے تھے۔ المؤحدین کا بحری بیڑا بھی اتنا طاقتور تھا کہ ان سے قبل کوئی اسلامی حکومت ایسی زبردست بحری قوت فراہم نہیں کر سکی تھی۔

تیسرا مؤحد فرمانروا ابو یوسف یعقوب المنصور (۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ / ۱۱۹۹ء) خلفاء مؤحدین کے سلسلے میں وسط کا گوہرِ تابدار تھا۔ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" میں اس کی شخصیت اور عہدِ حکومت کا خاکہ یوں کھینچا گیا ہے:

"یعقوب المنصور کا عہدِ حکومت الموحدون کی سلطنت کے منتہائے عروج

کا زمانہ ہے۔ اس کے کردار کی مستعدی، وہ احتیاط اور سختی جو وہ اپنی مملکت کے انتظام میں ملحوظ رکھتا تھا اور اُس کی ذاتی جرأت نے اسے اس قابل بنا دیا کہ اپنے تمام دشمنوں کو افریقیہ میں بھی اور ہسپانیہ میں بھی شکست دے۔ اپنی افواج کے حوصلے بلند کرے اور آنے والی نسلوں میں اپنی ایسی یاد چھوڑ جائے جسے کہانیوں اور افسانوں کا ایک سنہری ہالہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی الصالحتہ کی شاہی بستی میں تعمیر کردہ شاندار عمارات، مراکش کی جامع الکتبیتن مع اپنے نفیس مینار کے، اشبیلیہ کا جیرالدہ (GIRALDA) اور رباط کی جامع حسّان کی ہیئتِ مجموعی —— ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دادا اور باپ نے یادگار عمارتیں تعمیر کرانے کا جو کارِ عظیم شروع کیا تھا، اس نے اسے شاندار طریق سے جاری رکھا۔ اس کی دولت و ثروت، اس کے دربار کی شان و شوکت؛ اس کا علماء کی صحبت میں رہنے کا شوق، جہاد کے معرکوں میں اس کی کامیابیاں؛ ان سب باتوں نے ان کے مداحین کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔"

یہ کتاب اسی یعقوب المنصور کے وقائعِ حیات اور اس کے پیشروؤں (PREDECESSORS) کے اجمالی حالات پر مشتمل ہے، اس میں آغازِ اسلام سے لے کر الموحدین کے دورتک کے شمالی افریقیہ کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے اور یعقوب المنصور کے عہد کے چند مشہور اربابِ کمال کا اجمالی تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔ خلفاء موحدین میں سے یعقوب المنصور کو خاص طور پر منتخب کرنے کا سبب یہ ہے کہ اس کے عہدِ حکومت میں موحدین کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر پہنچ گیا تھا اور پھر اس نے اپنی سیرت اور کردار کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے ان کی درخشانی سے آج بھی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں، اسی لیے علامہ شبلی نعمانیؒ نے "نامور فرمانروایانِ اسلام" کے سوانح

مرتب کرنے کے لیے جن دس فرمانرواؤں کو منتخب کیا تھا ان میں سے ایک یعقوب المنصور تھا، افسوس کہ علامہؒ کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ اور ہارون الرشید عباسی کے سوا کسی دوسرے مسلم فرمانروا کے سوانح مرتب نہ کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ یعقوب المنصور جیسی مہتم بالشان شخصیت پر لکھنے کا حق علامہ شبلیؒ جیسی فاضلِ زمانہ شخصیت ہی ادا کر سکتی تھی لیکن قدرت کو ایسا منظور نہ تھا۔ اُن کے بعد دوسرے اہلِ علم نے بھی کبھی اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی، آخر ع

قرعۂ فال بنامِ ایں دیوانہ زدند

کے مصداق چند سال ہوئے سید امیر علی کی کتاب "مختصر تاریخ صحرا نشیانِ عرب" کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے دل میں خود بخود تحریک پیدا ہوئی کہ برا بھلا جو بن پڑے یعقوب المنصور پر ضرور کچھ لکھوں۔ لیکن فرصت عنقا تھی اور مستند مآخذ تک رسائی بہت کٹھن، چنانچہ کافی عرصہ تک کام کا آغاز نہ ہو سکا۔ ایک دن کسی کتاب میں امام یافعیؒ کے یہ الفاظ یعقوب المنصور کے بارے میں نظر سے گزرے

"ان لوگوں کو یعقوب المنصور نے شریعت کے قانون کی طرف واپس کیا۔ حدود قائم کیے۔ اس بات میں اس نے اپنے قبیلے اور خانوادے کو عام لوگوں کے برابر کر دیا۔"

ان الفاظ نے میرے ارادے کے لیے مہمیز کا کام کیا اور تین سال قبل جوں توں کر کے میں نے آغازِ کار کر دیا۔ گزشتہ تین سالوں میں کئی بار ایسے مواقع پیش آئے کہ کئی کئی ہفتے تک ایک لفظ بھی نہ لکھا جا سکا۔ بارے اللہ تعالیٰ نے یاوری کی اور آج ۲۲ مئی ۱۹۷۸ء کو یہ کتاب مکمل ہو گئی۔ اس سے پہلے اللہ تعالےٰ نے سلطان نور الدین محمود زنگی، الملک الظاہر رکن الدین بیبرسؒ اور سلطان ملک شاہ سلجوقی کی سیرت نگاری کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ اب اس بزم میں ابو یوسف

یعقوب المنصور کا اضافہ ہو گیا۔ مجھے اس کتاب کے جامع ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں ہے یہ تو محض ایک بنیاد ہے جس پر دوسرے اہل قلم حضرات (جو فی الحقیقت اس کام کے اہل ہیں) ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔

میں اپنے فاضل دوست جناب قدر آفاقی صاحب ایم۔اے کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ازراہِ کرم اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ میرے بارے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے یہ ان کا حسنِ ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

اس کتاب کے لکھنے کا سب سے بڑا مقصد اردو زبان کی خدمت ہے اور دوسرا یہ کہ ہماری نژادِ نو شمالی افریقہ میں بھی اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ ہو سکے۔ اردو زبان میں یعقوب المنصور پر یہ پہلی کتاب ہے۔ اگر اربابِ علم نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

قارئینِ کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کی خامیوں سے مؤلف کو ناشر کی وساطت سے مطلع فرمائیں، یہ ان کا مؤلف پر احسان ہو گا۔ انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں یہ خامیاں دور کر دی جائیں گی۔ اگر کسی قابلِ تکریم ہستی کے تذکرہ میں ادب و احترام کی حدود نظر انداز ہو گئی ہوں تو اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوں امید ہے قارئینِ کرام بھی عفو و درگزر سے کام لیں گے۔ بشرطِ زندگی دوسرے ایڈیشن میں نظرِ ثانی کرتے وقت صحت کا خاص اہتمام کیا جائے گا۔ وَمَا تَوْفِيقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

خاکسار
طالب ہاشمی

ملتان روڈ۔ لاہور
۲۲ مئی ۱۹۷۸ء

المغرب (شمالی افریقیہ) یا بلادِ بربر

بّرِاعظم افریقہ کے نقشے پر ایک نظر ڈالیں تو اس کا بیشتر بالائی حصہ کفِ دست کی مانند صاف دکھائی دے گا، البتہ متن کے کنارے ہر سہ اطراف پر دریاؤں اور شہروں وغیرہ کی علامات نمودار ہیں گویا ایک سفید کپڑے کے گرد سیاہ سنجاف لگی ہوئی ہے ـــــ یہ کفِ دست میدان ہی افریقہ کا وہ ہولناک صحرائے اعظم ہے جو لاکھوں مربع میل پر محیط ہے اور جس میں حدِ نظر تک ریت یا سراب کے سوا کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ صحرائے اعظم کے عین شمال میں بّرِاعظم کے برابر شرقاً غرباً وہ سرزمین واقع ہے جسے بلادِ بربر یا بربرستان (BARBARY) کہا جاتا ہے ـــــ بلادِ بربر کے جنوب مغرب اور کسی قدر مشرقی حد پر اگر ریگستان کا بحرِ زخّار موجیں مارتا ہے تو اس کے شمال میں بحیرہ روم اور مغرب میں بحرِ اوقیانوس کا نیلگوں پانی لہریں مارتا ہے۔ صدرِ اسلام میں بلادِ بربر یا شمالی افریقہ کی تقسیم اہلِ عرب نے تین حصوں پر کر رکھی تھی۔

(۱) افریقیہ۔ اس کا نام "مغربِ ادنیٰ" بھی تھا اس کا دارالحکومت صدرِ اسلام میں شہر قیروان تھا۔ اس کو ادنیٰ کا نام اس لیے دیا گیا کہ یہ علاقہ بلادِ عرب اور دارالخلافتِ عظمیٰ سے قریب تر تھا[۱]

---

[۱] فی الحقیقت افریقیہ بربرستان کے مشرقی حصّے کا نام ہے۔ یہ لفظ لاطینی زبان

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) مملکت المغرب الاوسط۔ اس کا مرکزِ حکومت شہر تلمسان تھا اور بنی مزغنان یا مزغنہ کے جزائر اس کے ساتھ ملحق تھے۔

(۳) مغرب الاقصیٰ (یا اقصائے مغرب) اس کا دارالحکومت شہر مراکش تھا اور اس کو اقصیٰ کا نام اس لیے دیا گیا کہ یہ دارالخلافتِ عظمیٰ (دمشق یا بغداد) سے بہت زیادہ دور تھا۔

شمالی افریقہ یا خطّۂ بربر آجکل چار آزاد اور خود مختار ممالک پر مشتمل ہے [۱]

(۱) لیبیا (۲) الجزائر (۳) تیونس (۴) مراکش

یہ چاروں ممالک اب عرب علاقے شمار ہوتے ہیں۔ ان ملکوں کی آبادی عرب اور بربروں کی مخلوط نسلوں کا نفیس امتزاج ہے اور وہاں کے تمام باشندے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) زبان کے لفظ افریقہ یا افریکا (AFRICA) کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ نام سب سے پہلے رومیوں نے اس علاقے کو دیا جس میں انہوں نے قرطاجنہ کی تباہی کے بعد اپنی مسندِ اقتدار بچھائی بعد ازاں اس نام کا اطلاق پورے برِاعظم پر ہونے لگا۔ افریقیہ کی حدود مختلف زمانوں میں بدلتی رہی ہیں لیکن تیونس پر خصوصیت سے اس کا اطلاق ہوتا تھا کیونکہ اہلِ قرطاجنہ اور رومیوں کی قوت و شوکت کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

[۱] شمالی افریقہ میں دو اور خطّوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ مصر اور ہسپانوی صحرا (صحارا) مصر براعظم افریقہ کے شمال مشرق میں ہے اور ہسپانوی صحرا شمال مغرب میں ——— لیکن مصر کو افریقہ کی بجائے مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے باقی رہا ہسپانوی صحرا تو یہ وہ ساحلی علاقہ ہے جہاں آبادی بہت کم ہے اور جس کا بیشتر حصّہ بے آب و گیاہ ہے۔ حکومتِ سپین نے اب اس علاقے سے اپنا تسلط اٹھا لیا ہے۔ اس کے بعد یہ علاقہ مراکش، موریطانیہ اور الجزائر کے درمیان باعثِ نزاع بن گیا ہے۔

اپنے ملکوں کو "عرب ممالک" کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان ملکوں کے موجودہ جغرافیائی اور دوسرے ضروری کوائف اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں۔

۱۔ جمہوریہ لیبیا : اس کے شمال میں بحیرۂ روم، مشرق میں مصر، مغرب میں الجزائر اور تیونس اور جنوب میں جمہوریہ چاڈ اور نائیجیریا واقع ہیں۔

رقبہ : چھ لاکھ ۹، ہزار تین سو اٹھاون مربع میل۔

آبادی : پچیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اس میں مسلمانوں کا تناسب سو فیصد ہے۔

زبان :۔ عربی

دارالحکومت :۔ ٹریپولی (طرابلس الغرب) دوسرے مشہور شہر بن غازی اور کفرہ ہیں۔

اہم برآمدات : پٹرولیم

طرز حکومت : جمہوری

لیبیا کا بیشتر حصہ صحرا پر مشتمل ہے۔

۲۔ پاپولر عوامی جمہوریہ الجزائر :۔ تیونس اور مراکش کے درمیان شمال میں اس کی سرحد سات سو میل تک بحیرہ روم کے ساحل پر محیط ہے۔ مشرق میں جمہوریہ لیبیا اور جنوب میں صحرائے اعظم ہے جس کی سرحدیں مالی، موریطانیہ اور نائیجیریا کی سرحدوں سے ملتی ہیں۔

رقبہ :۔ نو لاکھ ۱۹ ہزار ۵ سو اکانوے مربع میل۔

آبادی :۔ ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ، اس میں مسلمانوں کا تناسب ۹۲ فیصد ہے۔

دارالحکومت :۔ الجیرز ۔ دوسرے مشہور شہر کانسٹنٹائن، اوران، تمغاد اور

انصلاح ہیں۔

زبان :۔ عربی اور فرانسیسی۔

اہم برآمدات :۔ پیٹرول، مائع قدرتی گیس، خام لوہا، فاسفیٹ، تمباکو کی مصنوعات، زیتون، کھجور، پھل اور سبزیاں۔

لیبیا کی طرح الجزائر کا بیشتر حصہ بھی صحرا پر مشتمل ہے۔

۳۔ جمہوریہ تیونس : اس کے جنوب مشرق میں لیبیا، مغرب میں الجزائر اور شمال میں بحیرہ روم ہے۔

رقبہ :۔ ۶۳ ہزار ۳ سو ۷۸ مربع میل۔

آبادی :۔ پچاس اور ساٹھ لاکھ کے درمیان، مسلمان ۹۲ فیصد۔

زبان :۔ عربی اور فرانسیسی

دارالحکومت :۔ تیونس۔ دوسرے اہم شہر قیروان، سفیح، حمامہ اور ساؤس ہیں۔

طرز حکومت :۔ جمہوری

اہم برآمدات :۔ خام لوہا، فاسفیٹ، سیسہ، روغن زیتون اور دوسرے خوردنی روغن، پھل، تیار شدہ کپڑا، مچھلی اور کئی دوسری زرعی اور معدنی مصنوعات۔

۴۔ مراکش : اس کی شمال مغربی سرحدیں بحیرہ روم کے ساحل کو چھوتی ہیں اور مغربی سرحدیں بحر اوقیانوس سے ملتی ہیں۔ اس کے مشرق میں الجزائر اور جنوب میں ساحلی صحرا ہے۔

رقبہ :۔ ایک لاکھ بہتر ہزار مربع میل۔

آبادی : ایک کروڑ چون لاکھ کے لگ بھگ، اس میں مسلمانوں کا تناسب ۹۵ فیصد ہے۔

زبان :۔ عربی اور فرانسیسی (عربی سرکاری زبان ہے)

دارالحکومت :۔ رباط، ملک کا سرکاری نام "المملکت المغربیہ" ہے۔

دوسرے اہم شہر : کیسا بلانکا، مراکش، فیض (فاس) مکناسہ، طنجہ، اغادیر، مغادور، دار بیضا، الجدیدہ، سبتہ، ملیلا، مطیر، تطوان، ازیلا، سلاڈ، العرایش، قصر کبیر اور شاون ۔

طرزِ حکومت :۔ بادشاہت جس پر جمہوریت کی چھاپ ہے۔

اہم برآمدات :۔ فاسفیٹ، جست، منگنیز، لوہے کے ڈبے، نمک جپسیم، کارک تیل، کوبالٹ، قالین اور چمڑے کی مصنوعات ۔

مشہور دریا :۔ وادی سیبو، ام الربیعہ، وادی ملویہ، وادی تان سیفت۔

مشہور پہاڑ :۔ کوہ اطلس کا سلسلہ، جبل ریف کا سلسلہ ۔

شمالی افریقہ کے قدیم باشندے

بلادِ مغرب (شمالی افریقہ) میں قدیم زمانے سے ایک قوم بربر کے نام سے آباد تھی۔ اس قوم کے بیشمار قبائل اور گروہ تھے جن میں صنہاجہ، کتامہ، مصمودہ، ہوارہ اور زناتہ کے قبائل کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ لوگ شمالی افریقہ میں کہاں سے آئے اور کس زمانے میں آئے؟ اس کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ آج سے تین ہزار سال قبل برّاعظم یورپ سے یہاں آکر آباد ہوئے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سامی نسل کے عرب ہیں۔ (یعنی سام بن نوحؑ کی اولاد سے ہیں) امریکی مؤرخ جیمس ہنری بریسٹیڈ نے پورے وثوق سے لکھا ہے کہ یہ لوگ سامی عرب تھے اور زمانۂ تاریخ سے قبل مصر کے راستے شمالی افریقہ پہنچے تھے۔ جمہور عرب مؤرخین بھی اسی رائے کے مؤید ہیں۔

بہرصورت بربر جب پہلے پہل شمالی افریقہ میں آباد ہوئے تو اس وقت موجودہ ممالک بربر (لیبیا، الجزائر، تیونس اور مراکش) کی حدود کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کبھی یہ لوگ ایک وحدت میں منسلک ہو جاتے تھے اور کبھی مختلف ملکوں کی صورت میں جن کی حدود بدلتی رہتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ لوگ سیدھے سادے کسان تھے، ان کا رنگ گورا تھا اور آنکھیں نیلی۔ آجکل بھی بلادِ مغرب میں بربری نسل کے لوگوں کو ہی تفوّق حاصل ہے گو وہ اسلام کے عالمگیر رشتے میں منسلک ہوکر اب عمومی طور پر عرب ہی کہلاتے ہیں۔

بربر کے علاوہ ان لوگوں کو " مازیغ " یا " امازغین " بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی بربری زبان میں " مردانِ حُر " یا " سردار " کے ہیں۔

مؤرخین نے بربروں کے اخلاق و عادات کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے ان کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہایت شجاع جنگجو اور حرّیت پسند ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بڑے تند مزاج جھگڑالو اور متلوّن مزاج ہیں۔ ان کی معلوم تاریخ سے اب تک کوئی بھی نصف صدی ہنگاموں اور خونریزیوں سے خالی نہیں گزری۔

شمالی افریقہ کا دورِ قدیم

حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور سے ۸۳۰ سال قبل فنیقیوں نے شمالی افریقہ (خطۂ تیونس) میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی[1]۔ ان کا مرکزِ حکومت کارتھیج (CORTHAGE) یعنی "نیا شہر" تھا۔ اسی کا معرب قرطاجنہ (یا قرطاجہ) ہے۔ شہر تیونس سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر اس عظیم الشان قدیم شہر کے کھنڈر

---

[1] فنیقیوں کا شمار دورِ قدیم کی نہایت عظیم الشان قوموں میں ہوتا ہے۔ وہ فنیقیہ یا فینشیا (PHENICIE) کے رہنے والے تھے جو بحیرہ روم اور جبلِ لبنان کے درمیان ایک خوش منظر اور شاداب علاقہ تھا۔ یہ لوگ سامی (یا کنعانی) نسل کے عرب تھے اور بڑے جنگجو اور ذہین تھے۔ ان کی شاندار تاریخ کا آغاز سنہ ۲۴۰۰ قبل مسیح (یا بروایتِ دیگر سنہ ۱۹۰۰ قبل مسیح) سے ہوتا ہے۔ انہوں نے کشتیاں اور بڑے بڑے بادبانی جہاز بنائے اور بحیرہ روم، بحیرہ قلزم اور بحرِ اوقیانوس کے ساحلوں اور جزیروں پر اپنی نوآبادیاں قائم کر کے صنعت وحرفت تجارت تمدن اور علومِ قدیمہ میں اتنی ترقی کی کہ قدیم رومی سلطنت کی عظمت وشوکت بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ فنیقیوں نے سب سے پہلے شہر "صیدا" (SIDON) کو اپنا مرکزِ حکومت بنایا۔ سنہ ۱۳۰۰ قبل مسیح میں صیدا کی جگہ شہر "صور" (TYRE) نے لے لی اور وہ صدیوں تک اہلِ فنیقیہ کی قوت وشوکت کا مرکز بنا رہا۔ سنہ ۸۳۰ ق۔م میں فنیقیوں کا مرکزِ اقتدار کارتھیج منتقل ہو گیا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آجکل بھی موجود ہیں۔

مؤرخین نے اس شہر کی شان و شوکت اور سلطنتِ قرطاجنہ کی عظمت و جبروت اور ہیبت و اجلال کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا اثر و اقتدار تمام شمالی افریقہ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فنیقی بت پرست تھے اور پتھر اور پیتل کے مجسمے بنا کر انہیں پوجتے تھے۔ ان کے سب سے بڑے دیوتا کا نام بعل تھا اور سب سے بڑی دیوی کا نام بعلیت یا استارتہ تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ درختوں کو بھی پوجتے تھے۔ یہ اصلی درخت ہوتے تھے یا پیتل کے مخروطی شکل کے ستون ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنے مُردوں کو زیرِ زمین غاروں میں دفن کرتے تھے۔ عام لوگ اپنے مردوں کی نعشوں کو غاروں کی دیواروں میں بنے ہوئے خانوں میں رکھ دیتے تھے البتہ امراء پتھر کے تابوت بنواتے تھے جن کے اوپر خاص قسم کے نقوش بناتے تھے۔ غاروں میں نعشوں کے ساتھ بعل اور استارتہ کے بت۔ چراغ۔ گلدان عطر کی شیشیاں اور زیورات وغیرہ بھی رکھ دیتے تھے۔

فنیقیوں کو پیتل چاندی سونے شیشے اور مٹی کے برتن بنانے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان ظروف پر وہ نہایت نفیس نقاشی اور منبت کاری کرتے تھے۔ اسی طرح وہ نہایت عمدہ زیورات (طلائی گلوبند، بازو بند گوشوارے وغیرہ) بناتے تھے۔ پتھروں پر تصویریں بنانے میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ ان کے علاوہ انہوں نے جن صنعتوں میں کمال حاصل کیا ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

ہر قسم کا کپڑا کاتنا بُننا اور رنگنا، صاف و شفاف شیشہ اور اس سے مختلف قسم کے ظروف اور آلات تیار کرنا، تہذیب اور اونی کپڑے پر زردوزی کا کام کرنا، کشتیاں اور بادبانی جہاز بنانا۔

فنیقی صرف اچھے کاریگر ہی نہیں بلکہ نہایت اچھے کسان، باغبان اور تاجر بھی تھے۔ وہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سپین، مالٹا، سارڈینیا، قبرص اور روڈس وغیرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً چھ سو سال تک سلطنتِ قرطاجنہ کے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر رہا۔ اس کے بعد وہ رومیوں کی عظیم سلطنت سے لڑائیوں کے ایک طویل سلسلے میں الجھ گئے۔ ان دونوں زبردست قوتوں کی کشمکش کا زمانہ تقریباً ایک سو سال پر محیط ہے۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ اہلِ روما کی فتح کی صورت میں نکلا جنھوں نے دولتِ قرطاجنہ کے کھنڈروں پر اپنا رفیع الشان قصرِ اقتدار تعمیر کیا۔ پانچویں صدی عیسوی میں ایک وحشی قوم ونڈال نے شمالی افریقہ پر ایک پُرزور حملہ کر کے وہاں سے رومی اقتدار کا جنازہ نکال دیا اور تقریباً ایک صدی تک وہاں کوسِ لِمَنِ الْمُلک بجاتی رہی۔ چھٹی صدی عیسوی میں رومیوں کا ستارۂ اقبال پھر چمکا، انھوں نے ونڈال کو شمالی افریقہ سے نکال کر وہاں از سرِ نو اپنی سلطنت بحال کر لی اور حسبِ سابق پھر بڑی شان و شوکت سے حکومت کرنے لگے یہاں تک کہ اسلام کا ظہور ہوا اور مجاہدینِ اسلام کی یلغار کے سامنے بڑی بڑی باجبروت سلطنتوں کے پرچمِ اقبال سرنگوں ہو گئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اپنی زمینوں اور باغوں سے گندم، زیتون، روغن اور شراب بڑی کثرت سے حاصل کرتے تھے اور اس دور کے تمام متمدن ممالک سے تجارت کرتے تھے۔ وہ عرب سے کندر، مر، عقیق، ہندوستان سے دارچینی، مرچیں، ہاتھی دانت اور خوشبودار لکڑیاں، حبشہ سے آبنوس اور شترمرغ کے پر، مصر سے روئی کے کپڑے، شام عراق وغیرہ سے پشمینے قالین، کھجور اور بابل کا گیہوں اور شمال کی طرف سے آرمینیا کے گھوڑے، خچر اور تانبے کے آلات منگواتے تھے۔ بحیرہ اسود کے ساحلوں سے غلام خرید کر لاتے تھے اور دوسرے ملکوں کو شیشے اور مختلف دھاتوں کے آلات و ظروف، رنگین کپڑے، جواہرات، زیتون، روغنیات اور شراب وغیرہ برآمد کرتے تھے۔

فنیقیوں نے ایک خاص رسم الخط ایجاد کیا جس میں بائیس حروف تھے۔ ان میں سے ہر حرف ایک خاص آواز دیتا تھا۔ ان سب کو وہ الف بے کہتے تھے اور انھیں سیدھی طرف سے الٹی طرف کو لکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی کئی زبانوں کے حروفِ تہجی فنیقیوں کے "الف بے" سے ماخوذ اور مشتق ہیں۔

شمالی افریقیہ آغوشِ اسلام میں

ارض المغرب (شمالی افریقیہ) پر اسلام کی بارانِ رحمت کا پہلا چھینٹا اس وقت پڑا جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں فتح مصر کے فوراً ہی بعد مجاہدینِ اسلام نے یہاں حملے شروع کر دیئے اور امیرِ مصر حضرت عمروؓ بن عاص کی فوجیں شمالی ساحل کے قبیلوں کو مغلوب کرتے ہوئے برقہ تک جا پہنچیں۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا دورِ خلافت آیا تو ۲۶ھ میں مسلمانوں نے والیٔ مصر عبداللہؓ بن ابی سرح کی زیرِ قیادت طرابلس الغرب (لیبیا) پر چڑھائی کی۔ اس وقت افریقیہ (بشمول طرابلس) پر رومی شہنشاہ ہرقل کی طرف سے جرجیر (گرے گوریس) نامی ایک بطریق حکومت کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد اسے شکست دی۔ جرجیر لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس معرکہ کے بعد عبداللہؓ بن ابی سرح نے اپنی فوجیں تمام ملک میں پھیلا دیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں تمام طرابلس کو مسخر کر لیا۔ رومیوں نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لیں۔ چنانچہ ان کے متقدر امراء نے پچیس لاکھ دینار سالانہ پر مسلمانوں سے صلح کر لی اور اسلامی لشکر ایک سال تین مہینے بلادِ مغرب میں مقیم رہ کر واپس مصر چلا گیا۔ مسلمانوں کی مراجعت کے بعد رومیوں نے اپنا عہد و پیمان توڑ ڈالا اور مسلمانوں کے خالی کیے ہوئے علاقوں پر پھر قبضہ کر لیا۔

جب امیر معاویہؓ مسندِ حکومت پر بیٹھے تو انھوں نے سب سے پہلے شمالی افریقیہ

کی طرف توجہ کی اور ۴۵ھ میں معاویہؓ بن خدیج کو ایک زبردست فوج دے کر شمالی افریقیہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا، انہوں نے رومیوں کو شکستوں پر شکستیں دے کر شمالی افریقیہ کے کئی وسیع علاقے اور ساحلی مقامات فتح کر لیے لیکن وہ رومیوں اور سرکش بربریوں کی متحدہ قوت کا پوری طرح استیصال نہ کر سکے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ نے شمالی افریقیہ کی مہم مشہور مجاہدِ اسلام عقبہ بن نافع الفہریؓ کے سپرد کر دی انہوں نے دس ہزار جانبازوں کے ساتھ ایسی زبردست یلغار کی کہ سارے بلادِ مغرب میں تہلکہ پڑ گیا۔ عقبہؓ نے اپنی فتوحات کے پہلے دَور میں تیونس (قرطاجنہ) تک کا علاقہ فتح کر لیا اور رومیوں اور ان کے ساتھی بربریوں کی سخت گوشمالی کی۔ ۵۰ھ میں انہوں نے سرکش بربریوں کی روک تھام اور سمندر کی طرف سے رومی حملوں کو روکنے کے لیے ایک عظیم الشان چھاؤنی اور شہر کی تعمیر کا آغاز کیا جس کا نام قیروان رکھا۔ یہ شہر آج بھی تیونس کے اہم مقامات میں شمار ہوتا ہے اور عربوں کے افسانوی ادب میں تو اس کو لازوال شہرت حاصل ہے۔ جس جگہ یہ شہر آباد کیا گیا وہاں میلوں گھنا جنگل اور دلدلی علاقہ تھا، جو حشرات الارض اور خونخوار درندوں کا مسکن تھا لیکن عقبہؓ اور ان کے بلند ہمت ساتھیوں نے چند سال کے اندر اندر جنگل صاف کر کے اور دلدلیں پاٹ کر یہاں ایک عظیم الشان شہر کھڑا کر دیا اور ارد گرد کے لوگوں نے بھی اس میں آ کر بسنا شروع کر دیا[1] قیروان کی تعمیر کے فوراً بعد امیر معاویہؓ نے ۵۵ھ

---

[1] علامہ ابن العذاری المراکشی کا بیان ہے کہ جب عقبہؓ نے ایسے خطرناک علاقے میں شہر کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے ساتھیوں نے ان سے کہا:

"آپ نے ایسے گھنے جنگل اور دلدلوں میں شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے جس میں کوئی شخص اقامت پسند نہیں کر سکتا۔ ہمیں ڈر ہے کہ سانپ اور خونخوار درندے

میں مسلمہؓ بن مخلد انصاری کو مصر اور افریقیہ کا والی مقرر کیا۔ انہوں نے اپنی طرف سے ابوالمہاجر کو عقبہؒ کی جگہ افریقیہ کا حاکم مقرر کیا۔ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید بن معاویہ نے ۶۲ھ/۶۸۱ء میں عقبہ بن نافعؒ کو دوبارہ افریقیہ کا گورنر مقرر کر دیا کیونکہ سرکش بربری اور رومی نت نئے فتنے اٹھاتے رہتے تھے۔ عقبہؒ نے قسم کھائی کہ خواہ انہیں ساری عمر لڑنا پڑے وہ ان سرکش عناصر کی بیخ کنی کر کے رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے جوش و خروش

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔"

عقبہ بن نافعؒ ایک مستجاب الدعوات مرد مومن تھے اور ان کے لشکر میں اٹھارہ صحابہ کرامؓ اور باقی تمام لوگ تابعین تھے۔ اپنے ساتھیوں کی باتیں سن کر عقبہؒ نے بارگاہ رب العزت میں بآواز بلند دعا کی کہ "الٰہی تو ہمیں اپنے فضل و کرم سے نواز اور ہمیں یہ شہر تعمیر کرنے کی توفیق عطا فرما۔" ان کے سب ساتھیوں نے بھی اس دعا میں نہایت خشوع و خضوع سے ان کا ساتھ دیا۔ پھر عقبہؒ جنگل کے قریب گئے اور پکار کر کہا کہ :

"اے سانپو اور درندو! ہم رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور تابعین ہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ ہم اس جگہ اقامت اختیار کرنے والے ہیں، اگر تم یہاں سے نہ گئے تو ہم تمہیں قتل کرنے میں آزاد ہوں گے۔"

اس کے بعد لوگوں نے یہ عجیب و غریب تماشا دیکھا کہ تمام درندے اپنے بچوں کو اٹھائے جنگل سے بھاگ رہے ہیں اور سانپ بچھو وغیرہ بھی ان کے پیچھے جا رہے ہیں۔ جب اس طرح دیکھتے دیکھتے یہ علاقہ تمام وحوش اور حشرات الارض سے خالی ہو گیا تو درخت کاٹنے کا آغاز کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے چالیس برس تک اہل افریقیہ نے اس علاقے میں کسی بچھو سانپ یا درندے کا نام و نشان تک نہ پایا۔

(تاریخ مغرب مصنفہ ابن العذاری ترجمہ محمد جمیل الرحمٰن)

سے جہاد کا آغاز کیا اور رومیوں اور باغی بربریوں کو تابڑ توڑ شکستیں دیتے ہوئے بحیرہ روم کے کنارے انتہائے مغرب کے آخری شہر طنجہ تک جا پہنچے اور ایک ہی ہلّے میں اس پر پرچم اسلام لہرا دیا۔ چونکہ طنجہ کے بعد بجانب شمال خشکی کا علاقہ ختم ہو جاتا تھا، عقبہؓ نے وہاں سے سوس ادنیٰ کا رُخ کیا اور لیعلی، نفیس، سوس اقصیٰ اور درعہ کو مسخر کرتے ہوئے بحرِ اوقیانوس شمالی کے ساحل پر پہنچ گئے، اب وہ سارا شمالی افریقہ فتح کر چکے تھے لیکن جذبۂ جہاد کا یہ عالم تھا کہ بحرِ اوقیانوس کی وسعتوں کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر بصد حسرت و یاس آسمان کی طرف نظر کی اور کہا کہ :

"بارِ الٰہا اگر یہ سمندر میرے راستے میں حارج نہ ہوتا تو جہاں تک زمین ملتی میں تیری راہ میں جہاد کرتا چلا جاتا۔"

پھر انہوں نے اپنے شبدیزِ صبا رفتار کو جست دے کر سمندر میں ڈال دیا اور جب پانی گھوڑے کی رانوں تک پہنچ گیا تو انہوں نے اسے روک لیا اور تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے بڑے جوش اور جذبے سے یوں گویا ہوئے :

"خدائے قادر و توانا تو خوب جانتا ہے کہ تیرا یہ عاجز بندہ اس نیت سے گھر سے نکلا تھا کہ تیرے ولی ذوالقرنین کی طرح زمین کی آخری حدوں تک تیرا نام بلند کروں تاکہ تیرے سوا کوئی دوسرا نہ پوجا جائے لیکن آج اس سمندر نے میرا راستہ روک لیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ساحل سے واپس آ گئے [۱]

---

[۱] بحرِ اوقیانوس کو عرب "بحرِ ظلمات" کہتے تھے اس واقعہ پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر خوب صادق آتا ہے:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے — بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ہو سکتا ہے کہ یہ شعر کہتے وقت حکیم الامتؒ کے ذہن میں یہ واقعہ بھی ہو۔

اگرچہ عقبہؓ بن نافع کی فتوحات نے تمام وکمال شمالی افریقیہ پر مسلمانوں کا سکہ بٹھا دیا تھا لیکن ابھی ان فتوحات کو مستحکم کرنے کی ضرورت تھی ۔ بدقسمتی سے عقبہؓ صورتحال کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور انہوں نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک قلیل جمعیت کے سوا اپنی سب فوجوں کو منتشر کر دیا ۔ ان کے اس اقدام کے نہایت بھیانک نتائج نکلے اور مسلمان ایک بار پھر مصائب و آلام کے طوفان میں گھر گئے ۔

شمالی افریقہ میں

کاروانِ اسلام ـــــ منزل بہ منزل

عقبہ بن نافعؓ کے پیشرو ابوالمہاجر کی ولایتِ افریقیہ کے زمانے میں ایک با اثر بربری سردار کسیلہ بن لمزم البرنسی والیٔ طنبہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا تھا۔ عقبہؓ نے جب ابوالمہاجر کی جگہ لی تو کسیلہ نے ان کی امداد و اعانت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن عقبہؓ نے اس کی خاطر خواہ سرپرستی نہ کی بلکہ ایک روایت کے مطابق تو انہوں نے اس سے توہین آمیز برتاؤ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل میں عقبہؓ کے خلاف کدورت پیدا ہو گئی اور وہ ان سے بدلہ لینے کی تاک میں رہنے لگا۔ جب افریقی فتوحات کی تکمیل کے بعد عقبہؓ نے اپنی فوجوں کو منتشر کیا تو کسیلہ کی بن آئی اس نے سرکش بربریوں کی ایک کثیر جمعیت کو اپنے ساتھ ملا کر عقبہؓ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت ان کے ساتھ تین سو سے کچھ ہی زائد عرب تھے، ان غیور مسلمانوں نے اپنی ڈھالیں اور نیام توڑ پھینکے اور مردانہ وار کسیلہ کے مقابلہ پر ڈٹ گئے لیکن دونوں فریقوں میں ایک اور بیس کی نسبت تھی عقبہؓ اور ان کے جانباز ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے لیکن انہوں نے میدانِ جنگ سے پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ عقبہؓ کی شہادت کے ساتھ ہی سارے شمالی افریقہ میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور جگہ جگہ رومیوں اور بربریوں نے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ کسیلہ رومی اور بربری باغیوں کا ایک زبردست لشکر لے کر قیروان پر حملہ آور ہوا۔ عقبہؓ کے نائب زہیر بن قیس بلوی نے مزاحمت کرنے کا ارادہ کیا لیکن کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا ناچار وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ قیروان سے نکل کر برقہ چلے گئے جو

مسلمان شہر میں رہ گئے کسیلہ نے قیروان پر قابض ہو کر ان کو امان دے دی۔ یہ واقعات سنہ ۶۴ھ ۶۸۵ء کے ہیں۔

سنہ ۶۹ھ ۶۹۰ء میں عبدالملک بن مروان نے شمالی افریقیہ کی طرف توجہ کی اور زہیر بن قیس کو بڑے ساز و سامان کے ساتھ باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ کسیلہ کو خبر ہوئی تو وہ قیروان سے نکل کر ایک محفوظ مقام ممش میں جا بیٹھا چنانچہ زہیر نے کسی مزاحمت کے بغیر قیروان پر قبضہ کر لیا اور پھر ممش کی طرف بڑھے۔ کسیلہ نے رومیوں اور سرکش بربریوں کی ایک کثیر جمعیت کے ساتھ ان کا راستہ روکا۔ ممش سے متصل دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ جانبین کے بہادروں نے خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ وہ سب اس جنگ کو موت اور زندگی کی جنگ سمجھ کر لڑے لیکن بالآخر مسلمان غالب آئے، کسیلہ اور اس کے بے شمار ساتھی، جن میں بربریوں کے متعدد نامی گرامی سردار بھی تھے، میدانِ جنگ میں کام آئے۔ جو باقی بچے وہ مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گئے یا بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ مسلمانوں کی یہ کامیابی فتح الفتوح کی حیثیت رکھتی تھی لیکن افسوس کہ مسلمان اس کا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

علامہ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں زہیر بن قیسؒ کسیلہ کے خلاف نبرد آزما تھے، رومیوں نے ان کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر ایک زبردست جنگی بیڑے کے ساتھ برقہ پر حملہ کر دیا۔ چونکہ یہاں ان کے مقابلے کے لیے کوئی قوت موجود نہیں تھی انہوں نے بہت سے مسلمانوں کو شہید کر ڈالا اور کچھ کو اسیر کر کے اپنے ساتھ لے چلے اسی اثناء میں زہیر بھی کسیلہ کی مہم سے فارغ ہو کر برقہ آ پہنچے۔ قیدی مسلمانوں نے انہیں دیکھ کر فریاد کی کہ ہمیں ان ظالموں کے پنجے سے چھڑا لیجئے۔ اس وقت زہیر کے پاس بہت تھوڑی جمعیت تھی اور رومیوں کی کثیر تعداد سے ٹکر لینا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن زہیر کی غیرت دینی نے گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں کو اس حال میں چھوڑ کر وہاں سے

کھسک جائیں۔ وہ نتائج وعواقب سے بے پروا ہو کر رومیوں کی خوفناک قوت سے بھڑ گئے اور عقبہؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت مردانہ وار لڑ کر شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد شمالی افریقہ کے بیشتر مقبوضات پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

عبدالملک کو زہیرؒ کی شہادت کی خبر سن کر بڑا صدمہ پہنچا لیکن اس زمانے میں وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے معرکہ آرائی میں مصروف تھا اس لیے شمالی افریقہ کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ سنہ ۷۴ھ ۶۹۴ء میں اس نے حسان بن نعمان غسانی کو چالیس ہزار جنگجوؤں کا لشکر دے کر بلادِ مغرب کی از سرِ نو تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ حسان قیروان سے ہوتے ہوئے قرطاجنہ پہنچے جو شمالی افریقہ میں رومیوں کی قوت کا مرکز تھا۔ رومی اور سرکش بربری متحد ہو کر ان کے مقابلے پر آئے لیکن پُرجوش عربوں نے انھیں شکست فاش دے کر قرطاجنہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حسان نے رومیوں کے کئی اور شہر بھی یکے بعد دیگرے فتح کر لیے اور پھر قیروان جا کر مقیم ہو گئے۔ چند دن بعد انہوں نے وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا کہ مغرب میں اب اور کون سی اسلام دشمن قوت باقی رہ گئی ہے، لوگوں نے انہیں بتایا کہ جبل اوراس میں ایک عورت داميہ نامی حکمران ہے جو ملکہ کاہنہ کے لقب سے مشہور ہے۔ شمالی افریقہ کے رومی اور بربری اسے بہت مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ غیب دان ہے اور مستقبل کا حال بھی جانتی ہے۔ اگر اس کا استیصال کر دیا جائے تو بلادِ مغرب میں کوئی طاقت مسلمانوں کا سامنا نہیں کر سکے گی۔

حسّان ملکہ کاہنہ کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور فوراً جبل اوراس پہنچ کر اس سے جنگ چھیڑ دی۔ کاہنہ کے پاس اس کے عقیدت مند رومی اور بربری جنگجوؤں پر مشتمل ایک زبردست لشکر جمع ہو گیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر مسلمانوں کے مقابلے پر

آ گئی۔ دریائے سکتاقہ کے کنارے دونوں فوجوں میں نہایت شدید اور خونریز جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی اور وہ پسپا ہو کر برقہ چلے آئے۔ عبدالملک کو مسلمانوں کی شکست کی اطلاع ملی تو اس نے حسان کو پیغام بھیجا کہ برقہ میں جم کر بیٹھے رہو اور یہاں سے کسی صورت میں پیچھے نہ ہٹو۔ میں مناسب موقع پر تمہیں کمک بھیجوں گا۔ حسان نے عبدالملک کے حکم کی تعمیل کی اور برقہ میں قدم جما کر بیٹھ گئے۔ بدقسمتی سے عبدالملک کو داخلی شورشوں کی وجہ سے پانچ سال تک شمالی افریقہ کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس دوران میں بلادِ مغرب کے بیشتر حصوں پر ملکہ دامیہ کا تسلط رہا۔ ۸۰ھ ۶۹۸ء میں عبدالملک نے ایک عظیم لشکر بڑے ساز وسامان کے ساتھ شمالی افریقہ روانہ کیا اور حسان کو پیغام بھیجا کہ اسے ساتھ لے کر اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات پھر حاصل کرو۔ ادھر ملکہ کو مسلمانوں کی آمد آمد کی اطلاع ملی تو اس نے حکم دیا کہ تمام بڑے بڑے شہروں اور کھیتوں کو ویران کر دیا جائے تاکہ اس علاقہ میں مسلمانوں کے لیے کوئی کشش نہ رہے۔ ملکہ دامیہ کے اس ظالمانہ اقدام سے اس کی رعایا چیخ اٹھی اور مسلمانوں کی حکومت کو ترجیح دینے لگی۔ ابن العذاری کا بیان ہے کہ رعایا ملکہ دامیہ کے اس قدر خلاف ہو گئی تھی کہ لوگ جوق در جوق آتے تھے اور حسان کے لشکر میں شامل ہو جاتے تھے۔ لوگوں کی مخالفت دیکھ کر ملکہ کاہنہ کو بھی اپنی شکست کا یقین ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک زبردست لشکر کے ساتھ حسان کے مقابلے پر آ گئی۔ دونوں فریقوں میں خونریز جنگ ہوئی جس میں ملکہ دامیہ کو شکست فاش ہوئی اور وہ اپنے بے شمار ساتھیوں سمیت میدانِ جنگ میں کام آئی۔ جو بربری بچ گئے انہوں نے حسان کی اطاعت قبول کر لی اور پھر ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا۔

اس فتح کے بعد حسان قیروان آ گئے اور اسے مرکزِ حکومت بنا کر حسن وخوبی

سے شمالی افریقہ کی امارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس زمانے میں صوبۂ مغرب (شمالی افریقہ) مصر کا ذیلی علاقہ شمار ہوتا تھا اور اس کا امیر والیٔ مصر کے ماتحت ہوتا تھا۔ وہ تین سال بعد والیٔ مصر عبدالعزیز (یا بروایتِ دیگر عبداللہ) بن مروان نے کسی غلط فہمی کی بناء پر حسان کو مغرب کی امارت سے معزول کر کے اپنے پاس بلا لیا اور ان کی جگہ موسیٰ بن نصیر کو مغرب کا گورنر مقرر کیا۔ اسی دوران میں بربریوں کے کئی قبائل میں پھر سرکشی کے آثار پیدا ہو چکے تھے موسیٰ نے ان سب کی سرکوبی کر کے تمام مغرب میں اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوطی سے قائم کر دیں۔ موسیٰ کے دورِ امارت میں مغرب کو مصر سے الگ کر کے مستقل صوبہ بنا دیا گیا۔ موسیٰ بن نصیر ایک اولوالعزم اور صاحبِ تدبیر شخص تھا اس نے اپنی فتوحات سے اسلامی اقتدار کی حدیں سمندر پار اندلس (ہسپانیہ یا سپین) تک وسیع کر دیں اور نو مفتوح ملک[1] (اندلس) کا الحاق بھی صوبۂ افریقیہ (یا مغرب) سے کر

---

[1] اندلس پر موسیٰ کے آزاد کردہ غلام طارق بن زیادؒ نے ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں حملہ کیا، ساحلِ اندلس پر قدم رکھتے وقت اس کے ساتھ صرف سات ہزار مجاہدین تھے بعد میں موسیٰ نے اس کی مدد کے لیے پانچ ہزار مجاہدین اور بھیج دیئے۔ بارہ ہزار کی اس مختصر جمعیت نے اندلس کے گاتھ فرمانروا راڈرک (لرزیق یا لوذریق) کے ایک لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل لشکر کو شکست فاش دی اور پھر تیزی سے اندرونِ ملک کی طرف پیشقدمی شروع کر دی۔ اگلے سال موسیٰ خود ایک لشکرِ جرار کے ساتھ اندلس میں وارد ہوا اور یلغار کرتا ہوا فرانس کی جنوب مغربی سرحد تک جا پہنچا۔ اس کا ارادہ تھا کہ فرانس آسٹریا اٹلی بلقان وغیرہ کو فتح کر کے قسطنطنیہ تک پہنچے لیکن عین اس وقت جب وہ اندلس پر اپنا قبضہ مکمل کر چکا تھا، دربارِ خلافت سے اس کو حکم موصول ہوا کہ فوراً دمشق پہنچے چنانچہ وہ اندلس کی حکومت اپنے بیٹے عبدالعزیز کے سپرد کر کے عازمِ دمشق ہو گیا۔ اس کے دمشق پہنچنے کے چند دن بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ اس کا جانشین سلیمان بن عبدالملک

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیا گیا۔ اس طرح افریقیہ (مغرب) کے گورنر کا دائرۂ اختیار دو وسیع خطہ ہائے زمین پر حاوی ہو گیا جن کے درمیان بحیرۂ روم موجزن تھا۔ بنو امیہ کے عہد میں موسیٰ بن نصیر کے بعد محمد بن یزید، اسماعیل بن عبداللہ، یزید بن ابو مسلم ثقفی، محمد بن اوس انصاری، بشر بن صفوان، عبیدہ بن عبدالرحمٰن سلمی، عبیداللہ بن الحجاب، کلثوم بن عیاض، حنظلہ بن صفوان، عبدالرحمٰن بن حبیب القرشی، الیاس بن حبیب اور حبیب بن عبدالرحمٰن یکے بعد دیگرے افریقیہ کی امارت پر فائز ہوئے۔ ۱۳۲ھ/۷۵۰ء میں بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہوا تو مغرب کے امیر خلفائے بنو عباس کی طرف سے مقرر ہونے لگے۔ لیکن خلافت عباسیہ کے قیام کے صرف چھ سال بعد اندلس، مغرب (یا بالفاظ دیگر خلافت عباسیہ) کے دائرہ اقتدار سے نکل گیا کیونکہ اس پر ایک اولوالعزم اموی شہزادے عبدالرحمٰن نے بنو امیہ کے ہواخواہوں کی مدد سے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی[1] تاہم تمام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بوجوہ موسیٰ کا مخالف تھا۔ اس نے موسیٰ پر بڑی سختیاں کیں۔ پہلے اسے قید کر دیا پھر امیر ابن المہلب پر سفارش پر رہا کر دیا اور جس قدر روپیہ اس سے وصول ہو سکتا تھا وصول کر کے وادی القریٰ میں نظر بند کر دیا۔ وہیں اس عظیم فاتح نے ۹۷ھ/۷۱۶ء میں بڑی بیکسی کے عالم میں وفات پائی۔

[1] عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک جو تاریخ میں عبدالرحمٰن اول یا عبدالرحمٰن الداخل کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۳۸ھ/۷۵۶ء میں بعمر پچیس سال اندلس کا فرمانروا بنا۔ بنو عباس نے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اموی خاندان کے لوگ چن چن کر قتل کر ڈالے، جو اموی کسی طرح بچ نکلے ان میں شہزادہ عبدالرحمٰن بھی تھا۔ وہ مدتوں افریقہ میں مارا مارا پھرتا رہا اور پھر اندلس پہنچ کر ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کی داستان حیات دردناک بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔ خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی اسے صقر قریش یعنی قریش کا شہباز (یا شاہین) کہا کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے ۳۳ برس اندلس پر حکومت کی اور ۱۷۲ھ/۷۸۸ء میں وفات پائی۔

بلادِ مغرب (طرابلس، الجزائر، تیونس اور مراکش) عباسی خلافت کے ماتحت ایک وحدت میں پروئے رہے۔ اس وحدت پر پہلی ضرب اس وقت لگی جب ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء میں بنو ادریس نے مراکش میں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر لی [۱]۔ اس طرح مغربِ اقصیٰ عباسیوں

---

[۱] حکومت بنو ادریس کے بانی ادریس بن عبداللہ الکامل بن حسن مثنیٰؒ بن امام حسنؓ بن حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تھے۔ ۱۶۹ھ / ۷۸۵ء میں بعہدِ خلافت ہادی عباسی الحسین بن علی بن حسن ثالث بن حسن مثنیٰؒ بن امام حسنؓ بن حضرت علیؓ مرتضیٰؓ نے حکومت کے خلاف خروج کیا تو ادریس بن عبداللہ الکامل بھی اپنے بھائی بندوں سمیت ان کے ساتھ تھے۔ مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلے پر بمقام فخ عباسی فوجوں اور آلِ علیؓ کے مابین خونریز جنگ ہوئی جس میں مؤخر الذکر کو ہزیمت ہوئی، حسین اور ان کے بہت سے ساتھی میدانِ جنگ میں کام آئے۔ ادریس بن عبداللہ کسی طرح بچ نکلے اور چھپتے چھپاتے مصر جا پہنچے۔ وہاں کے محکمہ ڈاک (برید) کے ایک افسر نے جو آلِ علیؓ کا ہوا خواہ تھا، ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء میں انہیں مراکش پہنچا دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں متعدد بربری قبائل ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور انہیں اپنا امام تسلیم کر کے عباسی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔ اس طرح ادریس بن عبداللہ زبردست قوت و شوکت کے مالک بن گئے اور چند ماہ کے اندر اندر انہوں نے تمام مراکش پر اپنا تسلط جما کر ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھی جو دولتِ ادریسیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۳۰۹ھ / ۹۲۱ء میں عبیدین یا فاطمیین نے دولتِ ادریسیہ کا خاتمہ کر دیا تاہم مراکش کے بعض چھوٹے چھوٹے علاقوں پر خاندانِ ادریسی کے افراد ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء تک قابض و متصرف رہے۔

مراکش کے ادریسی حکمرانوں کے نام یہ ہیں:-

(۱) ادریس اوّل ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء
(۲) ادریس ثانی ۱۷۷ھ / ۷۹۳ء
(۳) محمد بن ادریس ثانی ۲۱۳ھ / ۸۲۸ء
(۴) علی بن محمد ۲۲۱ھ / ۸۳۶ء

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے حلقۂ اقتدار سے نکل گیا۔ مغربِ ادنیٰ اور مغرب الاوسط (طرابلس، الجزائر اور تیونس) پر اگرچہ خلفائے عباسیہ کا اقتدار برقرار رہا لیکن اس سے ان کو کوئی مالی نفع حاصل نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہاں آئے دن شورشیں برپا ہوتی رہتی تھیں اور مرکزی حکومت کو ان علاقوں میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ہر سال خزانۂ مصر سے ایک لاکھ دینار خرچ کرنے پڑتے تھے۔ ۱۵۱ھ / ۷۶۷ء سے ۱۸۳ھ / ۷۹۹ء تک کے سالوں میں افریقیہ (مغربِ ادنیٰ اور مغرب الاوسط) کے سیاسی حالات سخت ابتر ہو گئے۔ ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء میں زاب کا والی ابراہیم بن اغلب تمیمی جو ایک صاحبِ تدبیر اور اولوالعزم شخص تھا خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں حاضر ہوا اور افریقیہ کی بدنظمی دور کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اس کے ساتھ ہی اس نے وعدہ کیا کہ اگر اسے افریقیہ کا والی بنا دیا جائے تو وہ خزانۂ مصر سے ایک لاکھ دینار سالانہ نہیں لے گا بلکہ اس کے برعکس وہ ہر سال چالیس ہزار دینار صوبہ افریقیہ کی طرف سے بطورِ خراج دربارِ خلافت میں بھیجا کرے گا۔ ہارون الرشید نے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسے افریقیہ کا والی مقرر کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء میں افریقیہ (الجزائر، طرابلس اور تیونس) میں بنو اغلب کی حکومت کا آغاز ہوا۔ جو تاریخ میں "دولتِ اغالبہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا دورِ اقبال ایک صدی سے زیادہ یعنی ۲۹۶ھ / ۹۰۸ء تک رہا۔ اغلبی حکمران بڑے منتظم اور بیدار مغز ثابت ہوئے انہوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۵) یحییٰ بن محمد (۶) یحییٰ ثانی بن یحییٰ (۷) علی ثانی بن عمر بن ادریس
(۸) یحییٰ ثالث بن قاسم بن ادریس ثانی (۹) یحییٰ چہارم بن ادریس بن عمر } ۲۳۴ھ / ۸۴۹ء تا ۳۰۹ھ / ۹۲۱ء

بنو ادریس کے متفرق حکمران جو مراکش کے چھوٹے چھوٹے اقطاع پر قابض رہے } ۳۰۹ھ / ۹۲۱ء تا ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء

نہ صرف افریقیہ کی بدنظمی کو دور کیا بلکہ علوم و فنون، صنعت و حرفت اور تجارت و فلاحت کو بھی بڑی ترقی دی اس کے ساتھ ہی انہوں نے فتوحاتِ ملکی کے میدان میں بھی بڑے سے شاندار کارنامے سرانجام دیئے اور ایک زبردست بحری بیڑہ تیار کرکے جزیرہ سسلی (صقلیہ) مالٹا اور سارڈینیا وغیرہ کو فتح کرلیا تاہم وہ مراکش کی ادریسی حکومت پر غلبہ نہ پاسکے اور شمالی افریقیہ میں یہ دونوں طاقتور حکومتیں پہلو بہ پہلو طویل عرصے تک قائم رہیں۔ ادریسی حکومت تو بالکل خودمختار تھی اور اس نے خلافتِ عباسی سے یکسر قطع تعلق کرلیا تھا لیکن بنو اغلب نے زبردست قوت و شوکت کے مالک ہونے کے باوجود کبھی اپنی خودمختاری کا دعویٰ نہیں کیا گو عملاً وہ اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں بالکل آزاد اور خودمختار تھے لیکن رسمی طور پر وہ خلیفۂ عباسی ہی کو اپنا سربراہ تسلیم کرتے تھے۔ ہر نیا اغلبی حکمران تخت نشینی کے وقت خلیفہ سے ضابطہ کی منظوری حاصل کرتا تھا اور مقررہ خراج ہر سال دربارِ خلافت کو باقاعدگی سے بھیجتا تھا۔ خطبوں میں بھی پہلے عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا اور اس کے بعد اغلبی حکمران کا۔[1]

---

[1] دولتِ اغالبہ (یا اغلبیین) کے حکمرانوں کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ ابراہیم بن اغلب تمیمی — سنہ ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء
۲۔ ابوالعباس عبداللہ بن ابراہیم — سنہ ۱۹۶ھ / ۸۱۲ء
۳۔ ابومحمد زیادۃ اللہ بن ابراہیم — سنہ ۲۰۱ھ / ۸۱۷ء
۴۔ ابوالعقال بن الاغلب — سنہ ۲۲۳ھ / ۸۳۸ء
۵۔ ابوالعباس محمد بن اغلب — سنہ ۲۲۶ھ / ۸۴۱ء
۶۔ ابوابراہیم احمد بن محمد — سنہ ۲۴۹ھ / ۸۶۳ء
۷۔ زیادۃ اللہ ثانی بن محمد — سنہ ۲۴۹ھ / ۸۶۳ء
۸۔ ابوالغرانیق محمد بن احمد — سنہ ۲۵۰ھ / ۸۶۴ء
۹۔ ابراہیم ثانی بن احمد — سنہ ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء
۱۰۔ ابوالعباس عبداللہ محمد بن ابراہیم — سنہ ۲۸۹ھ / ۹۰۲ء
۱۱۔ ابوالمضر زیادۃ اللہ ثالث بن ابوالعباس — سنہ ۲۹۶ھ / ۹۰۹ء

شمالی افریقہ میں دولتِ فاطمیہ کا قیام

نویں اغلبی فرمانروا ابراہیم ثانی بن احمد (۲۶۱ھ / ۸۷۵ء تا ۲۸۹ھ / ۹۰۲ء) کے عہدِ حکومت میں شمالی افریقہ میں اسمٰعیلی (فاطمی) تحریک نے زور پکڑنا شروع کیا۔ اسمٰعیلیوں[1] اور اغلبیوں کے درمیان مدتوں معرکے ہوتے رہے جن میں بالآخر اسمٰعیلی غالب آ گئے۔ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۲۹۶ھ / ۹۰۸ء کو آخری اغلبی تاجدار ابو مضر زیادۃ اللہ کو افریقہ سے نکال کر انہوں نے تمام حدودِ دولتِ اغالبہ پر قبضہ کر لیا اور اغالبہ کے قصرِ اقتدار کے کھنڈروں پر دولتِ فاطمیہ کی (جسے فاطمیین، عبیدین، علویہ اور مہدویہ بھی کہتے ہیں) بنیاد رکھی[2]۔ مغرب میں دولتِ فاطمیہ کے قیام کا مطلب یہ تھا کہ افریقہ سے خلافتِ عباسی کا تعلق

---

[1] اسمٰعیلی یا فاطمی تحریک اس سیاسی جدوجہد کا نام ہے جو شیعوں کے فرقہ اسمٰعیلیہ نے بنو عباس کے ہاتھ سے زمامِ اقتدار چھین کر بنو فاطمہ کے حوالے کرنے کے لیے کی۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کے بعد حضرت امام حسنؓ، امام حسینؓ، امام علی زین العابدینؒ، امام محمد باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ کی امامت پر قریب قریب تمام شیعانِ اہلِ بیت کا اتفاق رہا۔ ۱۴۸ھ / ۷۶۵ء میں امام جعفر صادقؒ نے وفات پائی تو شیعوں کے سوادِ اعظم نے امام موسیٰ کاظمؒ کو ساتواں امام تسلیم کیا۔ لیکن ایک گروہ نے امام جعفر صادقؒ کے ایک دوسرے فرزند اسمٰعیل کو ساتواں امام قرار دیا۔ اول الذکر نے امام موسیٰ کاظمؒ کے بعد امام علی رضاؒ۔ امام محمد تقیؒ۔ امام علی نقیؒ۔ امام حسن عسکریؒ اور امام محمد مہدی منتظر پر امامت تمام کر دی۔ یہ اثنا عشری کہلائے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بحیرہ ختم ہو گیا۔ دولت عبیدین یا فاطمیہ کا بانی ابو محمد عبید اللہ المہدی بڑا اولوالعزم شخص تھا۔ اس نے ایک نئے شہر "مہدیہ" کی تاسیس کر کے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا اور چند سال کے اندر اندر دولت ادریسیہ کا خاتمہ کر کے مراکش کو بھی اپنی سلطنت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اسمٰعیلیوں کا سلسلۂ امامت امام جعفر صادقؒ کے بعد اس طرح چلا ——— امام اسمٰعیل، امام محمد المکتوم، امام جعفر المصدق، امام محمد الحبیب، امام ابو محمد عبید اللہ المہدی اور ان کے جانشین ——— اسمٰعیلیوں کا عقیدہ تھا کہ سلسلۂ امامت غیر محدود ہے اور کوئی زمانہ امام سے خالی نہیں رہتا۔ نیز خلافت کا حق خانوادۂ علیؓ تک محدود ہے اور اس کے حقدار وہ لوگ ہیں جو حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے بطن سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد ہوں۔ ان لوگوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز بڑے منظم طریقے سے کیا اور اپنے دعاۃ تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلا دیئے۔ انہوں نے اسمٰعیلی عقائد کا خوب پرچار کیا۔ عباسی حکومت کو ان عزائم کا علم ہوا تو اس نے ان کی کڑی نگرانی شروع کر دی لیکن اسمٰعیلی زیر زمین رہ کر بدستور اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ تیسری صدی ہجری کے وسط میں اسمٰعیلیوں کے امام محمد الحبیب نے اس تحریک میں نئی روح پھونک دی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اسمٰعیل بن امام جعفر صادقؒ کی نسل سے ہے اور امام مہدی عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں جو عباسیوں سے زمام اقتدار چھین لیں گے۔ (بعد میں اسمٰعیلیوں نے محمد الحبیب کے فرزند ابو محمد عبید اللہ ہی کو امام مہدی قرار دیا) محمد الحبیب نے اپنی جماعت کا مرکز شام کے ایک شہر سلمیہ کو بنایا تھا۔ وہیں سے وہ اپنے داعی دوسرے ملکوں کو روانہ کرتا تھا۔ اس کے ایک صاحب تدبیر اور اولوالعزم داعی ابو عبد اللہ الشیعی نے اسمٰعیلی دعوت کو شمالی افریقہ میں خوب پھیلایا اور جنگجو بربری قبائل کے ایک جم غفیر کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے بعد وہ کھل کر اغلبی حکومت کے مقابلہ پر آ گیا ——— یہاں تک کہ محمد الحبیب کے بعد اس کے فرزند ابو محمد عبید اللہ کے عہد میں اسمٰعیلی تحریک شمالی افریقہ میں کامیابی کی منزل سے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں شامل کر لیا۔ اس طرح تمام بلادِ مغرب (طرابلس الغرب، الجزائر، تیونس اور مراکش) معدودے چند مقامات کے سوا دولتِ فاطمیہ کے تصرف میں آ گئے۔ عبید اللہ المہدی نے اپنے دورِ حکومت میں سسلی (صقلیہ) کو بھی فتح کر لیا اور پھر اٹلی پر حملے شروع کر دیئے یہاں تک کہ ۳۱۷ھ (۹۲۹ء) میں اٹلی کی "حکومتِ قلوریہ" نے اس کے سامنے سپر ڈال دی اور صلح کی درخواست کی۔ عبید اللہ المہدی نے مطالبہ کیا کہ حکومتِ اٹلی ہر سال ایک خطیر رقم دولتِ فاطمیہ کو بطور خراج ادا کیا کرے۔ حکومتِ اٹلی نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا چنانچہ اسی پر معاہدہ مرتب ہو گیا اور فاطمی افواج اٹلی سے واپس آ گئیں۔

عبید اللہ المہدی ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہی نہیں تھا بلکہ اسمٰعیلی تحریک کا داعی اور امام بھی تھا چنانچہ اس نے اپنی حکومت کو خلافت کا نام دے دیا۔ اس طرح عالمِ اسلام میں تین خلافتیں قائم ہو گئیں، بغداد کی عباسی خلافت، ہسپانیہ (اندلس) کی اموی خلافت اور شمالی افریقہ (مغرب) کی فاطمی خلافت۔ عبید اللہ المہدی تقریباً پچیس ۲۵ سال حکومت کر نے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ہمکنار ہو گئی۔ اسمٰعیلیوں کا امام تخت و تاج کا مالک بن گیا اور اس نے عباسی خلافت کے مقابلے پر فاطمی خلافت کی داغ بیل ڈال دی۔ زوال پذیر عباسی خلفاء نے جب دیکھا کہ وہ اس حریف خلافت کو بزورِ قوت ختم نہیں کر سکتے تو انہوں نے اس کا زور اور اثر گھٹانے کے لیے ایک محضر تیار کرایا جس میں فاطمی حکمرانوں کی صحتِ نسب کا انکار کیا اور انہیں مجوسی النسل قرار دیا لیکن عباسیوں کا یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہوا اور دولتِ فاطمیہ برابر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ ابنِ اثیر، ابنِ خلدون، ابو الفدا اور مقریزی نے عباسیوں کے محضر کو محض ایک سیاسی چال قرار دیا ہے اور خلفائے فاطمیہ کے نسب کو صحیح تسلیم کیا ہے البتہ بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ فاطمی خلفاء فی الواقع ایک مجوسی میمون قدح اہوازی کی نسل سے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کے بعد ۳۲۲ھ / ۹۳۴ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد شمالی افریقیہ کے تخت حکومت پر تین فاطمی حکمران یکے بعد دیگرے (القائم بامر اللہ، المنصور باللہ اور المعز لدین اللہ) بیٹھے المعز لدین اللہ کے ایک فوجی جرنیل جوہر نے ۳۵۸ھ / ۹۶۹ء میں مصر فتح کر کے دولتِ فاطمیہ کی حدود کو بحیرۂ قلزم تک پہنچا دیا۔ اسی سال اس نے مصر کے قدیم دارالحکومت فسطاط کے قریب قاہرہ کا عظیم الشان شہر بسایا۔ چار برس کے بعد المعز لدین اللہ بھی قاہرہ میں اٹھ آیا اور یہ شہر دولتِ فاطمیہ کا دارالخلافہ قرار پایا۔

قاہرہ جانے سے پہلے المعز نے ایک معتمد بربری امیر ابوالفتوح یوسف بلکین (یا بلجتین) بن زیری بن مناد صنہاجی کو سیف الدولہ کا خطاب دے کر افریقیہ کا گورنر مقرر کیا لیکن افریقیہ کی ولایت سے صقلیہ (سسلی) اور طرابلس الغرب (لیبیا) کو الگ کر لیا۔ ابوالفتوح یوسف بلکین کا خاندان (زیارئین یا بنو زیری) تیونس اور اس کے نواحی علاقوں پر ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء تک حکومت کرتا رہا۔ ان کا دارالحکومت مہدیہ تھا۔ ۳۹۸ھ / ۱۰۰۷ء میں ایک اور خاندان بنو حماد (حمادئین) نے بجایہ اور الجزائر میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی۔ یہ خاندان ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء تک حکمران رہا اور ہمیشہ دولتِ فاطمیہ کی اطاعت کا دم بھرتا رہا البتہ زیارئین کے چوتھے حکمران معز بن بادیس بن منصور بن یوسف بلکین (۴۰۶ھ / ۱۰۱۵ء تا ۴۵۳ھ / ۱۰۶۱ء) نے فاطمی حکومت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور رسمی طور پر خلیفۂ عباسی کی اطاعت قبول کر لی [1]

---

[1] یہ حکومت عملاً بالکل خود مختار تھی اور خلافتِ عباسیہ سے اس نے اپنا تعلق محض فاطمی خلافت کی ضد میں قائم کیا تھا۔ معز بن بادیس نے دولتِ فاطمیہ سے اپنا سیاسی تعلق ہی نہیں توڑا بلکہ اس کے مذہبی اثرات کو بھی اپنے زیرِ اثر علاقوں میں بالکل ختم کر دیا اور عقائدِ اہلِ سنت (فقہ مالکی) کی خوب تبلیغ و اشاعت کی جن لوگوں نے اس کی ذرا بھی مزاحمت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آخری زیاری حکمران حسن بن علی (بن یحییٰ بن تمیم بن معز بن بادیس) کے زمانہ میں، جو ۵۱۵ھ ؍ ۱۱۲۱ء میں تخت پر بیٹھا، سلطنت نہایت ضعیف ہو گئی۔ اس کا فائدہ اٹھا کر صقلیہ (سسلی) کے نارمن حکمران روجر دوم (ROGER-II) نے شمالی افریقیہ پر حملہ کر دیا اور دار الحکومت مہدیہ کو فتح کر کے دولتِ زیاریین کا خاتمہ کر دیا۔ (۵۴۳ھ ؍ ۱۱۴۸ء)۔

دوسری طرف مراکش (مغربِ اقصیٰ) میں مختلف بربری قبائل مکناسا، المتونہ، زناتہ وغیرہ خود مختار ہو گئے۔ اس طرح ملک کے اندر کئی چھوٹی چھوٹی خود مختار اور نیم خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں جو ایک دوسرے کے درپے آزار رہتی تھیں اس پر مستزاد یہ کہ بربری لوگ طرح طرح کی اخلاقی خرابیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اور قرآن و سنت کو یکسر فراموش کر ڈالا تھا۔ بعض قبائل ایک جھوٹے مدعیٔ نبوت صالح بن طریف کا مذہب اختیار کر کے سرے سے اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے (اس کی تفصیل آگے آئے گی) بعض نے کثرتِ ازدواج کو اپنا شعار بنا لیا تھا اور ایک آدمی بیک وقت دس دس عورتوں سے شادی کر لیتا تھا۔ کچھ دوسروں نے شراب کو مباح قرار دے دیا تھا اور بادہ خواری کو اپنے لیے باعثِ شرف و عزت سمجھ لیا تھا۔ غرض ہر طرف فواحش و منکرات کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر اندلس کی اموی حکومت نے مغربِ اقصیٰ پر یلغار کر دی اور اس کے ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ابنِ عذاری کا بیان ہے کہ صرف قیروان میں تین ہزار اسمٰعیلی مارے گئے جس مقام پر یہ لوگ قتل ہوئے اس کا نام برکۃ الدم مشہور ہو گیا۔ اس موقع پر کئی سنی شاعروں نے معز کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے۔

خاصے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ مختصر یہ کہ پانچویں صدی ہجری (یا گیارھویں صدی عیسوی) کے وسط میں شمالی افریقہ میں طوائف الملوکی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے پُرجوش اور دیندار مسلمانوں پر مشتمل ایک نئی قوت اُبھری جس نے دیکھتے ہی دیکھتے حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ یہ نئی قوت مرابطین (مراطون) کی تھی جو افریقہ میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ یہی مرابطین، موحّدین کی عظیم الشان خلافت کے پیشرو تھے۔

(ALMORAVIDE)

(مؤحّدین کے پیشرو)

المرابطون (یا المرابطین) کا کُل دَورِ حکومت ایک صدی سے بھی کم مدت پر محیط ہے اور اس مختصر مدت میں بھی ان کا دورِ عروج صرف نصف صدی کے لگ بھگ ہے تاہم یہ زمانہ تاریخ اسلام کے بہترین ادوار میں شمار ہوتا ہے۔

مرابطون کا ظہور، ان کی دعوت، فتوحات اور عروج ایک دلآویز اور ایمان افروز داستان ہے جس کے بیان کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ چونکہ ہماری کتاب کا یہ موضوع نہیں ہے اس لیے ہم ان سرفروش مجاہدین کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ یہاں بیان کریں گے۔

امیر یحییٰ بن ابراہیم جدالی

پیچھے ذکر آچکا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں سیاسی خلفشار کے ساتھ مغرب اقصیٰ میں بے دینی اور الحاد کا سیلاب بھی اُمڈ آیا تھا اور فواحش و منکرات کی آگ نے اہلِ مغرب کی حمیتِ دینی کو خاکستر بنا ڈالا تھا تاہم ابھی اس راکھ میں بھی کچھ چنگاریاں باقی تھیں۔ یہ وہ اہلِ حق تھے جن کو اس مسموم ماحول نے ذرہ برابر متاثر نہیں کیا تھا اور وہ برابر جادۂ مستقیم پر گامزن تھے۔ وہ ملک کی سیاسی، معاشرتی اور دینی ابتری پر دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ اس کے سوا وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی۔ برائی اتنی پھیل چکی تھی کہ

اس کی اصلاح ان چند گنے چُنے مردانِ صالح کے بس سے باہر تھی۔ ان میں سے کچھ تو بددل ہو کر پڑوسی ممالک میں جا بسے تھے اور بعض اپنی اپنی جگہ مقیم رہ کر اصلاح احوال کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ ایسے ہی مردانِ حق میں بربریوں کے قبیلہ صنہاجہ کی ایک شاخ کدالہ (یا جدالہ) کے امیر یحییٰ بن ابراہیم بھی تھے۔ وہ بڑے متدین اور دردمند مسلمان تھے اور مسلکِ اہلِ سُنّت پر عامل تھے۔ اہلِ مغرب کی حالت دیکھ کر وہ دن رات ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے رہتے تھے۔ ۴۲۰ھ / ۱۰۲۹ء میں انہوں نے قبیلے کی امارت اپنے بیٹے ابراہیم کے سپرد کی اور خود اپنے قبیلے کے چند ممتاز لوگوں کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے حجازِ مقدس روانہ ہو گئے۔

حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد وہ بلادِ اسلامیہ کی سیّاحت میں مشغول ہو گئے۔ اثناءِ سیّاحت (یا واپسی کے سفر کے دوران میں) وہ تیونس کے شہر قیروان پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک نامور عالم شیخ ابو عمران موسیٰ بن ابوحجاج فاسی سے ہوئی۔ شیخ فقہ مالکی کے امامِ وقت تھے، قرآن حدیث اور دوسرے علومِ دینی میں درجۂ تبحّر رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نہایت عابد و زاہد اور حق گو تھے۔ فواحش و منکرات کی علی الاعلان نکیر کرتے تھے اور کوئی بڑی سے بڑی شخصیت انہیں حق بات کہنے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ ان کی یہی حق گوئی اور بے باکی مغرب کے اربابِ حکومت کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی تھی اور انہوں نے شیخ موصوف کو جلاوطن کر دیا تھا۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر قیروان آ گئے تھے اور وہاں ایک عظیم الشان درسگاہ قائم کی تھی۔ یہ درسگاہ تشنگانِ علم کے لیے چشمۂ رحمت ثابت ہوئی۔ ہزاروں لوگ اس سے فیضیاب ہوئے جن میں سے کئی سرآمدِ روزگار علماء میں شمار ہوئے اور اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر ہدایت و اصلاح کی شمع روشن کی۔ شیخ ابو عمران مغرب کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور ان کی دلی تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ اصلاح کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ امیر یحییٰ بن ابراہیم

کی ان سے ملاقات فی الحقیقت دو دردمند دلوں کی ملاقات تھی۔ دونوں کئی دن تک مغرب کے حالات کی اصلاح کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ بالآخر امیر یحییٰ نے شیخ ابوعمران سے درخواست کی کہ وہ ان کے ساتھ کوئی ایسا عالمِ دین بھیجیں جو ان کی قوم کے جاہل اور کندۂ ناتراش لوگوں کو قرآن وسنّت کی تعلیم سے بہرہ ور کرے اور ہر قسم کے نامساعد حالات کا جرأت اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرے۔ شیخ کی اپنی درسگاہ میں اس وقت ان اوصاف کا حامل کوئی شخص نہ تھا، انہوں نے اپنے ایک شاگرد شیخ دجاج اللمطی (یا وجاج بن زلوا) کو جو وادیٔ نفیس میں واقع رباط (خانقاہ) میں درس و تدریس اور تبلیغ وہدایت کا کام انجام دیتے تھے، ایک خط لکھ دیا کہ وہ اپنی رباط سے مطلوبہ اوصاف کے حامل کسی شخص کو امیر یحییٰ کے ساتھ بھیج دیں۔ چنانچہ ۴۳۰ھ میں امیر یحییٰ شیخ دجاج کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنے عظیم المرتبت استاد کا خط پڑھ کر اس کو چوما اور کہا کہ میں استاذِ محترم کے حکم کی تعمیل بدل وجان کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک شاگرد عبداللہ بن یاسین جزولی کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا اور انہیں اپنی پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ امیر یحییٰ کے ساتھ مغرب روانہ کر دیا۔

عبداللہ بن یاسینؒ

ایک عظیم مُصلح اور مجاہد

عبداللہ بن یاسین فی الحقیقت اصلاح و تبلیغ کے عظیم کام کے اہل تھے۔ وہ نہ صرف ایک عالم فاضل اور متقی آدمی تھے بلکہ جذبۂ جہاد سے بھی سرشار تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کو بربری زبان پر عبور حاصل تھا اور وہ مختلف بربری قبائل کی عادات اور طبائع سے بھی خوب واقف تھے۔ انہوں نے مغرب پہنچ کر بڑی تندہی سے دعوت و اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے امیر یحییٰ نے خود ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر ان کی مستقل معیت اختیار کر لی۔ وہ مختلف صحرائی قبائل کے پاس جاتے انہیں قرآن و سُنّت کی تعلیم دیتے، دین کے احکام سمجھاتے اور منکرات و بدعات کو ترک کرنے کی ہدایت کرتے۔ ان قبائل کے امراء اور عوام کے عقائد اور اعمال میں حد درجہ کا بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اسلام کا نام تو جانتے تھے لیکن اس کی حقیقت سے بالکل ناآشنا تھے۔ ابنِ یاسینؒ نے جہاں عوام کے عقائد اعمال اور اخلاق کی درستی کی طرف توجہ کی وہاں انہوں نے امراء کو بھی راہِ راست پر لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ یہ امراء اپنے محکوموں پر بے پناہ مظالم ڈھاتے تھے اور ان کے ساتھ حیوانوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ ابنِ یاسینؒ اس تاریک ماحول میں ایک شمعِ نور کی حیثیت رکھتے تھے وہ ان لوگوں کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر کاربند ہونے کی تلقین کرتے تھے، امراء

کو خلفائے راشدینؓ کا طرزِ عمل اپنانے کی ہدایت کرتے تھے اور ہر قسم کے استحصال، لوٹ کھسوٹ اور حرام خوری سے منع کرتے تھے۔ یہ لوگ جو گلے گلے تک گمراہی کی دلدل میں دھنس چکے تھے، ابن یاسینؒ کی دعوت وتبلیغ سے بھڑک اٹھے اور ان کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنے لگے۔ ان بدبختوں نے ابن یاسینؒ کو جسمانی اذیتیں پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا۔ تاہم امیر یحییٰ کے اثر و رسوخ اور حمایت کی وجہ سے ان کی جان محفوظ رہی۔ بدقسمتی سے اسی زمانے میں امیر یحییٰ وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ابن یاسینؒ کی مخالفت بہت بڑھ گئی۔ مشتعل قبائل نے ان پر جینا دوبھر کر دیا۔ ایسے حالات میں تبلیغ و اصلاح کا کام مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ چنانچہ ابن یاسینؒ سُنّتِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے اس مقام سے ہجرت کر کے زیریں سینیگال کے ایک جزیرہ نائیجر (NIGER ILAND) میں مقیم ہو گئے۔ ان کا ساتھ صرف سات آدمیوں نے دیا جو دل وجان سے ان کی دعوت قبول کر چکے تھے [1]۔

ابن یاسینؒ نے نائیجر میں ایک رباط (خانقاہ) کی بنیاد رکھی۔ اُسے انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اپنا مرکز بنایا اور اس میں بیٹھ کر وہ کامل یکسوئی کے ساتھ عبادت اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اسی رباط کی نسبت سے ابن یاسینؒ کی دعوت قبول کرنے والوں کو مرابطون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس رباط نے شمالی افریقیہ میں کیا کارنامہ

---

[1] علامہ ابن العذاری کا بیان ہے کہ امیر یحییٰ بن ابراہیم اس وقت حیات تھے اور وہ بھی ابن یاسینؒ کے ساتھ اپنے وطن سے ہجرت کر کے نائیجر چلے گئے جہاں کچھ عرصہ بعد انہوں نے وفات پائی۔ دوسرے مؤرخین کے نزدیک امیر یحییٰ ابن یاسینؒ کی ہجرت سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ ابن یاسینؒ کے ساتھیوں میں بلاشبہ یحییٰ نام کے ایک صاحب ضرور تھے لیکن ان کا نام یحییٰ بن عمر تھا اور وہ قبیلہ لمتونہ کے سردار تھے۔

سرانجام دیا اس کی تصویر ایک عرب ادیب سعید اعراب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"ابن یاسین کی یہ رباط گویا ایک منارۂ نور تھی جس کی ضیا پاشی نے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ظلمت بدوش صحرا کو منور کر دیا۔ اس خانقاہ کے مکینوں کے علم و فضل اور زہد و ورع کا شہرہ جلد دُور دُور پھیل گیا اور لوگ جوق در جوق آ کر ابن یاسینؒ کی جماعت میں شامل ہونے لگے اس کے علاوہ ابن یاسینؒ نے مختلف قبیلوں میں اپنے تبلیغی وفود بھیجے اور اپنے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت بھی کی۔ اس طرح ان کی جماعت روز بروز بڑھتی ہی گئی یہاں تک کہ اس کی تعداد ایک ہزار سے اوپر پہنچ گئی۔ جب ابن یاسین کے اعوان و انصار کی تعداد زیادہ ہو گئی اور ان کی حیثیت مضبوط ہو گئی تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ اب برائی کے خلاف جہاد بالسیف بھی کریں گے اور اس کے لیے بڑی تیاری اور سخت مشق کی ضرورت ہے اس کے علاوہ قوتِ ایمانی، خلوص، سخت کوشی اور اتحاد و تنظیم بھی چاہیئے اس کے پیشِ نظر وہ اس وقت تک کسی شخص کو جماعتِ مرابطین میں شامل نہ کرتے جب تک وہ نئے سرے سے قولاً و فعلاً اسلام سے مکمل وفاداری کا عہد نہ کرتا، اپنا تزکیۂ نفس نہ کر لیتا اور اپنی گزشتہ زندگی کی لغزشوں کا محاسبہ نہ کر لیتا۔ جماعتِ مرابطین میں شامل ہونے کے ہر خواہشمند سے ان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور سابقہ زندگی کے گناہوں کے لیے اپنے اوپر حد جاری کرائے۔ اگر وہ یہ مطالبہ مان لیتا تو پھر اس پر حد قائم کی جاتی۔ اس میں خاص اور عام یا امیر اور غریب میں مطلق کوئی امتیاز نہ روا رکھا جاتا۔ جو شخص برضا و رغبت اس حد کو اپنے اوپر جاری کروا لیتا، اسے ابنِ یاسینؒ اپنی دعوت و تحریک کی مشقتیں برداشت کرنے

کا اہل قرار دیتے۔ اس کے بعد وہ اس شخص کی تعلیم و تربیت کا ذمہ لیتے۔ وہ اسے قرآن و حدیث پڑھاتے اور احکامِ دین کی تعلیم دیتے۔ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی اور اسے لہو و لعب کا کوئی موقع نہ دیا جاتا۔ مرابطین کو نماز با جماعت پڑھنے پر مجبور کیا جاتا۔ جو اس میں غیر حاضر ہوتا اسے بیس کوڑوں کی سزا ملتی اور جس سے جماعت کی ایک رکعت ترک ہوتی اسے پانچ کوڑے مارے جاتے۔ ہر نماز با جماعت کے ساتھ ایک اور نماز ادا کی جاتی جو پہلی فوت شدہ نمازوں کی قضا کے طور پر محسوب ہوتی۔ جو مسجد میں شور کرتا اسے اس کی سزا ملتی۔ اسی طرح اور بھی سزائیں مقرر تھیں جو زیادہ تر احکامِ فقہ کے مطابق تھیں۔ یہ سب اس لیے تھا کہ ابن یاسینؒ اپنی جاہل قوم کو تہذیب سکھانا چاہتے تھے اور اسے انتشار اور اخلاقی آوارگی سے بچا کر اسلام کا سچا پیرو بنانا چاہتے تھے۔" [1]

مختلف مؤرخین نے ابن یاسینؒ کی خانقاہ کے جو حالات و کوائف بیان کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خانقاہ کے قیام سے ان کا مقصد تارک الدنیا راہبوں کی جماعت تیار کرنا نہ تھا بلکہ فی الحقیقت وہ اپنے رفقاء کو اصحابِ صُفّہؓ کے طریق پر گامزن کر کے ایک عظیم مقصد یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار کر رہے تھے۔ صحرائی قبائل میں ایک تو وہ قبائل تھے جو اگرچہ مسلمان کہلاتے تھے لیکن ان کے عقائد و اعمال مشرکین اور کفار سے بھی بدتر تھے۔ دوسرے قبائل کھلم کھلا بت پرست اور کافر تھے۔ ان قبائل کے درمیان اپنے طویل قیام کے دوران میں ابن یاسینؒ بخوبی سمجھ گئے تھے کہ

---

[1] ماہنامہ دعوت الحق۔ رباط (مراکش) عربی سے اردو ترجمہ بہ ادنیٰ تغیر از ماہنامہ معارف لاہور نومبر ۱۹۶۹ء۔

ع عصا نہ ہو تو کارِ کلیمی ہے بے بنیاد

سالہا سال کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں صرف گنتی کے چند افراد کے ہدایت قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ بدمزاج اور مغرور قبائل صرف قوت کی زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ نائیجر کی خانقاہ ابن یاسینؒ نے اسی قوت کی فراہمی کے لیے قائم کی تھی۔ جب انہیں یہ قوت میسر آگئی تو وہ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

پر عمل پیرا ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ایک ہزار تربیت یافتہ مجاہدین کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"تمہاری تعداد اب کافی ہو گئی ہے۔ تم اللہ کا شکر بجا لاؤ کہ اس نے تمہاری اصلاح کی اور تمہیں راہِ ہدایت پر چلنے کی توفیق دی اگر تم نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا تو تمہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں کیا تم تیار ہو؟"

سب مرابطین نے بیک آواز کہا "

"ہم حاضر ہیں۔ ہم حاضر ہیں۔ اگر اللہ کی راہ میں ہمیں اپنے اعزہ واقارب کے خلاف بھی تلوار اٹھانی پڑی تو ہم اس سے ہرگز دریغ نہیں کریں گے!"

چنانچہ ابن یاسینؒ ان مجاہدین کو ساتھ لے کر سب سے پہلے قبیلہ جدالہ میں پہنچے اور انہیں راہِ ہدایت پر چلنے کی تلقین کی۔ اس قبیلہ کو اپنی کثرتِ تعداد پر بڑا ناز تھا انہوں نے ابن یاسینؒ کی دعوت کو رد کر دیا۔ اب ان کے خلاف لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مرابطی مجاہدین نے ایک ہی ہلے میں ان کے سارے کس بل نکال دیئے اور انہیں اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ جدالہ کے بعد لمتونہ (یا لمطونہ) کی باری

کی باری آئی۔ یہ ایک طاقتور اور جنگجو قبیلہ تھا۔ اس کے دو سردار یحییٰ بن عمر اور ابوبکر بن عمر اگرچہ شروع ہی سے ابنِ یاسینؒ کے ساتھ تھے لیکن لمتونیوں نے پھر بھی مسلح مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ پُرجوش مرابطیوں نے ان کو بھی جلدی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد وہ سچے دل سے ابنِ یاسینؒ کی تحریک اصلاح وجہاد میں شامل ہو گئے اور اس کے بازدئے شمشیر زن ثابت ہوئے۔ علامہ ابنِ خلّکان کا بیان ہے کہ یہ لوگ اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھتے تھے اس لیے ان کو ملثمین (نقاب پوش) کہا جاتا تھا[1]۔ چونکہ بعد میں مرابطین کی عنانِ قیادت لمتونیوں کے ہاتھ میں آ گئی اس لیے مرابطون کو ملثمین بھی

---

[1] علامہ ابنِ خلکان کہتے ہیں کہ لمتونیوں پر ان کے دشمن اکثر چھاپے مارتے رہتے تھے اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی عورتوں اور مال کو لوٹ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ تنگ آ کر انہوں نے دشمن کو دھوکا دینے کے لیے یہ تجویز سوچی کہ اپنی عورتوں کو مردانہ لباس پہنا کر کہیں باہر بھیج دیا اور خود زنانہ کپڑے پہن کر اور چہرے چھپا کر پیچھے رہے۔ دشمن اپنے معمول کے مطابق حملہ آور ہوا تو لمتونی جنگجوؤں نے اسے اپنی تلواروں پر رکھ دیا۔ اس دن کے بعد کسی کو ان کی غیر حاضری میں حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لمتونیوں نے بھی اسی دن سے اپنے چہروں پر ڈھاٹا باندھنے کی رسم کو مستقلاً اختیار کر لیا۔

علامہ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ لمتونہ کے تمام مرد کسی دشمن قبیلے پر چھاپہ مارنے کے لیے چلے گئے اور ان کے گھروں میں صرف بوڑھے بچے اور عورتیں رہ گئیں۔ بدقسمتی سے لمتونیوں نے دشمن سے شکست کھائی۔ دشمن ان کو رگیدتے ہوئے ان کے گھروں تک آ پہنچے۔ بوڑھوں نے جب دشمن کو سر پر پایا تو فوراً عورتوں کو مردوں کا لباس پہنا اور چہرے ڈھک کر میدان میں لا کھڑا کیا۔ دشمن انہیں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے۔ اتنے میں لمتونہ کے شکست خوردہ مرد بھی آ پہنچے۔ اس طرح دشمن دونوں طرف سے گھر گئے اور اپنے بے شمار آدمی مروا کر بھاگ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی کہنے لگے۔ جدالہ اور لمتونہ کے بعد دوسرے قبیلے بھی ایک ایک کرکے ابن یاسینؒ کے حلقۂ اطاعت میں آ گئے۔ اس طرح ابن یاسینؒ کے پاس ہزاروں سرفروشوں پر مشتمل

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)۔ گئے۔ اس کے بعد لمتونی مردوں نے چہرہ پر ڈھاٹا باندھنے کی رسم کو اپنا شعار بنا لیا۔ ان لوگوں کے اخلاف آج بھی اس رسم پر عامل ہیں اور طوارق (TOUREGE) کہلاتے ہیں۔ طوارق کی عورتیں تو پردے کی چنداں پابند نہیں ہیں۔ لیکن ان کا ہر ایک مرد آنکھوں کے نیچے کا حصہ نقاب سے ڈھانک کر باہر نکلتا ہے۔ مشہور مستشرق پروفیسر فلپ کے حتیؔ (P.K. HITI) نے مرابطین کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

"دراصل مرابطین کی جماعت ایک مذہبی اور سیاسی برادری تھی جس کو گیارھویں صدی کے وسط میں ایک پاکباز مسلمان نے قائم کیا تھا۔ رباط کی مناسبت سے یہ مرابطین کہلاتے ہیں۔ رباط ایک قلعہ بند خانقاہ تھی جو زیریں سینیگال کے قریب ایک جزیرہ میں واقع تھی پہلے مریدین یا اخوان زیادہ تر قبیلہ لمساء سے تعلق رکھتے تھے جو قبیلہ صنہاجیہ کی ایک شاخ تھی اور جس کے افراد صحرا کے بنجر علاقوں میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے اور جیسا کہ ان کے اخلاف جنوبی صحرا کے طوارق آج تک اس پر عامل ہیں۔ وہ آنکھوں کے نیچے کے حصے کو نقاب سے ڈھانکتے تھے۔ ان کے مرحل میں یہ عجیب رسم دوسرے نام یعنی ملثمین (نقاب پوش) کا باعث بنی جو کبھی کبھی ان کو دیا جاتا ہے۔ ایک ہزار مجاہد فقراء سے شروع ہو کر ان اخوان نے چند ہی سالوں میں دوسرے حبشی قبائل میں بھی اسلام پھیلا دیا۔
اس طرح چند سال کے اندر وہ شمال مغربی افریقہ اور اسپین کے حکمران بن گئے۔ ان کے واقعات تاریخ اسلام میں ایک اور مثال اس امر کی پیش کرتے ہیں کہ جب مذہبی دعوت کے ساتھ فوجی قوت بھی شریک ہو جائے تو اس کے کیا ثمرات ہوتے ہیں۔" (HISTORY OF ARABS BY P.K. HITI)

ایک جرار لشکر جمع ہوگیا، یہ لوگ بڑے پکے اور مخلص مسلمان تھے اور قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح ان کے سینوں میں بھی بے پناہ جذبۂ جہاد موجزن تھا۔ ابنِ یاسینؒ کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں ان لوگوں میں ایسی باہمی اخوت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اگرچہ ابنِ یاسینؒ نے یحییٰ بن عمر لمتونی کو مرابطین کا امیر مقرر کر دیا تھا۔ لیکن وہ ان کی اجازت اور مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

۴۴۶ھ (۱۰۵۴ء) میں سلجماسہ اور درعہ کے فقہاء نے یحییٰ بن عمر اور ابنِ یاسینؒ کے پاس پیام بھیجا کہ یہاں کے امراء سخت فاسق اور بدعتی ہو گئے ہیں اور مخلوقِ خدا ان کے ظلم و ستم سے عاجز آگئی ہے، خدا کے لیے آپ ہمیں ان سے نجات دلائیں۔ یحییٰ اور ابنِ یاسین نے ان کی دعوت بلا تامّل قبول کر لی اور ایک لشکرِ گراں لے کر سلجماسہ پر یلغار کر دی سلجماسہ کے حکمران مسعود بن وانودن المغراوی نے مجاہدین کی زبردست مزاحمت کی لیکن جوشِ جہاد سے سرشار مجاہدین نے اس کی فوج کے پیچھے اکھاڑ کر رکھ دیئے اور وہ خود بھی لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس طرح وادی الدرعہ اور سلجماسہ پر مرابطین کا قبضہ ہوگیا۔ ابنِ یاسینؒ نے چند دن وہاں قیام کیا اور اس عرصے میں وہاں احکامِ شرع کو مکمل طور پر نافذ کر دیا اس کے بعد انہوں نے اپنے وطن کو معاودت کی۔

۴۴۸ھ (۱۰۵۵ء) میں امیر یحییٰ بن عمر نے وفات پائی تو ابنِ یاسینؒ نے اس کی جگہ اس کے بھائی ابوبکر بن عمر کو مرابطین کا حکمران اور سپہ سالار مقرر کیا۔ وہ ایک پُرجوش مجاہد اور نہایت پرہیزگار آدمی تھا۔ اس نے بیک وقت شمال اور جنوب دونوں طرف اپنی پیشقدمی جاری رکھی اور اپنی فتوحات کے سلسلے کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا گیا۔ اسی سال اسے خبر ملی کہ گھانا میں بت پرستوں نے سخت طوفانِ بدتمیزی برپا کر رکھا ہے اور شمالی گھانا کا وہ علاقہ جس پر کچھ عرصہ پہلے مسلمان قابض ہو گئے تھے، اس پر پھر بت پرستوں کا استیلا ہو گیا ہے۔ ابوبکر طوفانِ برق و باد کی طرح گھانا کی طرف بڑھا اور کئی زوردار معرکوں کے بعد بت پرستوں

کا سر کچل کر گھانا پر پرچم اسلام بلند کر دیا ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خطۂ سوس، تارودنت، اغمات وغیرہ بھی یکے بعد دیگرے فتح کر لیے ۔ یہ ساری فتوحات ابنِ یاسینؒ کی رہنمائی میں ہوئیں ۔ تسخیر و توسیع کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا ۔ جو قبیلے ان کی اطاعت میں آتے وہ ان سے کتاب وسنت کی فرمانبرداری کی اطاعت کا عہد لیتے ۔ اس طرح وہ قبائلِ ملثمین کی ایک ایسی وحدت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کی اساس احیائے دین اور سربلندئ اسلام تھی اب وہ صرف صحرا میں نہیں بلکہ پورے مغرب میں ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتے تھے ۔ مراکشی مؤرخ سعید اعراب لکھتے ہیں کہ :

"مرابطین ابنِ یاسین کا بڑا احترام کرتے تھے اور انہیں ولی کا درجہ دیتے تھے ۔ وہ ان کے فتاویٰ کو حفظ کرتے اور ان پر عمل کرتے ۔ ابنِ یاسینؒ نے ان تمام ظالمانہ محصولوں کو منسوخ کر دیا جن کے ذریعے حاکم اور والی عوام کا خون چوستے تھے، انہوں نے صرف قرآن وسنت کے تجویز کردہ زکوٰۃ اور عشر کے محصول عائد کیے ۔ انہوں نے بیت المال بھی قائم کیا جس کی آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا ۔ بیت المال سے علماء، قاضیوں اور محتاجوں کی بھی مدد کی جاتی تھی ۔

دعوت واصلاح کے ابتدائی دور کے بعد ابنِ یاسینؒ نے مختلف قبائل کے مجاہدین کو ایک باقاعدہ فوج کی صورت میں منظم کر دیا تھا اور اسے ہدایت دے رکھی تھی کہ جس علاقے پر قبضہ کرے وہاں نہایت سختی کے ساتھ احکامِ شریعت کا نفاذ کرے ۔

خود ابنِ یاسینؒ ایک نڈر اور جری مجاہد تھے ان کا معمول تھا کہ جب ان کا لشکر دشمن کے مقابلے کے لیے میدانِ جنگ میں اترتا تو وہ آگے آگے ہوتے اور ان کے پیچھے پیچھے سپہ سالار اور دوسرے امیر ہوتے ۔ اس طرح ہر

معرکے کی قیادت وہ بنفسِ نفیس کرتے، اپنے لشکر کو دادِ شجاعت دیتے اس کا حوصلہ بلند کرتے اور لڑائی کے لیے ابھارتے تھے۔"

۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں ابنِ یاسینؒ نے برغواطہ کی طرف توجہ کی جہاں ایک جھوٹے مدعیٔ نبوت صالح بن طریف کے پیروؤں نے بڑا زور پکڑ لیا تھا اور اپنے مقبوضات بحرِ اقیانوس کے ساحلی علاقوں میں دُور دُور تک وسیع کر لیے تھے۔[1] برغواطہ پر حملے سے ابنِ یاسینؒ

---

[1] صالح بن طریف ایک یہودی الاصل شخص تھا وہ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں اندلس میں پیدا ہوا۔ عہدِ شباب میں مشرق کا رخ کیا اور عبید اللہ معتزلی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ پھر جادو اور شعبدہ بازی میں دستگاہ حاصل کی وہاں سے نہایت عسرت اور ناداری کے عالم میں تامستا پہنچا جو مغربِ اقصیٰ میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ وہاں کے جنگجو بربری باشندے سخت جاہل اور سادہ لوح تھے۔ صالح ایک مکار شخص تھا۔ وہ ان لوگوں میں گھل مل گیا اور ان کی زبان پر عبور حاصل کر کے اپنی شعبدہ بازیوں سے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ۱۲۵ھ میں اس بدبخت نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنا ایک من گھڑت قرآن لوگوں کے سامنے پیش کیا جس میں اسّی سورتیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ تھے، سورہ غرائب الدنیا، سورۂ ہاروت و ماروت، سورہ دیک، سورۂ جمل، سورۂ الاسباط، سورہ ابلیس، سورۂ آدم، سورہ حجر اور سورۂ فرعون ——— ان نام نہاد سورتوں کی زبان نہایت بے ڈھنگی اور مضحکہ خیز تھی۔ وہ اپنے آپ کو مہدیٔ اکبر بھی کہتا تھا اور واریا بھی جس کے معنی بربری زبان میں "خاتم النبیین" کے ہیں۔ اس نے اپنا لقب "صالح المومنین" قرار دیا تھا اور ایک عجیب و غریب شریعت وضع کر کے اپنے پیروؤں میں نافذ کر دی تھی۔ اس شریعت کی رو سے چچا کی بیٹی کے سوا ہر عورت سے نکاح جائز تھا اور بیویوں کی تعداد پر کوئی قید نہ تھی۔ نماز اشاروں سے پڑھی جاتی تھی البتہ آخری رکعت کے اخیر میں پانچ سجدے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا مقصد کوئی علاقہ فتح کرنا نہیں تھا بلکہ وہ صالح بن طریف کے مذہب پر کاربند گمراہ بربریوں کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف زبان سے اپنے فاسد عقائد کی تبلیغ کرتے تھے بلکہ اپنے مخالفوں اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ابن یاسینؒ نے برغواطہ پر حملہ کیا تو ان کے لشکر کی قیادت ابوبکر بن عمر لمتونی اور ان (ابوبکر) کے چچازاد بھائی یوسف بن تاشفین کے ہاتھ میں تھی تاہم وہ معمول کے مطابق ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ برغواطی بربروں نے مرابطی مجاہدین کا جم کر مقابلہ کیا اور قدم قدم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کیے جاتے تھے۔ غسلِ جنابت صرف زنا کے بعد ضروری تھا، نمازوں کی تعداد دس تھی پانچ دن میں اور پانچ رات میں۔ مرغ کا گوشت حرام تھا اور چوری کی سزا موت تھی، ۲۱ محرم کو ہر شخص پر قربانی واجب تھی ــــ غرض اسی قسم کی بے شمار خرافات کا نام اس نے شریعت رکھ دیا تھا۔ اس شخص نے چند سال کے اندر زبردست طاقت حاصل کر لی اور بربریوں کا دینی و دنیاوی فرمانروا بن گیا۔ ۱۷۴ھ / ۷۹۰ء میں وہ اپنے بیٹے الیاس کو اپنا جانشین بنا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ الیاس نے ۲۲۴ھ / ۸۳۹ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد یونس، ابوغفیر محمد بن معاذ ملک، ابوالانصار عبداللہ، ابو منصور عیسٰی اور ابوحفص عبداللہ یکے بعد دیگرے برغواطہ کے حکمران بنے۔ ابوحفص عبداللہ کے عہد میں برغواطہ کے شجرِ اقبال کو گھن لگ گیا اور تاتاریوں اور مسلمانوں نے لگاتار حملے شروع کر دیئے۔ اس طرح برغواطی حکمرانوں کے قصرِ اقتدار میں دراڑیں پڑ گئیں لیکن وہ پوری طرح ختم نہ ہوئے۔ جونہی مجاہدینِ اسلام ان کے علاقے سے واپس جاتے تھے وہ پھر سر نکال لیتے تھے۔ ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں ابنِ یاسینؒ نے پہلی بار ان کا قلع قمع کرنے کی ٹھانی اور اسی مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے برغواطہ پر چڑھائی کی۔

پر اپنی لاشیں بچھا کر ان کی مزاحمت کی۔

۲۴ جمادی الاولی ۴۵۱ھ (۱۰۵۹ء) کو اسی سلسلے کے ایک خونریز معرکے میں ابن یاسینؒ داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ زعیر کے مقام پر ان کی سادہ سی قبر آج بھی موجود ہے۔ ابن یاسینؒ بلاشبہ ان مصلحین امت میں سے ہیں جنہوں نے اپنے علم و عمل اور زہد و تقویٰ کی بدولت لاکھوں بندگان خدا کو صراط مستقیم پر گامزن کر دیا اور ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا مقصود حقیقی اسلام کی سربلندی، کتاب و سنت پر عمل، معاشرے کی اصلاح، مفاسد کا خاتمہ، نیکیوں کی ترویج اور علوم و معارف کی نشر و اشاعت تھا۔ انہیں اگر اپنے دور کا مجدد کہا جائے تو شاید اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔

ابن یاسینؒ کی شہادت کے بعد ابوبکر بن عمرؒ نے ان کے چھوڑے ہوئے کام کو برابر جاری رکھا اور ۴۵۲ھ (۱۰۶۰ء) میں برغواطہ کے بدمذہب بربریوں کو مطیع و منقاد بنا کر چھوڑا، تمام مرابطین نے متفقہ طور پر ابوبکر کو اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا اور وہ ابن یاسینؒ کی تحریک اصلاح کو بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ مغرب کے طول و عرض میں پھیلا رہے تھے۔ برغواطہ کی فتح کے بعد انہیں اطلاع ملی کہ قلعۂ بنو حماد کا سردار بلوگین ایک بڑی فوج کے ساتھ مقابلہ کے لیے آ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ قبیلہ صنہاجہ کے وہ جتھے جو صحرا میں آباد ہیں، آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑنے لگے ہیں۔ ابوبکر نے فوج کی کمان اپنے ابن عم یوسف بن تاشفین کے سپرد کی اور خود صنہاجہ کی بستیوں کا رخ کیا تاکہ ان کے باہمی تنازعات کو ختم کرا دیں۔ ان کے خیال میں یہ جھگڑے مرابطین کی عظیم الشان تحریک اصلاح کو سخت نقصان پہنچا سکتے تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے اپنی زوجہ زینب کو طلاق دے دی جس نے عدت گزارنے کے بعد یوسف بن تاشفین سے نکاح کر لیا۔ یہ خاتون قبیلہ النفرادہ سے تعلق رکھتی تھی

اور نہایت حسین، زیرک اور دانشمند تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو سیاسی اور عسکری معاملات میں بھی بڑی دسترس حاصل تھی چنانچہ یوسف بن تاشفین نے اپنی مہموں میں اس کے مشوروں سے بڑا فائدہ اٹھایا۔

یوسف بن تاشفین نہایت شجاع اور صاحب عزم شخص تھا۔ اس نے امیر ابو بکر بن عمر کی نیابت بڑے شاندار طریقے سے کی۔ مرابطین نے اس کی زیر قیادت اپنی فتوحات کو برابر جاری رکھا، اس طرح چند سال کے اندر اندر مغربِ وسطیٰ واقصیٰ کے وسیع علاقوں پر یوسف بن تاشفینؒ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

۴۵۴ھ (۱۰۶۲ء) میں یوسف بن تاشفین نے موجودہ شہر اغمات کے قریب ایک مضبوط چھاؤنی قائم کی۔ ابتدا میں اس چھاؤنی کے قیام کا مقصد مصمودہ نامی جنگجو بربری قبیلے کو قابو میں رکھنا تھا جو کوہِ اطلس کے دامن میں آباد تھا لیکن جلد ہی یہ چھاؤنی دارالحکومت میں تبدیل ہو گئی، اس شہر کا نام مراکش رکھا گیا جو ۱۳۶۶۷ فٹ بلند جبل تبکال (اطلس کی ایک شاخ) کے دامن میں ۱۰۸۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اس کے سامنے میلوں تک پھیلے ہوئے کھجوروں کے باغات ہیں اور پشت پر برف پوش پہاڑ جو موسم سرما میں مراکش کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں —— سیاح اس شہر کو جنوبی مراکش کا نگینہ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابنِ تاشفین نے شہر مراکش کی نبیاد رکھنے سے پہلے اس کی زمین ان لوگوں سے قیمتاً خریدی جو اس کے اصلی مالک تھے اور ایک انچ زمین پر بھی زبردستی قبضہ نہ کیا۔

مراکش نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی اور بہت جلد وہ ایک عظیم الشان شہر بن گیا جو مدتوں شمالی افریقہ کے حکمرانوں کا دارالخلافہ رہا۔ مراکش کے احداث کے تین سو سال بعد ۷۵۰ھ (۱۳۴۹ء) میں مشہور سیاح ابن بطوطہ اس شہر میں پہنچا تو وہ اس کی عظمت و شوکت سے بڑا متاثر ہوا۔ اس وقت مراکش پر بنو مرین حکمران تھے اور یہ

گیارہویں مرینی حکمران ابوعنان (۷۴۹ھ تا ۷۵۹ھ) (۱۳۴۸ء - ۱۳۵۸ء) کا دورِ حکومت تھا۔
ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں شہر مراکش کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہ شہر بہت خوبصورت اور وسیع ہے۔ وہاں خیرات بہت ہوتی ہے اور بڑی بڑی عالی شان مسجدیں ہیں — کتبیوں کی مسجد بہت بڑی ہے، ایک مینار نہایت عجیب اور بلند ہے اس کی چوٹی سے تمام شہر نیچے نظر آتا ہے۔ اس شہر کی رونق اب کم ہوتی جاتی ہے۔ بغداد سے زیادہ تر مشابہ ہے — مراکش کے شہر میں ایک عجیب مدرسہ ہے جو اپنی وضع اور صنعت میں بے مثال ہے اس مدرسہ کو امیرالمومنین ابوالحسن[1] نے تعمیر کرایا تھا۔"

ابن جزی (سلطان ابوعنان بادشاہِ مراکش کا سیکرٹری) جس نے ابن بطوطہ کے سفرنامے کا خلاصہ مرتب کیا، لکھتا ہے کہ مراکش کے قاضی ابوعبداللہ محمد بن عبدالملک نے اس شہر کی تعریف میں یہ زندۂ جاوید اشعار کہے ہیں۔

للہ مراکش الغراء من بلد — وحبذا اهلها السادات من سکن

خدا مراکش شہر کا بھلا کرے — اس کے باشندوں پر آفرین ہے

ان حلها نازح الاوطان مغترب، — أسلوه بالانس عن اهل وعن وطن

اگر کوئی پردیسی مسافر وہاں آتا ہے تو اس کی اس قدر پذیرائی کرتے ہیں کہ وہ وطن اور رشتہ داروں کو بھول جاتا ہے

بين الحديث بها او العيان لها — ينشا التحاسد بين العين والاذن

اس کے بارے میں کچھ کہتے وقت اور اس کو دیکھنے کے وقت آنکھ اور کان ایک دوسرے کا حسد کرنے لگتے ہیں

امیر یوسف بن تاشفینؒ نے نیا دارالحکومت تعمیر کرنے کے ساتھ نظمِ مملکت پر بھی

---

[1] ابوالحسن علی دسواں مرینی فرمانروا تھا۔ اس نے ۷۳۱ھ (۱۳۳۱ء) سے ۷۴۹ھ (۱۳۴۸ء) تک حکومت کی۔

خاص توجہ دی اور بہت جلد ایک سادہ لیکن مؤثر اور مضبوط نظامِ حکومت قائم کر دیا۔ اس نے مختلف علاقوں کے صوبہ دار مقرر کیے جو بڑے عالم فاضل اور زیرک لوگ تھے۔ وہ تمام انتظامی امور میں امیر کے سامنے جواب دہ تھے۔ اس طرح ایک مضبوط مرکز نے مرابطین کی سلطنت کو زبردست طاقت بخشی اور وہ ترقی اور عروج کے راستے پر گامزن ہو گئی۔

شہر مراکش کی تعمیر کے بعد امیر یوسف بن تاشفین نے آئندہ سات سال (۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء تا ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء) شمالی مراکش کی فتوحات میں گزارے۔ ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں اس نے مراکش کے اہم شمالی شہر فاس (FEZ) پر قبضہ کیا اور اس کے بعد سارے شمالی مراکش کو آہستہ آہستہ اپنے تسلط میں لے آیا۔ شمالی مراکش پر قابض ہوتے ہی مرابطین کا رابطہ ان اندلسی مہاجرین سے قائم ہو گیا جو عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی یلغار اور دباؤ کے باعث اندلس سے ہجرت کر کے مراکش میں آباد ہو رہے تھے۔ اس طرح صحرا نشین مرابطی اندلسی مسلمانوں کے طرزِ معاشرت سے آشنا ہوئے۔ ان اندلسی مہاجرین میں بڑے بڑے علماء و فضلاء، دستکار، تاجر، کاشتکار اور صنعت کار شامل تھے۔ ان لوگوں نے مرابطین پر گہرے اثرات مترتب کیے اور وہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اس دور کی ترقی یافتہ قوموں سے لگا کھانے لگے۔

اسی دوران میں امیر ابوبکر بن عمر نے صنہاجہ کے معاملات سے فارغ ہو کر اپنے وطن کو مراجعت کی۔ مؤرخین نے یہ تصریح نہیں کی کہ وہ شہر مراکش کی تعمیر سے پہلے واپس آئے یا بعد، تاہم قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء کے آس پاس کسی وقت جنوب کی طرف سے لوٹے۔ وطن پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ اُن کے ابنِ عم (یوسف بن تاشفین) نے تمام مفتوحہ علاقوں پر اپنا تسلط مضبوطی کے ساتھ قائم کر رکھا ہے اور ایک اعلیٰ درجے کا نظامِ حکومت بھی قائم کر دیا ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو

برتری حاصل ہے، فوج بھی اس سے خوش ہے اور عوام بھی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ اس صورتِ حال پر وہ بہت مسرور ہوئے۔ انہوں نے اب مرابطین کی عنانِ قیادت اپنے ہاتھ میں لینا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ چنانچہ وہ مراکش کی مملکت یوسف بن تاشفین رح کے مضبوط ہاتھوں میں چھوڑ کر صحرا اور اطرافِ سوڈان کی طرف چلے گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کرلی۔

(کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ان کو کبھی مراکش آنا نصیب نہ ہوا اور ۴۸۰ھ / ۱۰۸۸ء میں انہوں نے سوڈان میں ہی پیکِ اجل کو لبیک کہا۔)

امیر ابوبکر رح کا یہ فیصلہ نہایت صائب اور دور اندیشی پر مبنی ثابت ہوا کیونکہ آئندہ چند برسوں میں امیر یوسف رح بن تاشفین نے دولتِ مرابطین کو کامرانی اور ترقی کی انتہائی بلندیوں سے ہم کنار کردیا۔

امیر المسلمین
یوسف بن تاشفین رح

امیر ابوبکر بن عمرؒ کے مراکش سے رخصت ہونے کے بعد تمام مرابطین نے یوسفؒ بن تاشفین کو بالاتفاق اپنا قائد تسلیم کر لیا اور یوں وہ بلا شرکتِ غیرے بالاستقلال مملکتِ مراکش کا فرمانروا بن گیا۔ فی الحقیقت وہ اس بلند منصب کا حقیقی معنوں میں اہل بھی تھا۔ اگرچہ وہ اس وقت جوانی کی حدود سے گزر کر بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکا تھا اور ساٹھ برس کے پیٹے میں تھا لیکن زہد و تقویٰ کی زندگی گزارنے کے باعث اس کے قویٰ نہایت مضبوط تھے اور وہ بڑی دلکش اور شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا قد میانہ، جسم چھریرا، رنگ گندمی اور چہرے پر ہلکے بال تھے۔ آنکھیں سیاہ اور ناک عقابی تھی، سر کے بال گھنگھریالے اور آواز میں نرمی تھی۔ مبداءِ فیض نے اسے بے مثل اوصاف و محاسن سے نوازا تھا، وہ ایک سچا اور پکا مسلمان تھا اور تحریکِ مرابطین کی تمام مطلوبہ خوبیاں اس کی ذات میں موجود تھیں۔ اس کے اعلیٰ اخلاق اور بلندیٔ کردار کا ہر شخص معترف تھا۔ ایک نڈر جوانمرد، پُرجوش مجاہد اور ماہر جرنیل ہونے کے ساتھ وہ ایک بیحد خدا ترس، پابندِ شرع، متقی، عادل اور کشادہ دست مسلمان تھا، اس کے دَر سے کوئی حاجت مند کبھی نامراد واپس نہ جاتا تھا، وہ خود بھی عالم تھا اور معارف پروری کے ساتھ علماء اور اربابِ کمال کی قدردانی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ اس نے ساری عمر اپنے صحرائی آباؤ اجداد کی سادگی کو کبھی ترک نہ کیا۔ وہ موٹا جھوٹا لباس پہنتا تھا اور روکھی سوکھی

غذا کھاتا تھا۔ حکمران کی حیثیت سے وہ ایک انتہائی بیدار مغز اور قابل فرماں روا تھا۔
یوسف بن تاشفینؒ نے امیر ابوبکر بن عمرؒ کی نیابت میں فتوحات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، خودمختار حکمران بننے کے بعد اس نے اسے اور زیادہ قوت اور مستعدی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ شمالی مراکش کی تسخیر کے بعد اس نے اپنی فتوحات کو وسطِ مغرب اور الجزائر تک پھیلا دیا۔ سنہ ۴۶۷ھ (۱۰۷۵ء) میں طازہ کو مسخر کیا اور سنہ ۴۷۵ھ (۱۰۸۲ء) تک میلیلیہ، تلمسان، اوطان اور الجزیرہ تک کے تمام علاقہ کو زیر کر کے اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔

اندلس کی فریاد

جس زمانے میں امیر یوسف بن تاشفین شمالی افریقہ کے سرکش مقامات کو مطیع بنانے اور اپنی فتوحات کو وسیع کرنے میں مصروف تھا، اندلس کی اسلامی سلطنت کا حال بہت ابتر ہو رہا تھا اور وہاں طوائف الملوکی نے زور باندھ رکھا تھا۔ اندلس کو مسلمانوں نے پہلے پہل سنہ ۹۲ ہجری (۷۱۱ء) میں فتح کیا تھا۔ یہ وہی خطۂ ارض ہے جسے انگریزی میں (IBERIAN PENINSULA) (جزیرہ نمائے آئبیریا) یا سپین و پرتگال کہتے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے مسلمان فاتح طارق بن زیاد تھے جنھیں افریقہ و مغرب کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے اندلس کی مہم کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ سنہ ۹۲ھ (۷۱۱ء) سے سنہ ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) تک اندلس پر ۱۹ ولاۃ نے اپنی مختلف حیثیتوں سے حکومت کی۔ اس دور میں اندلس کا رشتہ مغرب سے برابر قائم رہا۔ فی الحقیقت مغرب و افریقہ کے گورنروں کو اسلامی اندلس پر پورا تفوق حاصل تھا۔ تاہم اندلس کے والیوں کا تقرر کبھی مغرب و افریقہ کے گورنر کرتے تھے اور کبھی انہیں دربارِ دمشق (اموی خلفاء) کی جانب سے نامزد کیا جاتا تھا۔ بہرصورت وہ مغرب اور دمشق دونوں کے ماتحت اور دونوں حکومتوں کے

سامنے جوابدہ ہوتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے داخلی معاملات میں خود مختار تھے۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد جب بغداد میں بنو عباس برسرِاقتدار آئے اور اموی خاندان کے لوگوں کو چن چن کر مار ڈالا تو ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن بن معاویہ (بن ہشام بن عبدالملک بن مروان) کسی طرح جان بچا کر مصر کی طرف بھاگ نکلا اور وہاں سے شمالی افریقہ جا پہنچا۔ کچھ مدت وہاں گمنامی کی حالت میں گزاری آخر کار اندلس پہنچا اور اپنے خاندان کے ہواخواہوں کی مدد سے ۱۳۸ھ/۷۵۶ء میں اندلس کا فرمانروا بن گیا۔ ۱۳۸ھ/۷۵۶ء سے ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء تک اموی خاندان کے چوبیس حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے اندلس پر حکمرانی کی۔ اس دوران میں اس ملک کی کایا پلٹ گئی اور مسلمانانِ اندلس کی درخشاں تہذیب و تمدن نے دنیا کو محوِ حیرت بنا دیا، بدقسمتی سے چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں اندلس کے مسلمان تشتت و افتراق کے ہولناک مرض میں مبتلا ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں بنو امیہ کا آفتابِ اقبال غروب ہو گیا اور ملک میں ہر طرف افراتفری پھیل گئی یہاں تک کہ ملک کے مختلف علاقوں اور شہروں میں بیس کے قریب چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

اشبیلیہ، بطلیوس، طلیطلہ، مریہ، مالقہ، غرناطہ، بلنسیہ، سہلہ، دانیہ، مرسیہ، سرقسطہ، طرطوشہ، ساراگوسا۔

ان سب کے حکمران امیر المومنین کہلاتے تھے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی رہتے تھے۔ تاریخ میں ان حکمرانوں کو "ملوک الطوائف" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ امویوں کے المناک انجام اور ملوک الطوائف کے بارے میں ایک شاعر (ابن الخطیب) کہتا ہے۔

حتی اذا سلک الخلافۃ انتثر   وذھب العین جمیعا والاثر

قام بکل بقعۃ ملیک   فصاح فرق کل غصن دیک

ترجمہ: جب خلافت کا ہار بکھر گیا اور اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ تو ہر علاقے میں ایک بادشاہ کھڑا ہو گیا اور ہر شاخ پر ایک (نیا) مرغ بانگ دینے لگا۔

ایک اور شاعر نے اس صورتِ حال پر یوں نوحہ خوانی کی ہے۔

مما یزھدنی ارض اندلس   اسماء معتصم بہا و معتضد

القاب مملکۃ فی غیر موضعہا   کالھر یحکی انتفاخا صولۃ الاسد

ترجمہ: سرزمینِ اندلس سے جو چیز مجھے بیزار کرتی ہے وہ ہیں وہاں معتصم اور معتضد کے نام۔

بادشاہت کے یہ القاب ایسے ہیں جن کا کوئی محل و موقع نہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بلی پھول کر شیر کے دبدبہ کی نقل کرے۔

بنو امیہ کے زوال کے زمانے میں اندلس کے بعض علاقوں پر عیسائی دوبارہ قابض ہو گئے تھے، ملوک الطوائف کے باہمی مناقشات سے فائدہ اٹھا کر وہ بہت زور پکڑ گئے۔ مسلمان "بادشاہوں" کی بدبختی کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے عیسائیوں سے مدد لینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ مسلمان حکومتوں میں حکومت اشبیلیہ کو اندلس کی تمام ریاستوں میں ممتاز اور نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اس پر بنو عباد حکمران تھے جنہوں نے قرطبہ پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ بنو عباد کا اقتدار تقریباً بیس برس تک ملک کے بڑے حصے پر قائم رہا۔ اس خاندان کا سب سے نامور اور آخری حکمران المعتمد علی اللہ (ابو القاسم محمد بن عباد المعتضد باللہ) تھا۔ وہ ایک بہادر اور فیاض حکمران تھا اور علمی ذوق کے لحاظ سے بھی دوسرے تمام اندلسی حکمرانوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ وہ خود بھی اونچے درجے کا عالم اور نہایت اچھا شاعر تھا اور اہلِ علم اور دوسرے اربابِ کمال کی قدر دانی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔

ان خوبیوں کے ساتھ وہ عیش وعشرت کا دلدادہ بھی تھا۔ تاہم اس نے اپنی بلند ہمتی کی بدولت غرناطہ کی ریاست کے علاوہ سارے جنوبی اندلس پر قبضہ جما لیا تھا۔

اس کی حکومت کے آخری زمانے میں لیون (LEON) اور قشتالہ (CASTILE) کے بادشاہ فرڈی ننڈ اور پھر اس کے بیٹے الفانسو ششم نے بڑی طاقت پکڑ لی اور مسلمانوں کے ہاتھ سے بہت سے مقامات چھین لیے۔ ۴۷۸ھ (۱۰۸۵ء) میں الفانسو نے خاندان ذوالنون کے حکمران یحییٰ قادر بن اسماعیل کو شکست دے کر طلیطلہ پر قبضہ کرلیا اور پھر حکومتِ اشبیلیہ کی حدود میں قدم بڑھایا۔ معتمد نے جب دیکھا کہ الفانسو کی زبردست قوت سے تنہا ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہیں ہے تو اس نے فوراً ایک وفد امیر یوسف بن تاشفین کی خدمت میں مراکش بھیجا اور اس سے عیسائیوں کے مقابلے میں مدد طلب کی۔ یہ خبر اندلس میں مشہور ہوئی تو بعض مسلمان امراء نے جنہیں فرمانروائے مراکش کا اندلس میں آنا سخت ناپسند تھا، معتمد پر زبانِ طعن دراز کی کہ اس نے اپنے ملک میں بربریوں کو کیوں بلایا ہے۔ معتمد نے ان کو جواب دیا کہ مجھ کو خنزیروں کی پاسبانی کے مقابلے میں اونٹوں کی نگہبانی کرنا پسند ہے۔

وفد بھیجنے کے بعد ۴۷۹ھ (۱۰۸۶ء) میں خود معتمد سمندر پار کرکے یوسف بن تاشفین کی خدمت میں پہنچا، اس کو مسلمانانِ اندلس کی حالتِ زار سے آگاہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ فی الفور مسلمانوں کی مدد کے لیے اندلس آئے ورنہ اس سرزمین سے ان کا نام ونشان تک مٹ جائے گا ـــــ یوسف بن تاشفین نے اس کی امداد کی ہامی بھرلی اور کہا۔ "مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ خدمت مجھی سے لے گا"۔

معتمد، امیر یوسف کے حوصلہ افزا ردِعمل سے مطمئن ہوکر اندلس واپس چلا گیا اور عیسائیوں کے مقابلے کی تیاریوں میں مشغول ہوگیا۔

معرکۂ زلاقہ

(۱۴ رجب ۴۷۹ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء)

امیر یوسفؒ بن تاشفین کی عادت تھی کہ تمام اہم امور میں فقہائے سے ضرور مشورہ کرتا تھا چنانچہ معتمد کی واپسی کے بعد اس نے فقہاء سے مہم اندلس کے بارے میں استصواب کیا تو سب نے بالاتفاق رائے دی کہ قشتالہ کے عیسائیوں سے جنگ کرنا امیر کا فرض ہے ـــــ فقہاء کے فتویٰ کے بعد امیر نے تمام ملک میں اعلانِ جہاد کر دیا اور چند دن کے بعد بارہ ہزار پیادہ اور سوار بربری مجاہدین کے ساتھ سو جہازوں کے بیڑے پر اندلس کا رخ کیا[1] کہا جاتا ہے کہ جب جہاز ساحلِ مغرب سے روانہ ہوئے تو ان کو ہولناک طوفانِ باد و باراں نے آلیا۔ سمندر کے تلاطم کی یہ کیفیت تھی کہ کئی کئی سو فٹ اونچی لہریں جہازوں کو گیند کی طرح اچھال دیتی تھیں۔ اس وقت امیر یوسف بن تاشفین نے بارگاہِ رب العزت میں اس طرح دعا کی:

"الٰہی اگر میں بھلائی کا کام کر رہا ہوں اور میرا یہ سفر اسلام کی بہتری کے لیے ہے تو ان طوفانی موجوں کو ساکن کر دے اور اگر میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوں جو اسلام کے لیے ضرر کا موجب ہو تو پھر ان موجوں کے

---

[1] امیر یوسف نے پہلے چند ہراول دستے اندلس کی طرف روانہ کیے اور ان کے بعد خود بڑی فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔

ذریعے اپنی مشیت پوری کر۔"

اس دعا کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے طوفان تھم گیا اور سمندر ساکن ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی نہایت خوشگوار ہوا چلنے لگی جس کا رُخ ساحلِ اندلس کی طرف تھا۔ اس طرح یہ بیڑہ بہت جلد اندلس کے سمندر میں داخل ہوگیا۔ امیر یوسفؒ نے اپنا پہلا کیمپ جزیرۃ الخضرا (ALGECIRAS) میں قائم کیا جو اندلس کے جنوبی ساحل اور آبنائے جبل الطارق کے مغربی کنارے کا ایک اہم مقام تھا۔ یہاں چند دن قیام کے بعد امیر یوسفؒ اپنے لشکر کے بڑے حصے کو ساتھ لے کر اشبیلیہ پہنچا جہاں معتمد نے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ اسی جگہ دوسرے ملوک الطوائف کی فوجیں بھی امیر یوسف کے لشکر میں آشامل ہوئیں اور اسلامی لشکر کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ ادھر الفانسو کو امیر یوسف کی اندلس میں وارد ہونے کی اطلاع ملی تو وہ بھی زور شور سے اس کے مقابلے کی تیاریوں میں مشغول ہوگیا۔ اس زمانے میں اس نے سرقسطہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، اپنی طاقت کو یکجا کرنے کے لیے اس نے یہ محاصرہ اٹھا لیا اور گلیسیا، اشتر دلیش، بسکایہ وغیرہ ہر سمت سے لشکر کو قشتالہ بلا بھیجا، ارجوان اور نافار کے بادشاہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ اس کی مدد کو پہنچ گئے اور مشہور قشتالی شہسوار السِڈ کمپیڈر بھی اپنے جنگجو جتھے کے ساتھ اس کے لشکر میں آشامل ہوا۔ اس طرح الفانسو کے جھنڈے تلے باختلافِ روایت ساٹھ یا اسّی ہزار سے زیادہ آزمودہ کار جنگجو جمع ہوگئے۔ اس جرّار لشکر کو دیکھ کر اس کا دماغ آسمان پر چڑھ گیا اور اس نے بڑے تکبر کے ساتھ کہا:

"اس لشکر کے ساتھ تو میں محمدؐ کے خدا کو بھی شکست دے سکتا ہوں۔"

(نعوذ باللہ)

اس کے بعد الفانسو نے امیر یوسفؒ کو ایک خط بھیجا جس میں اپنی فوجوں اور سامان

حرب کی کثرت کا ذکر کر کے امیر کو دھمکیاں اور گالیاں دی تھیں۔ امیر نے اس خط کی پشت پر صرف یہ جملہ لکھ کر اسے واپس بھیج دیا۔
"جو زندہ بچے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ کیا پیش آیا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ پہلے امیر یوسف ؒ نے الفانسو کو خط بھیجا جس میں اس کو اسلام قبول کرنے یا جزیہ دینے کی دعوت دی اور یہ بھی لکھا کہ "اگر ان میں سے کوئی چیز اس کو قبول نہ ہو تو پھر وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔"

اس کے جواب میں الفانسو نے امیر کی دعوت کو رد کرتے ہوئے لکھا کہ "میرے پاس ایسا زبردست لشکر ہے جو تمہیں تباہ کر دے گا۔"

اس خط و کتابت کے بعد امیر یوسف متحدہ اسلامی لشکر کے ساتھ طلیطلہ کی طرف بڑھا، دوسری طرف سے الفانسو کے ٹڈی دل نے بھی حرکت کی۔ دونوں لشکر مغربی اندلس کے مشہور شہر بطلیوس (BADAJOZ) سے بارہ میل کے فاصلہ پر زلاقہ (ساکری لیاس) کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔

اس زمانہ کا دستور تھا کہ فریقین لڑائی سے پہلے باہمی گفت و شنید سے لڑائی کا دن مقرر کر لیا کرتے تھے چنانچہ الفانسو نے مسلمانوں کو پیغام بھیجا کہ جمعہ تمہارا مبارک دن ہے، ہفتہ یہودیوں کا اور اتوار ہمارا، اس لیے مناسب ہوگا کہ اتوار کے دوسرے دن لڑائی شروع کی جائے۔ امیر یوسف ؒ نے یہ تجویز مان لی لیکن معتمد کو شبہ ہوا کہ الفانسو مسلمانوں سے فریب کرنا چاہتا ہے، چنانچہ اس نے اپنی فوج کو چوکنا کر دیا۔

معتمد کا خدشہ درست ثابت ہوا، دوسرے دن جب مسلمان نمازِ جمعہ میں مشغول تھے، الفانسو نے ان پر حملہ کر دیا معتمد اپنی اندلسی فوج کے ساتھ عیسائیوں کے مقابلے پر ڈٹ گیا اور جب تک امیر یوسف ؒ کی فوج نماز سے فارغ نہ ہو گئی، جم کر لڑتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دن اس کی رانوں کے نیچے تین گھوڑے مرے

اور اس کی زرہ بکتر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ بربری فوج سلام پھیرتے ہی اپنے آزمودہ کار جرنیل داؤد بن عائشہ کی قیادت میں معتمد کی مدد کے لیے پہنچ گئی۔ دوسری طرف شاہ نافار کی فوجیں بھی الفانسو کے لشکر میں آشامل ہوئیں، فریقین میں اس گھمسان کی جنگ ہوئی کہ زمین لرز اٹھی۔ عیسائیوں کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ ایک موقع پر مسلمانوں کے قدم ڈگمگا گئے، اس وقت امیر یوسفؒ نے اپنے جوانمرد بھتیجے سیر بن ابی بکر کو اشارہ کیا، وہ اپنے چیدہ شہسواروں کے ساتھ عیسائی لشکر کے قلب کی طرف بڑھا، دوسری طرف امیر یوسفؒ اپنے منتخب دستوں کے ساتھ چکر کاٹ کر الفانسو کے لشکر کے عقب میں پہنچ گیا اور اس زور کا حملہ کیا کہ عیسائیوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اُدھر سیر بن ابی بکر نے عیسائی فوج کے قلب کو روند ڈالا، الفانسو کی ران میں گہرا زخم آیا اور وہ اپنے تین یا پانچ سو ساتھیوں کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اس کے فرار ہوتے ہی عیسائیوں کی شکست مکمل ہو گئی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کے صرف تین ہزار آدمی شہید یا زخمی ہوئے بخلاف اس کے عیسائیوں کے لاتعداد آدمی مارے گئے۔ مؤرخ ابومروان جو اس لڑائی میں موجود تھا، لکھتا ہے کہ

"میں نے خود چوبیس ہزار مقتولوں کے سر دیکھے"۔

دوسرے عرب مؤرخین عیسائی مقتولوں کی تعداد چالیس ہزار بتاتے ہیں۔

مؤرخ ابن اثیر کا بیان ہے کہ زلاقہ کا میدان عیسائیوں کی لاشوں سے اس طرح اٹ گیا تھا کہ لاشوں کے ڈھیر پر مسلمان کئی دن تک اذان دیتے رہے۔

اس لڑائی میں امیر یوسفؒ اور معتمد نے جس جوانمردی اور ہمت کا مظاہرہ کیا مؤرخین نے اس کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس جنگ کی تاریخ کے بارے میں عرب مؤرخین میں اختلاف ہے بعض ۱۴ رجب ۴۷۹ھ بتاتے ہیں بعض ۲۰ رجب اور کچھ دوسرے ۱۳ رمضان ۴۷۹ھ ——— البتہ عیسائی مؤرخین کا اس

بات پر اتفاق ہے کہ یہ جنگ ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء کے دن لڑی گئی۔

جنگِ زلاقہ کے نتیجے میں اندلس کی سرزمین میں مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے اور انہوں نے ایک نئی زندگی حاصل کر لی جو کسی نہ کسی صورت میں آئندہ چار سو سال تک باقی رہی۔

فتح زلاقہ کے چند دن بعد امیر یوسفؒ اپنے تین ہزار سپاہی اندلس میں چھوڑ کر واپس مراکش چلا گیا۔ جہاں اس کے جوان سال فرزند کا انتقال ہو گیا تھا۔ ادھر اندلس کے رؤسا نے عیسائیوں کی عبرت ناک شکست سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور وہ پھر خانہ جنگی میں مصروف ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیوں نے دوبارہ پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے۔

اندلس پر مرابطین کا استیلا

اندلس کے دردمند مسلمان اپنے خود غرض حکمرانوں کے رویہ سے سخت آزردہ تھے انہوں نے یہاں کے حالات کی اطلاع امیر یوسفؒ کو دی تو وہ اگلے سال ۴۸۱ھ / ۱۰۸۸ء میں دوبارہ اندلس آیا لیکن ملوک الطوائف نے اس کے ورود کا خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی باہمی دشمنیوں اور چپقلشوں کو ختم نہ کیا۔ امیر یوسف کچھ عرصہ اندلس میں قیام کرنے کے واپس مراکش چلا گیا لیکن دو سال بعد ۴۸۳ھ / ۱۰۹۰ء میں اسے تیسری مرتبہ پھر اندلس آنا پڑا کیونکہ عیسائیوں نے جنگِ زلاقہ کا بدلہ لینے کے لیے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اس نے عیسائیوں کو پے درپے شکستیں دیں اور پھر اپنے بھتیجے سیر بن ابی بکر بن تاشفین کو ایک زبردست فوج کے ساتھ اندلس میں چھوڑ کر واپس افریقیہ چلا گیا۔ ادھر ملوک الطوائف کی ذلت و بدبختی اس حد تک بڑھی کہ نہ انہوں نے آپس کی لڑائیوں کو ترک کیا اور نہ اپنی رنگ رلیوں سے باز

آئے۔ یہاں تک کہ اپنی نجات دہندہ بربری فوج کے خلاف بھی ہتھیار اٹھانے سے دریغ نہ کیا۔ امیر یوسفؒ کو ان حالات کا علم ہوا تو اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اس صورتِ حال کے بارے میں اندلس کے علماء و فقہاء سے رائے طلب کی تو انہوں نے بالاتفاق فتویٰ دیا کہ "ملوک الطوائف بڑے فاسق و فاجر ہیں اور اپنے دینی و سیاسی فرائض سے بالکل غافل ہیں، انہوں نے اپنی بُری مثال سے رعایا کو خراب اور دین سے بدراہ کر رکھا ہے، لوگوں پر غیر شرعی محصول عائد کر رکھے ہیں، ان کی دینی بے حمیتی کا یہ عالم ہے کہ مشرکوں سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ یہانتک کہ کھلم کھلا قشتالہ کے عیسائی بادشاہ سے جا ملے ہیں جو دینِ حق کا سخت دشمن ہے پس یہ ملوک الطوائف مسلمانوں پر حکومت کرنے کے ہرگز مستحق نہیں رہے امیر المسلمین یوسف بن تاشفین نے ان سے جو عہد و پیمان کیے تھے، ان کے طرزِ عمل کی وجہ سے وہ خود بخود منسوخ ہو گئے ہیں، امیر المسلمین کا حق ہی نہیں بلکہ فرض ہے کہ ان ملوک الطوائف کو ان کی حکومتوں سے بلا تاخیر معزول کر دے، اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس ملک پر کفار قابض ہو جائیں گے اور امیر کو آخرت میں اس غفلت کا جواب دینا ہو گا۔"

اس فتویٰ کی تصدیق مغرب کے مستند علماء و فقہاء نے بھی کی —— امیر یوسفؒ نے اب ایک ایک کر کے تمام ملوک الطوائف کو معزول کر دیا۔ ان کے تمام مقبوضات اور ریاستوں کا الحاق مرابطی سلطنتِ مراکش سے کر دیا۔ اس طرح اندلس جو پارہ پارہ ہو کر عیسائیوں کے قبضے میں جانے والا تھا مراکش کی طاقتور مسلم حکومت کے قبضے میں آکر محفوظ ہو گیا۔ جن اندلسی رؤساء نے زیادہ سرکشی دکھائی انہیں گرفتار کر کے محبوس کر دیا گیا۔ ان میں فرمانروائے اشبیلیہ معتمد بھی تھا۔ اسے گرفتار کر کے مغرب لایا گیا اور اغمات میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہیں اس نے ۴۸۹ھ / ۱۰۹۵ء میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد امیر یوسفؒ بن تاشفین پندرہ برس تک زندہ

رہا۔ اس عرصے میں اندلس اور مغرب میں مسلمانوں کی قوت و شان انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ امیر یوسف رح نے ۵۰۰ھ ۱۱۰۶ء میں ۳۸ سال کی حکومت کے بعد سو سال کی عمر میں عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی۔ کہا جاتا ہے کہ حجۃ الاسلام امام غزالی رح اس کی معارف پروری کا حال سن کر اس کے پاس آ رہے تھے کہ اسکندریہ کے مقام پر انہیں اس عظیم فرمانروا کی وفات کی خبر ملی اور وہ واپس چلے گئے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ امیر یوسف رح بن تاشفین کی سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع تھا جو بنوامیہ اور بنوعباس کی سلطنتوں کا مل کر ہوتا ہے، ہر جمعہ کو کم از کم تین لاکھ مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور تیرہ بادشاہ اس کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔

امام یافعی رح نے اس کی نسبت لکھا ہے [۱]

کان اکبر ملوک الدنیا فی عصرہ

دنیا کے بادشاہوں میں اپنے عہد کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔

اپنی زبردست قوت، شان اور جلال و جبروت کے باوجود امیر یوسف رح بن تاشفین اپنے آپ کو بغداد کی عباسی خلافت کا نمائندہ سمجھتا تھا اور خلیفۂ بغداد کو اپنا دینی و سیاسی پیشوا تسلیم کرتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خلیفہ مقتدی (۴۶۷ تا ۴۸۷ھ / ۱۰۷۵ء تا ۱۰۹۴ء)

---

[۱] امام ابو محمد یافعی رح کا پورا نام عفیف الدین عبداللہ بن اسعد یمنی ہے، ۶۹۸ھ ۱۲۹۸ء میں یمن میں پیدا ہوئے اور ۷۶۸ھ ۱۳۶۷ء میں وفات پائی۔ اپنے دور کے سرآمد روزگار علماء و صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے عقائد اور تصوف پر متعدد کتابیں لکھیں۔ مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:-

روضۃ الریاحین فی حکایات الصالحین، مراۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، الارشاد، شمس الایمان، نور الیقین، در النظیم فی فضائل القرآن، نشر المحاسن الغالیہ، مرہم العلل فی رد المعتزلہ۔

اور مستظہر (۴۸۷ تا ۵۱۲ھ) دونوں کے درباروں میں سفارتیں بھیج کر سندِ حکمرانی حاصل کی تھی اور اذنِ حکمرانی کے ساتھ امیر المسلمین کا خطاب پایا تھا۔ اس کے جانشینوں نے بھی یہی لقب اختیار کیا اور خلافتِ بغداد سے آزاد ہو کر "امیر المومنین" بننے کا تصور تک بھی کبھی دل میں نہ لائے۔

خلافتِ بغداد کی طرف سے پروانۂ حکومت ملنے کے بعد امیر یوسفؒ نے اپنے نام کا سکہ مضروب کرایا جس کی شکل یہ تھی کہ ایک طرف کلمۂ شہادت کے نیچے امیر المسلمین یوسف بن تاشفین درج تھا اور دائرہ کی صورت میں آیت کریمہ:۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ [1]

تحریر تھی دوسری طرف "عبداللہ احمد امیر المومنین عباسی" کندہ تھا، اور دائرہ میں ٹکسال اور تاریخِ ضرب درج تھی۔

---

[1] ترجمہ:۔ جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہو گا، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

یوسفؒ بن تاشفین کے جانشین

امیر المسلمین یوسفؒ بن تاشفین کی وفات کے بعد اس کا فرزند ابوالحسن علی ۵۰۰ھ (۱۱۰۶ء) میں ۲۳ برس کی عمر میں تختِ حکومت پر بیٹھا۔ وہ اپنے عظیم باپ کا سچا جانشین ثابت ہوا۔ اس نے اندلس جا کر عیسائیوں کو تابڑ توڑ شکستیں دیں اور طلیطلہ، وادی الحجارہ، میڈرڈ (سپین کا موجودہ دارالحکومت) اور کئی دوسرے مقامات فتح کر لیے۔ اس کے چچا زاد بھائی سیر بن ابی بکر نے مغرب میں پرتگال، لزبن باڈاجوز (بطلیوس) اور اپورٹو وغیرہ متعدد مقامات عیسائیوں سے چھین لیے۔ ۵۱۵ھ (۱۱۲۱ء) میں برشلونہ کے بادشاہ ابنِ رومیر نے غرناطہ پر حملہ کیا تو امیر علی بن یوسف کے بھائی تمیم بن یوسف نے اس کو ایسی عبرتناک شکست دی کہ وہ اپنی آدھی فوج کٹوا کر برشلونہ کی طرف بھاگ گیا، چونکہ اس کو حملہ آور ہونے کی ترغیب دینے میں غرناطہ کے نواحی علاقوں کے عیسائیوں کا ہاتھ تھا اس لیے امیر علی بن یوسف نے اندلس پہنچ کر ان مفسدہ پرداز عیسائیوں کو افریقہ کی طرف جلاوطن کر دیا یا اندلس کے دوسرے حصوں میں منتشر کر دیا ۔۔۔ امیر علی بن یوسف کی بلند ہمتی کی بدولت اُس وسیع و عریض سلطنت میں اور بھی اضافہ ہو گیا جو یوسفؒ بن تاشفین نے اپنے پیچھے چھوڑی تھی لیکن اس کی حکومت کے آخری دَور میں سلطنتِ مرابطین میں اضمحلال کے آثار بھی نمودار ہو گئے، اس کے تین بڑے اسباب تھے۔

۱۔ مرابطین میں ایک بھدی قسم کا عقیدۂ تجسیم رائج ہو گیا۔ وہ قرآنِ حکیم کی

آیاتِ متشابہات کا مفہوم لفظاً لینے لگے اور اللہ تعالیٰ کا ایک جسمانی وجود بھی ماننے لگے۔ اس طرح وہ ابنِ یاسینؒ کے پیش کردہ توحیدِ خالص کے عقیدے سے کسی قدر منحرف ہو گئے۔

۲۔ ان میں بعض اخلاقی قباحتیں پیدا ہو گئیں۔ ان کی عورتوں نے پردہ ترک کر دیا، بالخصوص طبقۂ امراء کی عورتیں عین دارالحکومت میں بے پردہ پھرنے لگیں۔ دُور دراز علاقوں کے عُمّال لوگوں پر ظلم ڈھانے لگے یہاں تک کہ وہ لوگوں کے ننگ و ناموس کو بھی برباد کرنے سے نہیں چُوکتے تھے۔

۳۔ مرابطین دین کے معاملے میں سخت تعصّب برتنے لگے۔ انہیں مالکی مذہب کے سوا کسی دوسرے مسلک کا نام سننا بھی گوارا نہ تھا یہاں تک کہ انہوں نے امام غزالیؒ کی تمام تصانیف (بالخصوص احیاء علوم الدین) کو جلا دیا اور ان کا پاس رکھنا یا پڑھنا ممنوع قرار دیا۔

اسی زمانے میں مغرب میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا جو توحیدِ خالص کی علمبردار تھی اور خلافِ شرع رسوم اور بدعات کی سخت دشمن تھی۔ یہ تحریک تاریخ میں "تحریکِ موحّدین" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا بانی ایک اولوالعزم شخص محمد بن تومرت تھا۔ (اس کے مفصل حالات اگلے باب میں درج ہیں) محمد بن تومرت نے حالات کا فائدہ اٹھایا یا اس کی تحریک مرابطین میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا ردِّ عمل تھی، اس کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ بہر صورت موحّدین نے چند سال کے اندر اندر زبردست طاقت پکڑ لی اور بالآخر مرابطین کی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔

امیر علیؒ بن یوسف نے ۵۳۷ھ (۱۱۴۲) میں وفات پائی تو دولتِ مرابطین تیزی سے روبہ زوال ہو گئی۔ امیر علی بن یوسف کے بعد اس کا بیٹا ابوالمعز (ابومحمد) تاشفین

تخت نشین ہوا۔ اس وقت موحّدین بڑا زور پکڑ چکے تھے۔ انہوں نے تاشفین بن علی کو ایک دن بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ اپنے تین سالہ دورِ حکومت میں مراکش کے اندرونی جھگڑوں میں الجھا رہا اور اندلس کی طرف کوئی توجہ نہ کر سکا۔ تاہم اس کا اندلسی دالسہر یحییٰ بن علی بن غانیہ اندلس کے مسلمانوں کو حتّی الوسع عیسائیوں کی چیرہ دستیوں سے بچاتا رہا۔ محمد بن تومرت کے جانشین عبدالمؤمن نے تاشفین بن علی کو کوہ تیطری کے قریب لف الضحاک کی لڑائی میں شکست دے کر دہران کی طرف بھگا دیا۔ وہاں اس نے اپنے امیر البحر محمد بن میمون کے پاس پناہ لی، لیکن موحّدین وہاں بھی جا پہنچے اور اسے شکست دے کر قتل کر دیا یا وہ خود ہی سخت مایوسی اور ناکامی کی حالت میں ۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء میں وفات پا گیا۔ تاشفین کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا لیکن وہ سخت احمق اور نااہل ثابت ہوا اس لیے عمائدِ سلطنت نے اسے معزول کر دیا اور اس کی جگہ اس کے چچا اسحاق بن علی بن یوسف بن تاشفین کو تخت پر بٹھایا لیکن موحّدین نے مراکش فتح کر کے اس کو قتل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ۵۴۱ھ / ۴۷-۱۱۴۶ء میں دولتِ مرابطین کا خاتمہ ہو گیا۔

مرابطین کی حکومت تقریباً اسّی برس تک قائم رہی اور وہ اپنے دورِ عروج میں اندلس اور مغرب کے وسیع و عریض علاقوں پر قابض رہے۔ ان کے بعد موحّدین کا دورِ اقتدار شروع ہو گیا۔

ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن تومرت

المعروف بہ

ابنِ تومرت المہدی المغربی

بانیٔ

دولتِ مؤحّدین

محمد بن تومرت چھٹی صدی ہجری کی ایک حیرت انگیز شخصیت ہے۔ تمام مؤرخین اس کی بے پناہ ذہانت و فطانت اور اولوالعزمی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ نہایت عالم و فاضل، فصیح و بلیغ اور علوم عربیہ کا ماہر، عبادتِ الٰہی میں راغب، نہایت متقی اور حدودِ شرعیہ اور احکامِ الٰہی کی تبلیغ میں نہایت بیباک تھا، اگر وہ مہدویت کے دعویٰ کے الزام میں ملوث نہ ہوتا تو ملتِ اسلامیہ کے جلیل القدر علماء، مجاہدین و مصلحین میں شمار ہوتا۔ اس کی کل متاعِ حیات ایک چھڑی اور ایک چھوٹا سا مشکیزہ تھا لیکن اپنی قوتِ عمل، قوتِ ارادی اور عزمیت و توکل کی بدولت اس نے ایک عظیم الشان سلطنت کی تاسیس کے لیے زمین ہموار کر دی، اس کی شخصیت میں بجلی کا سا جذب اور پہاڑوں کی سی استقامت تھی۔ اپنے ارادے کے سامنے وہ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا اور بادشاہوں تک کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ موت کو ایک کھیل اور دنیا کو بازیچہ گاہ سمجھتا تھا۔ اس کی شخصیت اور کام پر اسرار کی ایسی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہیں کہ اس کی اصلیت اور دعوت کی حقیقی ماہیت کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کا نام و نسب کیا تھا، اس نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی، اس کی جد و جہد کا منتہائے مقصود کیا تھا؟ کیا اس نے فی الواقع مہدی ہونے کا دعویٰ کیا یا یہ اس کے خوش عقیدہ مریدوں کا غلو ہے؟ یہ سب ایسے سوالات ہیں کہ مختلف النوع روایتوں کے انبار سے ان کا صحیح جواب

تلاش کرنا محال ہے تاہم ہر مؤرخ نے اس کے بارے میں خاصی تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف مؤرخین کی تحریروں سے جو معلومات بہم پہنچتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

نام محمد بن عبداللہ (ابنِ تومرت) تھا اور کنیت ابوعبداللہ تھی۔ علامہ ابنِ خلدونؒ کے بیان کے مطابق اس کا اصلی نام امغار تھا جس کے معنی سردار کے ہیں۔ سنہ ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) اور سنہ ۴۸۰ھ (۸۸-۱۰۸۷ء) کے درمیان کسی وقت اور بعض روایات کے مطابق سنہ ۴۸۴ھ (۱۰۹۱ء) میں سوس کے ایک گاؤں ایجلی ان وارغن (یا ورغان) میں پیدا ہوا، اس کے قبیلے کا نام ہرغہ تھا، جو الیسرغنین نام کے ایک بڑے قبیلے کی شاخ تھا۔ (بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قبیلہ الیسرغنین یا امرغنین کوہِ اطلس کے مشہور قبیلے ہنتانہ کی ایک شاخ تھا) عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ الیسرغنین کے معنی المصامدہ کی زبان میں "شرفاء" کے ہوتے تھے اور ابنِ تومرت کا خاندان اپنی شرافت اور دینداری کے لیے ممتاز تھا۔

ابنِ تومرت نے اپنی ایک تحریر میں اپنے آپ کو صحیح النسب سیّد قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسن بن علیؓ سے جا ملتا ہے لیکن بعض مؤرخین کو اس کے اس دعویٰ کی صحت میں کلام ہے اور وہ اس کے بربری النسل ہونے پر زور دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ابنِ تومرت کو بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا اور وہ مسجدوں میں جا کر اس قدر چراغ جلایا کرتا تھا کہ اس کا لقب اَسفیر پڑ گیا تھا۔ سنِ شعور کو پہنچ کر اس نے طلبِ علم کے لیے شام و عراق کا سفر کیا اور عرصہ تک وہاں رہ کر ارضِ مشرق کے کئی متبحر علماء سے قرآن، حدیث، فقہ، اصول اور دوسرے علومِ دینی کی تعلیم حاصل کی۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ مشرق کی طرف

جانے سے پہلے وہ کچھ عرصہ اندلس کی سیر و سیاحت میں بھی مصروف رہا اس کے بعد وہ اسکندریہ (مصر) پہنچ کر امام ابوبکر الطرطوشیؒ کے حلقۂ درس میں شریک رہا۔ پھر حج کیا اور اس کے بعد دمشق اور بغداد جاکر علم حاصل کیا۔ بعض لوگوں نے ابنِ تومرت کو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا شاگرد بتایا ہے اور لکھا ہے کہ جس زمانے میں امام موصوفؒ مدرسۂ نظامیۂ بغداد میں مسندِ درس پر رونق افروز تھے، ابنِ تومرت نے تین برس تک ان سے کسبِ فیض کیا۔ اس سلسلہ میں نامور مصنف مولانا عبدالحلیم شررؔ نے اپنی کتاب "سیرِ رجال" میں یہ عجیب حکایت بیان کی ہے:

"اکثر مؤرخینِ مغرب کا بیان ہے کہ جن دنوں امام غزالیؒ نظامیۂ بغداد میں درس دیتے تھے اور ان کے حلقۂ درس میں اطرافِ عالم کا ایک عجیب مجموعہ مرتب رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک روز وہ بیٹھے درس دے رہے تھے کہ ایک نوعمر بے ریش و بروت طالب علم بغداد کی معمولی وضع کے خلاف ایک سوتی ٹوپی پہنے ہوئے مدرسہ میں آیا۔ امام غزالیؒ نے غور سے اس کی صورت دیکھی اور متحیر ہو کے پوچھا:

"تم کس ملک کے رہنے والے ہو؟"

نوجوان نے کہا۔ "میں ارضِ مغرب کے شہر سوس اقصیٰ کا رہنے والا ہوں۔"

امام غزالیؒ نے حیرت سے کہا۔ "اوہ! تو غالباً تم قرطبہ کے مدرسہ میں بھی رہے ہو گے جو دنیا کے تمام مدارس سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے۔"

طالب علم نے عرض کیا۔ "جی ہاں"

اس کے بعد امام غزالیؒ قرطبہ کے مشہور علماء کے حالات دریافت کرتے گئے اور وہ نوجوان بتاتا گیا۔ اس کے جوابات سے امامؒ نے اندازہ کر لیا کہ بیشک اپنے بیانات میں یہ شخص سچا ہے اور جس سنجیدگی سے اس نے ہر

خیال کو ظاہر کیا اس سے انہوں نے جانا کہ طالب علم ذہین و دانا بھی ہے دریافت کیا، تم نے میری کتاب احیاء العلوم بھی دیکھی ہے؟

نوجوان نے کہا، جی ہاں، میں اس کی زیارت کر چکا ہوں۔

امامؒ نے پوچھا، اچھا بتاؤ اس کی نسبت علمائے قرطبہ کے کیا خیالات ہیں؟

طالب علم نے اس سوال پر سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ امامؒ نے اس کے سکوت کو نہایت حیرت سے دیکھا اور کہا۔ "جو بات ہو تم بے خوف آزادی سے بیان کرو۔"

امامؒ کے مضطربانہ اصرار پر اس نوجوان طالب علم نے کہا:

"اگرچہ اس امر کا عرض کرنا گستاخی ہے مگر آپ اصرار فرماتے ہیں تو بحکم الامر فوق الادب عرض کرتا ہوں کہ آپ کی کتاب پر وہاں کفر والحاد کا الزام لگایا گیا، علمائے قرطبہ نے اس پر خوب غور کرنے کے بعد باہم مشورہ کر کے حکم دیا کہ احیاء العلوم علانیہ جلا دی جائے۔ اس کارروائی کے بعد سبھوں نے بادشاہ علی بن یوسف کو اطلاع دی کہ احیاء العلوم یہاں کثرت سے پھیلتی جاتی ہے اور اس سے مسلمانوں کے عقائد بگڑ جانے کا اندیشہ ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے حکم سے قرطبہ کے بعد مراکش، مدینہ فاس، قیروان اور مغرب کے ان تمام شہروں میں احیاء العلوم علانیہ جلا دی گئی۔"

نوجوان کا یہ بیان سنتے ہی امام غزالیؒ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ فوراً انہوں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے خدا کی درگاہ میں اس توہین کی صلاح دینے والے علماء اور نیز اس بادشاہ کے حق میں جس کے حکم سے ان کی کتاب کی ایسی توہین ہوئی تھی بددعا کی۔

جو لوگ اس موقع پر موجود تھے ان کا بیان ہے کہ بادشاہ علی بن یوسف کے حق میں امام کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے، بارالٰہا! جس طرح اس نے میری کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے برباد کیا ہے اسی طرح اس کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تباہ کر۔ اس کی تمام حکومت اور جو کچھ اسے ورثہ میں ملا ہے، سب اس کے ہاتھ سے چھین لے۔ امام کی اس دعا پر طلبہ کے حلقہ سے آمین کی آواز بلند ہوئی۔ امام غزالیؒ نے ابھی ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ یہ مغربی نوعمر طالب علم آگے بڑھا اور کہا، یا امام اپنی دعا میں اتنا اضافہ اور فرما دیجئے کہ ان باتوں کی تعمیل خاص میرے ہاتھ سے ہو۔

امام نے اپنے ہاتھ دعا میں روک کے کہا:

"اور خداوندا اس دعا کی تکمیل خاص اسی شخص کے ہاتھوں سے ہو۔"

اور طلبہ نے پھر آمین کہی۔ یہ طالب علم محمد بن تومرت تھا جس نے یہاں سے مغرب میں واپس جا کے دعوئ مہدویت کیا۔"

(سیر رجال۔ عبدالحلیم شرر)

علامہ ابن اثیرؒ اور بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابن تومرت کی حجۃ الاسلام امام غزالیؒ سے ملاقات ہی سرے سے ثابت نہیں۔ ہماری رائے میں یہی بات درست ہے اور ملاقات والی روایت کی حیثیت ایک بے بنیاد اور من گھڑت کہانی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے اس تجزیہ کی بنیاد امور ذیل پر ہے:۔

۱۔ امام غزالیؒ نے مدرسہ نظامیہ بغداد میں سنہ ۴۸۴ھ سے سنہ ۴۸۸ھ تک درس دیا۔ ادھر ابن تومرت کا سال پیدائش باختلاف روایت سنہ ۴۸۴ھ یا سنہ ۴۷۰ھ سے سنہ ۴۸۰ھ کے درمیان کا کوئی سال ہے۔ اگر اس کا سال پیدائش

۴۸۵ھ مان لیا جائے تو اس روایت کی ساری بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے اور اگر ۴۷۰ھ سے ۴۸۰ھ کے درمیان کا کوئی سال مانا جائے تو پھر بھی (اس زمانے کے ذرائع آمدورفت کے پیشِ نظر) ابنِ تومرت کا اتنی چھوٹی عمر میں قرطبہ جاکر تحصیلِ علم کرنا اور پھر بغداد جانا قرینِ قیاس نہیں۔

۲- اس روایت میں مراکش اور قرطبہ (اندلس) کے فرمانروا کا نام علی بن یوسف بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں امیر المسلمین یوسفؒ بن تاشفین حکمران تھا، علی بن یوسف باپ کی وفات پر ۵۰۰ھ میں تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اس وقت امام غزالیؒ کو مدرسۂ نظامیہ سے قطعِ تعلق کیے ہوئے بارہ برس گزر چکے تھے اور وہ اپنی زندگی کا آخری دور زہد و انقطاع الی اللہ کی حالت میں گزار رہے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ ابنِ تومرت نے امام غزالیؒ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہو اور وہ اُن کے خیالات سے متاثر بھی ہوا ہو لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی امام موصوفؒ سے ملاقات بھی ہوئی ہو۔ اگر یہ ملاقات ہوئی ہے تو ۵۰۰ھ کے بعد امام غزالیؒ کے زمانۂ تزہد میں ہوئی ہوگی۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کی یہی رائے ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" میں لکھا ہے کہ:

"ابنِ تومرت طلبِ علم کی غرض سے ۵۰۱ھ کے دوران میں مشرق کو گئے تھے، وہاں سے بغداد گئے اور ابوبکر شاشی سے اصولِ فقہ اور اصولِ دین اخذ کیے اور المبارک بن عبدالجبار اور ان جیسے دیگر محدثین سے حدیث پڑھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوحامد غزالیؒ سے ان کے تزہد کے زمانے میں ملے تھے۔"

صورتِ واقعہ خواہ کچھ بھی ہو اس بات پر سب مؤرخین کا اتفاق ہے کہ ابنِ تومرت عنفوانِ شباب میں ہی ایک متبحر عالم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا

علمبردار بن گیا تھا۔ احکامِ الٰہی کی تبلیغ میں اس کو اس قدر غلو تھا کہ سلاطین و امراء سے بھی لڑ جاتا تھا۔ اس کی زندگی انتہائی زاہدانہ اور مطابقِ شریعت تھی، ایک چھڑی اور چھوٹے سے مشکیزے کے سوا وہ کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ اس کی زبان نہایت شیریں تھی اور عربی میں ایسی فصیح و بلیغ تقریریں کرتا تھا کہ لوگ مسحور ہو جاتے تھے لیکن جب وہ کوئی خلافِ شرع کام ہوتے دیکھتا تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور پھر اس کی زبان تیغِ برّاں بن جاتی تھی۔ اُس کی طلاقتِ لسانی اور بے باکی نے حاکمانِ وقت کو اس کا دشمن بنا دیا اور اس کو کئی شہروں میں بے پناہ اذیتیں سہنی پڑیں یہاں تک کہ بعض اوقات اسے اپنی جان بچانے کے لیے دیوانہ (سودائی) بننا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی بے باکی کی بدولت اسے مکہ معظمہ سے نکلنا پڑا۔ یہاں سے وہ مصر پہنچا، کچھ عرصہ قاہرہ میں قیام کیا اور پھر اسکندریہ جا کر زور شور سے تبلیغ شروع کر دی۔ جب اس سلسلہ میں وہاں بھی کئی ناخوشگوار واقعات پیش آئے تو حاکمِ اسکندریہ نے اسے شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ یہاں سے وہ جہاز میں سوار ہوا اور دن رات مسافروں کو وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول ہو گیا۔ جن لوگوں نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرے، ان کو بجبر پابندِ شریعت بنانا چاہا۔ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ اہلِ جہاز اس سے تنگ آ گئے اور انہوں نے ناراض ہو کر ایک دن اسے سمندر میں پھینک دیا، وہ نصف یوم سے زیادہ سمندر میں پڑا رہا مگر اسے کسی طرح کا گزند نہ پہنچا۔ جہاز والوں نے یہ کیفیت دیکھ کر ایک شخص کو پانی میں اتارا جو اس کو جہاز میں لے آیا۔ اس واقعہ سے اہلِ جہاز کے دلوں میں اس کی بہت کچھ عظمت بیٹھ گئی اور وہ سب تلاوتِ قرآن اور نماز کے پابند ہو گئے۔

ابنِ تومرت کے بحری سفر کا اختتام شہر مہدیہ پر ہوا (۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء) وہاں اس نے سرِ راہ ایک مسجد کو اپنا مستقر بنایا اور بڑی سرگرمی کے ساتھ اصلاح و تبلیغ

میں مشغول ہو گیا۔ جس کسی کے پاس کوئی آلۂ موسیقی (ڈھولک ساز طنبورہ وغیرہ) یا شراب کا برتن دیکھتا چھین کر توڑ ڈالتا، چند دن ہی میں سارے شہر میں شور پڑ گیا اور لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لیے آنے لگے جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ ایک اچھا عالمِ دین ہے تو طلبہ بھی جمع ہو گئے اور ابنِ تومرت نے مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس زمانے میں مہدیہ پر زیاری خاندان کے فرمانروا یحییٰ بن تمیم (۵۰۱ھ / ۱۱۰۷ء تا ۵۰۹ھ / ۱۱۱۵ء) کی حکومت تھی۔ وہ اشعری عقائد کا پیرو تھا۔ اس نے جب سنا کہ مہدیہ میں ایک متبحر عالم وارد ہوا ہے جو اصلاح و تبلیغ کے ساتھ اشعری عقائد کی تعلیم بھی دیتا ہے تو اس نے ابنِ تومرت کو اپنے دربار میں بلا بھیجا، وہاں ابنِ تومرت نے ایسی فصیح و بلیغ تقریر کی کہ دربار میں موجود دوسرے فقہاء اور خود بادشاہ بھی دنگ رہ گیا۔ اس نے ابنِ تومرت کی بہت تعظیم و تکریم کی اور اس سے دعا کے لیے درخواست کی۔ ابنِ تومرت نے دعا کی اصلحك الله لرعیتك یعنی "خدا تمہیں رعیت کے حق میں اچھا حاکم بنائے۔"

اس کے بعد وہ اپنے مستقر پر واپس آ گیا۔

علامہ ابنِ خلکان کا بیان ہے کہ جس زمانے میں ابنِ تومرت تحصیلِ علم میں مصروف تھا اتفاق سے اس کو علمِ جفر کی ایک کتاب مل گئی جس کا اس نے بغور مطالعہ کیا۔ جب وہ اس کے قواعد و احکام سے پوری طرح واقف ہو گیا تو علمِ جفر کی رو سے حکم لگایا کہ سوس میں ایک شخص پیدا ہو گا جو خاندان بنو فاطمہ سے ہو گا وہ لوگوں کو حق کی طرف بلائے گا، اس کی مستقل قیام گاہ ایک ایسی جگہ ہو گی جس کے نام میں حروف، ت ی ن م ل ہوں گے۔ اور اس کو ایک ایسے شخص کی رفاقت میسر آئے گی، جس کے نام میں حروف ع ب د م و م ن ہوں گے اور وہ اس کی مدد سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔

اس حکم کی روشنی میں سوس میں پیدا ہونے والے داعیٔ حق کی بشارت کا اطلاق وہ اپنی ذات پر کرتا تھا اور اپنے ہونے والے رفیق کی تلاش میں رہتا تھا۔ جب اس کو مہدیہ کے دورانِ قیام میں اپنا مطلوبہ شخص کہیں نظر نہ آیا تو وہ وہاں سے کوچ کر کے پہلے مونستر (MONDSTIR) اور پھر بجایہ (BOUGIE) پہنچا اور حسبِ معمول منکرات و فواحش پر کڑی تنقید شروع کر دی، وہاں کے عوام اور حکمران اس کی بے رحمانہ تنقید پر برہم ہو گئے اور اسے بجایہ سے بھاگ کر قریب کے ایک گاؤں ملالہ میں قبیلہ بنو ادریاگول کے پاس پناہ لینی پڑی، ایک دن وہ ملالہ کے بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک نوعمر خوش جمال لڑکے پر نظر پڑی، جس کے چہرے پر ذہانت و فطانت اور بلند بختی کے آثار نمایاں تھے۔ ابنِ تومرت کو بے اختیار اس کی طرف کشش ہوئی۔ اس نے نوجوان کو بڑے شیریں لہجے میں سلام کیا اور پوچھا،

"میاں صاحبزادے تمہارا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "عبدالمومن"

یہ نام سنتے ہی ابنِ تومرت چونک پڑا اور اسے اس قدر خوشی ہوئی کہ گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ اس نام میں ع ب د م و م ن سارے حروف موجود تھے اور یہی ابنِ تومرت کا دُرِّ مقصود تھا۔ پھر اس نے نوجوان سے پوچھا:

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

اس نے کہا۔ "کومیہ (یا تاجرۃ) کا۔"

ابنِ تومرت نے دریافت کیا "کہاں کا عزم ہے۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "تحصیلِ علم کی خاطر مشرقی ممالک کو جا رہا ہوں۔"

ابنِ تومرت اس کو تخلیہ میں لے گیا اور کہا کہ تمہیں کسی جگہ جانے کی ضرورت نہیں جو علم تم پڑھنا چاہو، میں تمہیں پڑھا دوں گا، اللہ نے تمہارے مقدر میں علم،

دولت حکومت ہر شئے لکھ رکھی ہے، تم میرے پاس رہو تو ایسے رموز و اسرار تم پر آشکار کر دوں گا کہ تم دین اور دنیا کی دولت کے مالک ہو جاؤ گے ــــــ غرض اس نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ عبدالمؤمن نے سفرِ مشرق کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی تقدیر ابنِ تومرت کے ساتھ وابستہ کر دی۔

علّامہ ابنِ خلّکان کا بیان ہے کہ عبدالمؤمن تلمسان کے نواح میں ساحلِ بحر پر واقع ایک گاؤں تاجرہ میں پیدا ہوا۔ وہ ایک کوزہ گر (کمہار) علی نامی کا بیٹا تھا۔ عہدِ طفلی میں ایک دن عبدالمؤمن محوِ خواب تھا کہ شہد کی مکھیوں کے ایک جھنڈ نے اس کو اس طرح ڈھانپ لیا کہ وہ بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے ماں باپ یہ منظر دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے لیکن مکھیاں کچھ دیر بعد اُڑ گئیں۔ علی نے بچّے کو بیدار کیا تو وہ بالکل خیر و عافیت سے تھا ــــــ علی دوڑا دوڑا اپنے ہمسائے کے پاس گیا جو بہت بڑا عالمِ دین تھا جب اس نے علی سے یہ واقعہ سنا تو اس نے کہا:

> "تمہارا یہ بچہ کسی دن بڑے مرتبے پر پہنچے گا اور اہلِ مغرب اس کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہوں گے۔"

علامہ عبدالواحد مراکشی نے "کتاب المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" میں لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق ابنِ تومرت کی عبدالمؤمن سے پہلی ملاقات بلادِ متیجہ میں فنزارہ کے مقام پر ہوئی جہاں وہ اس گاؤں کے لڑکوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔ فنزارہ کے دورانِ قیام میں ایک دن عبدالمؤمن نے خواب میں دیکھا کہ وہ اور امیرالمسلمین علی بن یوسف بن تاشفین ایک ہی برتن میں کھانا کھا رہے ہیں، کھاتے کھاتے اس نے محسوس کیا کہ اس کا نفس زیادہ کھانے کی طمع کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے وہ برتن علی بن یوسف کے سامنے سے اچک لیا اور اس میں سے اکیلا ہی کھانے لگا۔ خواب سے بیدار ہو کر اس نے وہاں کے ایک عالمِ ابومحمد عبدالمنعم بن عشیر

سے، جو اس کے استاد تھے، اس خواب کی تعبیر دریافت کی، انہوں نے کہا:

"بیٹا عبدالمؤمن یہ خواب ایک ایسے شخص کے حق میں ہے جو امیر المسلمین علی بن یوسف پر دھاوا کر کے ان کے ملک کے کچھ حصے پر ان کا شریک ہو جائے اور بعد میں تمام ملک کو مسخر کر کے اکیلا ہی اس کا مالک ہو جائے۔"

اسی طرح اس کو وہاں اور بھی عجیب عجیب اتفاقات سے سابقہ پڑا جن میں ایسے امور بھی شامل ہیں جن میں الفاظ عین مقدر کے مطابق منہ سے نکلتے ہیں مثلاً یہ کہ الملک العزیز بن منصور صنہاجی، صاحب بجایہ و قلعہ کے امراء میں ایک شخص تھا جس سے بادشاہ موصوف ناراض ہو گئے، وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا اور اسی قریہ میں پہنچا جس میں عبدالمؤمن تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ بھی اس کے ساتھ مل کر لڑکوں کو پڑھانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس شخص کی حالت افلاس تک پہنچ گئی بعد میں خوش قسمتی سے اس کا آقا اس سے راضی ہو گیا، جب اس امر کی خبر اس شخص کو ملی تو وہ بجایہ جا کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا کہ تم اس تمام زمانہ میں کہاں رہے؟

اس شخص نے اپنا قصہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح وہاں کے لڑکوں نے اسے ٹکڑے دے دے کر زندہ رکھا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ ہنس پڑا اور کہا۔ "اچھا وہ گاؤں ہم نے تمہیں دیا۔" پھر حکم دیا کہ اسے سواری، مال، عمدہ لباس اور نوکر چاکر بھی دیئے جائیں۔ وہ شخص وہاں سے اپنے خدم و حشم کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچا تو اہل دیہہ نے اس کا پُرتپاک استقبال کیا۔ لڑکے عبدالمؤمن کے پاس گئے جو اس وقت مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، لڑکوں نے اس سے پوچھا کہ آپ پہچانتے ہیں یہ کون صاحب ہیں جن کی آمد کی خوشی میں لوگ جشن منا رہے ہیں۔

عبدالمؤمن : "نہیں۔"

جب لڑکوں نے اُسے تمام صورتِ حال بتائی تو اس نے کہا :

" اگر اس شخص کی حالت اس حد کو پہنچ سکتی ہے تو کچھ بعید نہیں کہ میں بھی ایک دن امیر المؤمنین ہو جاؤں۔"

غرض جب ابنِ تومرت اور عبدالمؤمن باہم ملے تو دونوں اپنے درخشاں مستقبل کے متعلق پُر امید تھے۔

ملّالہ سے ابنِ تومرت مغرب کی طرف روانہ ہوا اور وان سرلیش (WANSARIS) سے ہوتا ہوا تلمسان پہنچا ، وہاں اس نے شہر کے باہر ایک مسجد میں قیام کیا جس کو "مسجدِ عُبّاد" کہتے تھے۔ تلمسان میں ابنِ تومرت کے زہد و اتقا اور علم و فضل کی شہرت پہلے ہی پہنچ چکی تھی چنانچہ والئ شہر سمیت وہاں کے تمام لوگوں نے اس کی بے حد تعظیم و تکریم کی اور اس کو اپنا مخدوم و مطاع ٹھہرایا۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی قیدی کو چھڑانا چاہتا تو بلا لحاظ اس کے کہ وہ قیدی کس جرم میں ماخوذ ہے، والئ شہر اور قید خانہ کے محافظ اس کے سامنے مطلق دم نہ مارتے اور اس قیدی کو فوراً رہا کر دیتے۔ تلمسان میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ فاس اور مکناسہ گیا جہاں کے لوگوں نے اس کے پند و نصیحت کا جواب مار پیٹ سے دیا۔ بالآخر وہ مراکش پہنچا جو ملک کا دارالحکومت تھا۔ امیر المسلمین ابوالحسن علی بن یوسف بن تاشفین اگرچہ بذاتِ خود ایک نیکدل اور عادل حکمران تھا لیکن ملک کے معاشرے میں بہت سی خرابیوں نے جڑ پکڑ لی تھی اور علماء، امراء اور عوام میں سے اکثر دین سے غافل اور لغویات میں مبتلا تھے۔ ابنِ تومرت نے اپنے معمول کے مطابق شہر کے باہر ایک ویران مسجد میں قیام کیا اور پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ خلافِ شریعت امور پر اعتراض و انکار شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ امیر المسلمین پر بھی کھلم کھلا اعتراضات

کرنے لگا کہ اس نے فواحش و منکرات کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ اسی زمانے میں ایک دفعہ ابنِ تومرت اپنے مریدوں کے ساتھ نمازِ جمعہ کے لیے جامع مسجد گیا، اس کے مرید تو اِدھر اُدھر بیٹھ گئے لیکن وہ خاص اُس جگہ جاکر کھڑا ہو گیا جو بادشاہ کے لیے مخصوص تھی۔ مسجد کے منتظم نے اسے بتایا کہ یہ جگہ امیر المسلمین کے لیے مخصوص ہے تو اس نے کڑک کر کہا:

"اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ۔ مسجدیں صرف اللہ کی ہیں۔"

اس کے بعد اس نے لوگوں کی طرف منہ کر کے وعظ کرنا شروع کر دیا۔ جس میں غیر شرعی امور پر سخت تنقید کی۔ اسی اثناء میں بادشاہ آ گیا لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن ابنِ تومرت جس جگہ کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا، بادشاہ نے اس کی چنداں پروا نہ کی اور دوسری جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ لی۔ جب امام نے سلام پھیرا تو ابنِ تومرت پھر کھڑا ہو گیا اور بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"اے بادشاہ تیرے حکّام مخلوقِ خدا پر ظلم ڈھا رہے ہیں، ان کو روک، ہو سکتا ہے کہ تجھے ان مظالم کا علم نہ ہو لیکن روزِ قیامت تو ان کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکے گا۔"

امیر المسلمین نے ابھی تک ابنِ تومرت کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا، اس نے سمجھا کہ کوئی عالمِ دین ہے اور کچھ حاجت رکھتا ہے چنانچہ مسجد سے جاتے وقت اپنے حکّام سے کہتا گیا کہ اس شخص کا کوئی کام اٹکا ہو تو نکال دو، مفلس ہے تو بیت المال سے مدد دو اور اگر مقروض ہے تو اس کا قرض ادا کر دو۔ ابنِ تومرت کو اس حکم کی اطلاع ملی تو اس نے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ میری کوئی دنیاوی غرض نہیں ہے میں تو اسلام کا ایک ادنیٰ خادم اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہوں۔

اس زمانے میں یورپ کے عیسائیوں سے میل جول کے باعث مراکش میں

بے حجابی عام تھی بالخصوص شاہی خاندان اور طبقۂ امراء کی خواتین اپنی کنیزوں کے ہمراہ بے حجاب گھوڑوں پر سوار پھرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی شراب خواری اور بدکاری بھی زور پکڑ چکی تھی۔ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ عورتوں نے امورِ ملکی پر غلبہ پا لیا تھا اور وہ بڑی سرکش اور آزاد ہو گئی تھیں، اس لیے فواحش شنیعہ نے زور پکڑ لیا تھا حتّٰی کہ ہر ایک بدمعاش، چور اور رہزن کسی نہ کسی عورت کی طرف منسوب کیا جاتا تھا جو اس کی پشت پناہی کرتی تھی۔

ایک دن ابنِ تومرت نے دیکھا کہ بادشاہ کی بہن، جس کا نام بعض مؤرخین نے سورۃ (یا الصورۃ) لکھا ہے، اپنی کنیزوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار بے نقاب پھر رہی ہے۔ ابنِ تومرت کی غیرت بے تاب ہو گئی وہ باز کی طرح اس بے حجاب حسن و جمال کے انبوہ پر جھپٹا اور ڈنڈوں سے وہ خبر لی کہ تزئین و آرائش سے بھرا پُرا چمن اُجاڑ ہو گیا، خود شہزادی کو گھوڑے سے گر کر چوٹیں آئیں۔ یہ خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی اور لوگ ابنِ تومرت کی جرأت اور جذبۂ اصلاح کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو اس نے ابنِ تومرت کو دربار میں بُلا بھیجا اور ساتھ ہی کئی سر برآوردہ مرابطی فقہاء کو بھی طلب کر لیا۔ دربار میں ان فقہاء اور ابنِ تومرت کے مابین بعض علمی مسائل پر زبردست مناظرہ ہوا جس میں ابنِ تومرت نے اپنے پُرزور دلائل سے سب کو لاجواب کر دیا۔ اس کے بعد اس نے پھر بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا:

> "اے بادشاہ! یہ کیسی اسلامی عملداری ہے کہ عورتیں بے حجاب پھرتی ہیں، خنزیروں کے ریوڑ شہروں میں آزادانہ پھرتے ہیں، شراب کھلے بندوں فروخت ہوتی ہے۔ بیواؤں، غریبوں اور یتیموں کی حالت ابتر ہے۔ آخر ایک دن آپ کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اس وقت آپ کیا جواب دیں گے۔"

نیک دل بادشاہ ابنِ تومرت کی دلگداز تقریر سن کر آبدیدہ ہو گیا اور فرطِ ندامت سے سر جھکا لیا۔ پھر اس نے یہ کہہ کر ابنِ تومرت کو رخصت کر دیا کہ انشاء اللہ ہم ان مفاسد کے تدارک کی کوشش کریں گے۔

ابنِ تومرت کے جانے کے بعد فقیہ مالک بن وُہیب نے جو امیر المسلمین کے دربار میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے[1] بادشاہ کو مشورہ دیا کہ "یہ شخص فتنہ انگیز معلوم ہوتا ہے اگر اس کو اپنے خیالات پھیلانے کی کھلی چھٹی دے دی گئی تو کسی دن امیر المسلمین کے خلاف بغاوت بھڑک اٹھے گی اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس شخص کو قتل کر دیا جائے اور اگر یہ بات خلافِ مصلحت ہو تو پھر اسے قید کر دیا جائے۔"

رحم دل اور منصف مزاج بادشاہ نے علامہ مالک کی اس رائے سے اتفاق نہ کیا تاہم اس نے رفعِ شر کے لیے حکم دیا کہ ابنِ تومرت کو شہر بدر کر دیا جائے۔

ابنِ تومرت اور اس کے ساتھی مراکش سے خارج البلد ہو کر اغمات پہنچے۔ وہاں کے ایک سربرآوردہ رئیس اور عالم عبدالحق بن ابراہیم نے ابنِ تومرت کو مشورہ دیا کہ

---

[1] علامہ عبدالواحد مراکشی نے کتاب المعجب میں لکھا ہے کہ علامہ مالک بن وہیب اندلس کے باشندے تھے اور اپنے دَور کے سرآمدِ روزگار علماء میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے بعض اجزاءِ فلسفہ میں زبردست تحقیق کی تھی اور کئی بلند پایہ کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ ان میں سے تین کے نام یہ ہیں :-

۱۔ قراضۃ الذہب فی ذکر لئام عرب۔ اس میں جاہلیت اور اسلام کے زمانہ میں لئامِ عرب کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے تھے۔

۲۔ کتاب الثمرۃ لبطلمیوس فی الاحکام۔

۳۔ کتاب المجسطی فی علم الہیئۃ۔

اغمات میں بھی حکومت کا ہاتھ تم تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم یہاں سے دور دشوار گزار کوہستانی علاقے کو اپنا مستقر بناؤ۔ اس علاقے کا ایک گاؤں اس کام کے لیے نہایت موزوں ہے۔

ابنِ تومرت نے اس گاؤں کا نام پوچھا تو عبدالحق نے بتایا، اس کو تینمل کہتے ہیں۔ ابنِ تومرت یہ نام سن کر بہت خوش ہوا کیونکہ یہی وہ مقام تھا جسے علمِ جفر کی رو سے اس کا مسکن اور مستقر بننا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے رفقاء کے ہمراہ تینمل جاکر مقیم ہو گیا۔ (اس قصبہ کا نام بعض مؤرخین نے تینمال، تینمل یا تینملال بھی لکھا ہے)۔

تینمل میں ابنِ تومرت نے بڑے زور شور سے درس و تدریس، اصلاح و تبلیغ اور دعوت الی الخیر کا کام شروع کر دیا۔ اس کی زندگی بالکل زاہدانہ اور درویشانہ تھی، وہ نہ صرف شریعتِ اسلامی کے تمام احکام پر پورا پورا عمل کرتا بلکہ اپنے ارادتمندوں سے بھی سختی کے ساتھ شریعت کی پابندی کرواتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں تینمل دعوت و ارشاد کا ایک عظیم الشان مرکز بن گیا اور بہت سے لوگ جن میں قبیلہ المصامدہ کے رؤسا بھی شامل تھے، اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ شروع شروع میں ابنِ تومرت کی دعوت صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تک محدود تھی اور اس نے اپنے پیروؤں کو خونریزی سے منع کر رکھا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے سیاست میں بھی دخل دینا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابنِ تومرت نے اپنی دعوت کو مؤثر بنانے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا حامی بنانے کے لیے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اس دعویٰ کے بعد تینمل کے علاقے میں دو گروہ بن گئے۔ ایک نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی لیکن دوسرے نے اس پر یقین نہ کیا۔ ابنِ تومرت نے اپنے مخالفوں کو گمراہ بلکہ کافر اور واجب القتل قرار دیا اور ان کو مطیع کرنے کے لیے ہر ممکن حربے سے کام لیا[1]۔ یہاں تک کہ ہرغہ اور المصامدہ جیسے

---

[1] اس سلسلے میں بعض عجیب روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک مشہور روایت یہ ہے کہ ابنِ تومرت
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طاقتور قبیلوں سمیت تینمل اور اس کے نواحی علاقے کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد ابنِ تومرت کی اطاعت کیش بن گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابنِ تومرت نے تینمل میں ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کر لیا اور اس میں کافی سامانِ حرب وضرب جمع کر لیا۔ اب اس نے لوگوں کو کھلم کھلا مرابطی حکومت کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا چنانچہ تھوڑے ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے رفقاء میں وان شریش (WANSARIS) کا ایک متبحر عالم عبداللہ (یا ابو محشر بشیر) بھی تھا، وہ عربی اور ملکی زبان میں کمال درجے کی مہارت رکھتا تھا۔ اور قرآن مجید اور موطا امام مالکؒ کا حافظ تھا، وہ ابنِ تومرت کی ہدایت کے مطابق سالہا سال تک گونگا بنا رہا اور گنواروں کا سا لباس پہنتا رہا۔ قیامِ تینمل کے دوران میں ایک دن وہ یکایک لباسِ فاخرہ پہن کر نمازِ صبح کے وقت مسجد گیا اور بڑی فصیح وبلیغ زبان میں لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا، کہ کل تک میں گونگا اور جاہل تھا لیکن رات کو ایک فرشتہ مجھ پر نازل ہوا۔ اس نے میرا سینہ چاک کر کے اس کو علم وحکمت سے بھر دیا۔ اب میں ایک عالمِ دین اور قرآن پاک اور موطا کا حافظ ہوں۔"

لوگ یہ کرامت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کا امتحان لیا گیا تو وہ اس میں پورا اترا، ابنِ تومرت نے اب اس سے سوال کیا کہ

"میں سعید ہوں یا شقی ——— اور میرا کیا مقام ہے؟"

عبداللہ نے فوراً جواب دیا۔ "آپ مہدی قائم بامر اللہ ہیں، جو آپ کی اطاعت کرے وہ مومن اور جنتی ہے اور جو مخالفت کرے وہ کافر اور جہنمی ہے۔"

اس واقعہ کے بعد ہزاروں لوگ صدقِ دل سے ابنِ تومرت کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہو گئے جن لوگوں نے مخالفت کی ان کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ اس طرح ابنِ تومرت کے حکم سے قتل ہونے والوں کی تعداد پندرہ ہزار بیان کی گئی ہے۔

عرصے میں تمام علاقے میں حکومت کے خلاف آگ سی لگ گئی۔ اگلے سال ملازمینِ حکومت خراج (یا مالیہ) وصول کرنے تینمل آئے تو لوگوں نے ان سب کو ابنِ تومرت کے اشارے سے قتل کر ڈالا، صرف ایک آدمی کسی طرح جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔[1] اس شخص نے جب مراکش پہنچ کر امیر المسلمین کو شاہی محصلین کے قتل کی اطلاع دی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا کہ مالک بن وہیب کی رائے درست تھی۔ اس نے فوراً دس ہزار سوار اہلِ تینمل کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیئے۔ ادھر ابنِ تومرت نے اپنے پیروؤں کو خوب مسلّح کر کے پہاڑی دروں کے دونوں طرف پہاڑوں پر بٹھا دیا۔ جونہی شاہی فوج ان دروں میں داخل ہوئی ان لوگوں نے اوپر سے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے۔ اس طرح ہزارہا سوار پتھروں کے نیچے کچلے گئے اور باقی سخت بے ترتیبی کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ بحالِ پریشان مراکش پہنچے تو وہاں کہرام مچ گیا۔ تاہم امیر المسلمین نے فیصلہ کیا کہ اہلِ تینمل کو فی الحال ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس فتح سے

---

[1] کہا جاتا ہے کہ ابنِ تومرت نے ایک موقع پر اس علاقے میں بہت سے سرخ و سفید اور گربہ چشم بچوں کو دیکھ کر لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگ تو سانولے ہو لیکن تمہاری اولاد سرخ و سپید ہے اور اس کے خدوخال بھی تم سے نہیں ملتے۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ شاہی ملازمین (جن میں اندلسی باشندوں کی کثیر تعداد ہوتی ہے) ہر سال خراج لینے آتے ہیں تو زبردستی ہمارے گھروں میں شب باش ہوتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

ابنِ تومرت نے یہ سن کر ان کو سخت لعنت ملامت کی اور کہا کہ اس بے غیرتی سے تو مر جانا اچھا ہے۔ اس کی ان باتوں سے لوگ سخت مشتعل ہو گئے اور انہوں نے شاہی ملازمین سے بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

ابنِ تومرت کا حوصلہ بلند ہو گیا اور اس نے اپنی جماعت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے بربری پیروؤں کی تعلیم کے لیے انہی کی زبان میں کئی رسائل لکھے اور اپنے عقیدت مندوں کو کئی طبقوں میں تقسیم کر کے ان کی باقاعدہ تنظیم کی۔ پہلا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو سب سے پہلے اس کے مرید بنے تھے، ان کا نام "الجماعت" رکھا۔ دوسرا طبقہ "الخمسین" کا تھا۔ اسی طرح دوسرے طبقوں کو مختلف نام دیئے تھے۔ ابنِ تومرت ان سب کو مؤمنین یا مُوَحِّدین کہہ کر پکارتا تھا، وہ ان سے بیعت لیتے وقت کہا کرتا تھا:

"میں اسی چیز پر بیعت لیتا ہوں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ سے لی تھی۔"

پھر وہ اپنے پیروؤں سے یہ بھی کہا کرتا تھا کہ:

"آج روئے زمین پر کوئی شخص تم سے بڑھ کر سچا اور ایماندار نہیں۔ تم ہی اہلِ حق کی وہ جماعت ہو جس کی احادیث میں خبر دی گئی ہے۔"

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابنِ تومرت تجرّد اور زہد کی زندگی گزارتا تھا۔ اس کی ایک بہن اس کے پاس آ کر مقیم ہو گئی تھی وہ سوت کاتتی تھی اور اسی کی آمدنی پر دونوں بہن بھائی گزارہ کرتے تھے۔ روٹی کے ساتھ کبھی سرکہ ہوتا اور کبھی روغنِ زیتون۔ ایک دفعہ اس کے پاس کثیر مالِ غنیمت آیا، لوگوں نے اس کی تقسیم کے لیے ابنِ تومرت کو تنگ کیا تو اس نے سارے مالِ غنیمت کو آگ لگا دی اور بآوازِ بلند کہا کہ جو شخص دنیاوی نفع کی غرض سے میری اطاعت کرتا ہے اسے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جانا چاہیئے۔

ابنِ تومرت احکامِ شریعت کے نفاذ میں بڑی سختی سے کام لیتا تھا تاہم حد جاری کرنے میں وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔ اگر کوئی شخص شراب خواری کے جرم میں پکڑا جاتا تو وہ اس کو کھجور کی چھال کی رسی اور جوتوں سے سزا دیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص شراب کے نشے میں مخمور ابنِ تومرت کے سامنے لایا گیا۔ اس نے اسے سزا کا حکم دیا، اس موقع پر ابنِ تومرت کا ایک ذی مرتبہ عقیدتمند یوسف بن سلیمان بھی موجود تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ "اس شخص پر اس وقت تک برابر تشدّد جاری رکھا جائے جب تک وہ یہ نہ بتائے کہ اس نے شراب کہاں سے حاصل کی۔"

ابنِ تومرت نے یوسف کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا، یوسف نے اپنی بات دہرائی تو ابنِ تومرت پھر بھی خاموش رہا لیکن جب اس نے تیسری مرتبہ یہی بات کہی تو ابنِ تومرت چیں بجبیں ہو کر بولا :

" اگر اس نے یہ کہا کہ میں نے یوسف بن سلیمان سے شراب حاصل کی تو پھر؟"۔

یوسف بن سلیمان شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔

جب ابنِ تومرت کی قوت بہت بڑھ گئی تو اس نے ۵۱۷ھ ۱۱۲۳ء میں ایک جرار لشکر عبدالمؤمن کی قیادت میں مراکش پر حملہ کے لیے بھیجا، امیر المسلمین علی بن یوسف کو اطلاع ملی تو اس نے ایک آزمودہ کار فوج اپنے بیٹے زبیر کی قیادت میں عبدالمؤمن کے مقابلے پر بھیجی۔ بحیرہ کے مقام پر دونوں فوجوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ اس میں عبدالمؤمن کو خوفناک شکست ہوئی اور اس کے ساتھیوں کی کثیر تعداد میدانِ جنگ میں کام آئی۔ جب ابنِ تومرت کو خبر ملی کہ اس کا تمام لشکر موت کے گھاٹ اتر گیا ہے تو اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ "کیا عبدالمؤمن بھی لڑائی میں کام آئے"۔ جب اسے بتایا گیا کہ وہ بچ گئے ہیں تو اس نے بے ساختہ کہا۔ "تب تو گویا کوئی بھی ضائع نہیں ہوا۔" جب بچا کھچا لشکر واپس آیا تو ابنِ تومرت نے یہ کہہ کر اس کی ہمت بندھائی کہ لڑائی میں بعض اوقات اہلِ حق کو عارضی طور پر ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے تم بہت جلد فتح حاصل کرو گے۔ تم میں سے جو مارے گئے وہ بلاشبہ شہید ہیں کیونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خاطر شہید ہوئے ہیں۔

اس کے بعد ابنِ تومرت اور حکومتِ مرابطین کے مابین ایک طویل کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ کبھی موحدین فتحیاب ہوتے کبھی شاہی فوج تاہم موحدین کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ سات آٹھ سال کی مدت میں کئی شہروں اور قلعوں پر ان کا استیلا ہو گیا۔

۵۲۴ھ / ۱۱۳۰ء میں ابنِ تومرت کا وقتِ آخر آپہنچا۔ اس نے عبدالمؤمن کو اپنا جانشین اور امامِ صلوٰۃ نامزد کیا، اپنے پیروؤں کو اس کی اطاعت کی وصیت کی اور پھر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابنِ تومرت میانے قد کا گندم گوں، تیز نظر اور بزرگ سر آدمی تھا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، ناک خمدار تھی اور داڑھی میں بہت کم بال تھے۔ وہ ایک انتہائی ذہین اور قابل شخص تھا۔ اس نے اپنے بیت المال کا ایک پیسہ تک کبھی اپنی ذات پر خرچ نہ کیا اور بڑی زاہدانہ زندگی گزاری۔

اربابِ سیر نے ابنِ تومرت کے فضائلِ اخلاق کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، تاہم دعوئے مہدویت اور ہزاروں مسلمانوں کے قتل کرنے کی بناء پر اسے ایک ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا ہے۔

علامہ عبدالواحد مراکشی نے اپنی کتاب "المعجب" میں ایک قصیدہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں جو ابنِ تومرت کے ایک مرید نے اس کی قبر پر کھڑے ہو کر (بعہدِ امیر المومنین ابو یعقوب یوسف بن عبدالمؤمن) پڑھا تھا۔ یہ اشعار پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابنِ تومرت کے مریدوں کو اس سے کس قدر عقیدت تھی اور وہ اس کو کیا سمجھتے تھے۔ یہ اشعار (مع اردو ترجمہ) نیچے درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱) سلامٌ علیٰ قبر الامام الممجد
سلالة خیر العالمین محمدٌ

سلام ہو اس صاحبِ عظمت امام کی قبر پر جو تمام جہانوں کے بہترین فرد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہے۔

(۲) ومشبهه فی خلقه ثم فی اسمه
وفی اسم ابیه والقضاء المسدد

اور اپنے اخلاق، اپنے نام، اپنے باپ کے نام میں اور اپنی قضاء محکم میں اُن سے مشابہ ہے۔

(۳) ومحیی علوم الدین بعد مماتها
ومظهر اسرار الکتاب المسدد

جو علومِ دین کی موت کے بعد ان کو حیاتِ تازہ بخشنے والا اور کتابِ محکم کے بھیدوں کو ظاہر کرنے والا ہے۔

(۴) انبانیه البشری بان یملأ الدنا
بقسط وعدل فی الانام مخلد

ہمیں اس سے یہ خوشخبری ملی ہے کہ وہ خلقِ خدا میں اپنے عدل و انصاف پائندہ سے دنیا کو پُر کر دے گا۔

(۵) ولیفتح الامصار شرقاً ومغرباً
ویملک عُرباً من مغیر ومنجد

وہ مشرق و مغرب میں ہر طرف کے شہروں کو فتح کرے گا اور عرب کے تمام نشیب و فراز کے باشندوں کا مالک ہو گا۔

(۶) فمن وصفه اقنیٰ واجلی وانه
علاماته خمس تبین لمهتدی

وہ کہ جس کی توصیف نہایت صاف اور واضح ہے، اس کی پانچ علامتیں

علامتیں ہیں جو ہر طالب ہدایت کے لیے ظاہر ہیں۔

(۷) زمان و اسم و المکان و نسبة
وفعل له فی عصمة و تاید

زمانہ، نام، مکان، نسب اور اس کا وہ فعل جو گناہ سے مبرا اور تائیدِ الٰہی کا حامل ہے۔

(۸) ویلبث سبعا او فتسعًا یعیشها
کذا جاء فی نص من النقل مسند

احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ وہ امرِ ہدایت پر سات یا نو سال تک قائم رہے گا۔

(۹) فقد عاش تسعًا مثل قول نبیّنا
فذالکم المهدی بالله یهتدی

چنانچہ وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق نو سال تک رہا۔ یہی ہے تمہارا وہ مہدی جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھا

(۱۰) وتتبعه للنصر طائفة الهدی
فاکرم بهم اخوان ذی الصدق احمد

اس کی مدد کے لیے ایک ہدایت یافتہ جماعت اس کا اتباع کرتی ہے۔ یہ اہلِ صدق کس قدر کریم اور قابلِ ستائش ہیں۔

(۱۱) هی الثلة المذکور فی الذکر امرها
وطائفة المهدی بالحق تهتدی

یہی وہ جماعت ہے جس کے امر کا قرآن شریف میں ذکر ہے، یہی ہے مہدی کا وہ گروہ جو حق سے ہدایت کرتا ہے۔

(۱۲) ولیقدمها المنصور والناصر الذی
له النصر حزب اذیروح ویغتدی
اور جس کا امام وہ منصور و ناصر شخص ہے کہ فتح و نصرت صبح و شام
پرا باندھے اس کے جلو میں رہتی ہے۔

(۱۳) ھو المنتقی من قیس عیلان مفخرا
ومن مُرّۃ اھل الجلال الموطّن
از روئے فخر وہ بنو قیس عیلان اور صاحبِ جلال بنو مرّہ میں ایک برگزیدہ
ہستی ہے۔

(۱۴) خلیفۃ مہدی الالٰہ و سیفہ
وَمن قد غدا بالعلم والحلم مرتدی
وہ خدا کے مہدی کا خلیفہ (یا وہ مہدی جو خدا کا خلیفہ) اور اس کی تلوار
ہے اور جس نے علم اور حلم کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔

(۱۵) بہم یقمع اللہ الجبابرۃ الالٰی
یصدون عن حکم من الحق مرشد
اُسی کے ذریعے سے خدا ان جابروں کا قلع قمع کرے گا جو ایک مرشد
برحق کے احکام کی پیروی سے روکتے ہیں۔

(۱۶) ویقطع ایام الجبابرۃ التی
ابادت من الاسلام کل مشید
اور ان جابروں کے زمانے کا خاتمہ کرے گا جنہوں نے اسلام کے ہر
قوی اور محکم امر کو تباہ کر دیا۔

(۱۷) ولیفتتحون الروم فتح غنیمۃ

ویقتسمون المال بالترس عن ید

وہ روم کو غنیمت کے طور پر فتح کرے گا اور اپنے ہاتھوں سے ڈھال بھر بھر کر مال تقسیم کرے گا۔

(۱۸) ولیغدون الدجال یغزونه ضحا
یذیقونه حد الحسام المهند

وہ دجال کے خلاف دن دہاڑے غزوہ کرے گا اور اس کو ہندی شمشیر کی دھار کا مزا چکھائے گا۔

(۱۹) ویقتله بباب لدّ وتنجلی
شکوك امالت قلب من لم یوحد

وہ اسے لُدّ کے دروازے پر قتل کرے گا اور ان غیر موحّد لوگوں کے وہ شکوک مٹ جائیں گے جنہوں نے ان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کر رکھا ہے۔

(۲۰) وینزل عیسی فیهم و امیرهم
امام فیدعوهم لمحراب مسجد

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام ان میں نازل ہوں گے اور ان کا امام انہیں محراب مسجد کی طرف بلائے گا۔

(۲۱) لیصلی بهم ذالك الامیر صلاتهم
بتقدیم عیسٰے المصطفٰے عن تعمد

ان کا وہ امیر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تقدیم کے ساتھ ان کو نماز پڑھائیگا

(۲۲) فیمسح بالکفین منه وجوههم
ویخبرهم حقا بعز محمد

وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے چہروں پر مسح کرے گا اور ان کو حق کے ساتھ شمشیرِ تیز کی خبر دے گا۔

(۲۳) وما ان یزال الامر فیہ وفیھم
الیٰ اخر الدھر الطویل المسرمد

اور یہ امر مسیح علیہ السلام اور مسلمانوں میں آخر دہر تک (تا قیامت) باقی رہے گا۔

(۲۴) فابلغ امیر المؤمنین تحیّۃ
علی النای منی ولودا المناکد

امیر المومنین کو باوجود میری دوری کے میری پختہ رفاقت کا سلام پہنچا دو۔

(۲۵) علیہ سلام اللہ مادر شارق
وما صدر الوراد عن ورد مورد

اللہ کا اس پر سلام ہو، جب تک آفتاب روشن ہے اور جب تک کہ کسی چشمے پر اس کے ڈھونڈنے والے وارد ہوتے ہیں۔

امیرالمؤمنین
عبدالمؤمن بن علی
مُوَحّدین کا پہلا فرمانروا

۵۲۴ھ تا ۵۵۸ھ
۱۱۳۰ء ۱۱۶۳ء

عبدالمؤمن

عبدالمؤمن کا شمار تاریخ عالم کے ان فرمانرواؤں میں ہوتا ہے جو معمولی حیثیت سے اٹھ کر تختِ شاہی پر متمکن ہوئے اور اپنی ترکتازیوں سے بحر و بر کو ہلا ڈالا ۔ فی الحقیقت اس کی زندگی کے نشیب و فراز عجائبِ قدرت سے ہیں ۔ اس نے ساری زندگی میں صرف ایک مرتبہ (بادشاہت سے پہلے ابنِ تومرت کی زندگی میں) میدانِ جنگ میں شکست کھائی ۔ اس کے بعد تا دمِ مرگ اس کو کسی معرکے میں ہزیمت نہیں اٹھانی پڑی ۔ تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کو جو مرتبہ حاصل ہوا وہ ابنِ تومرت کی پُرخلوص اطاعت اور رفاقت کی بدولت نصیب ہوا ۔ وہ ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء میں قبیلہ کومیہ کی ایک شاخ بنو مجبر میں بمقام تاجرا پیدا ہوا جو تلمسان کا ایک نواحی گاؤں تھا ۔ باپ کا نام علی تھا جو ایک غریب کوزہ گر تھا ـــــ عبدالمؤمن بعد میں کہا کرتا تھا کہ وہ عربی النسل ہے اور اس کا سلسلۂ نسب قیس عیلان بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان سے ملتا ہے ۔
اس کے آباؤ اجداد نے قبیلہ کومیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس لحاظ سے کومی لوگ اس کے اخوال ہیں ۔ عبدالمؤمن کو بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا ۔ عنفوانِ شباب میں وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے مشرق کی طرف روانہ ہوا، اثنائے سفر میں ملالہ نامی گاؤں میں حسنِ اتفاق سے اس کی ملاقات ابنِ تومرت سے ہو گئی جس نے اسے اپنا خلوت و جلوت کا ساتھی بنا لیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کی ۔ یہ ابنِ تومرت کی خصوصی توجہ ہی کا نتیجہ تھا کہ عبدالمؤمن

دینی اور دنیاوی علوم کا زبردست عالم بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کو فنونِ جنگ، سیاست اور حکمت داری میں بھی مہارتِ تامہ حاصل ہو گئی۔ اس کا ابنِ تومرت سے کوئی خونی رشتہ نہ تھا لیکن اپنی وفا شعاری، اطاعت کیشی اور اخلاص کی بدولت وہ اس کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا اور ابنِ تومرت اس کو اپنے سب مریدوں سے بڑھ کر عزیز جانتا تھا وہ اس کو دیکھ کر اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

تکاملت فیك اخلاق خصصت بها
فکلنا بك مسرور و مغتبط
فالسن ضاحکة والکف مانحة
والصدر منشرح والوجه منبسط

(یعنی تجھ میں تمام اخلاق جو تیرے لیے ہی مخصوص ہیں پایۂ کمال کو پہنچ گئے ہیں اور ہم تجھ سے خوش ہیں اور تجھ پر رشک کرتے ہیں، تیرے دانت خنداں ہیں، تیرے ہاتھ سخی ہیں، سینہ چوڑا اور چہرہ شگفتہ ہے)

ابنِ تومرت کی نظروں میں عبدالمؤمن کی جو وقعت تھی تمام موحدین اس سے بخوبی آگاہ ہو گئے تھے چنانچہ ابنِ تومرت نے اپنی موت سے پہلے عبدالمؤمن کو اپنا جانشین اور خلیفہ نامزد کیا تو سب موحدین نے اس کو بلا چون وچرا اپنا قائد تسلیم کر لیا اور جان و دل سے اس کی اطاعت اور حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔

ابنِ تومرت اپنی زندگی میں مراکش پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن تینمل کے کوہستانی علاقے کے علاوہ اس نے کئی شہر اور قلعے فتح کر لیے تھے اور ان میں شرعی حکومت قائم کر دی تھی۔ چنانچہ جب وہ فوت ہوا تو ایک وسیع علاقے پر موحدین کا استیلا تھا تاہم امیر المسلمین علی بن یوسف مرابطی کی حکومت مغرب اور اندلس کے بیشتر علاقوں پر بدستور قائم تھی۔ عبدالمؤمن نے ۵۲۴ھ (۱۱۳۰ء) میں تختِ حکومت

پر بیٹھ کر ابنِ تومرت کا دیا ہوا لقب امیر المؤمنین اختیار کیا، اس نے مرابطی حکمرانوں کے برعکس عباسی خلیفۂ بغداد کی روحانی سیادت اور پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو خلیفہ قرار دیا اور خلفائے راشدین کے نقشِ قدم پر چلنے کے عزم کا اظہار کیا۔ پہلے کچھ مدت وہ فوج اور ہتھیاروں کی فراہمی میں مصروف رہا۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اس نے دولتِ مرابطین کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا اور چند سال کے اندر ہزاروں مربع میل علاقہ مرابطی حکومت سے چھین لیا تاہم جب تک امیر المسلمین علی بن یوسف زندہ رہا اس نے عبدالمؤمن کو مراکش پر قابض نہ ہونے دیا اور کسی نہ کسی ڈھب سے موحدین کا مقابلہ کرتا رہا۔ ۵۳۷ھ (۱۱۴۳ء) میں علی بن یوسف نے وفات پائی تو اس کے جانشین اس کی چھوڑی ہوئی وسیع و عریض سلطنت کو سنبھال نہ سکے کیونکہ عبدالمؤمن ان سے کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے دو سال کی مدت میں مرابطیوں کے کئی اہم شہر، اوران، فاس، سبتہ، تلمسان، اغمات اور سالی (سالہ) وغیرہ فتح کر لیے اور پھر ۵۴۱ھ (۱۱۴۷ء) میں خاص دارالحکومت مراکش پر قبضہ کر کے مرابطی فرمانروا اسحاق بن علی بن یوسف کا چراغِ حیات گل کر دیا جس کے ساتھ ہی دولت مرابطین کا خاتمہ ہو گیا اور عبدالمؤمن بلا شرکتِ غیرے مملکتِ مراکش کا حکمران بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مرابطین اور موحدین کی باہمی لڑائیوں میں کم از کم ایک لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔

اندلس کی تسخیر

جس زمانے میں مرابطین اور موحدین شمالی افریقہ میں ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے، اندلس میں عیسائیوں نے بڑی طاقت پکڑ لی۔ انہوں نے اندلس کے اسلامی علاقوں کو روند ڈالا اور مسلمانوں پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے۔ جسٹس سید امیر علی مرحوم اپنی کتاب "مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب" میں لکھتے ہیں:۔

> "الفانسو ہشتم، الفانسو ششم کے پوتے نے شہنشاہ کا لقب اختیار کر کے قرطبہ، سیول اور کارمون تک قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ مکیرس کو تاخت و تاراج کر کے آگ لگا دی اور وادیٔ عاش تک شورِ محشر برپا کر دیا، پانچ سال بعد اس نے جین، بیزہ، عبیدہ اور اندوجار کے سرسبز علاقوں کو ویران کیا، آخر اندلس کے مسلمانوں نے پھر اپنے آبنائے پار کے بھائیوں سے مدد کی التجا کی۔"

عبدالمومن کو اندلس کے حالات کا علم ہوا تو اس نے فوراً اپنے ایک آزمودہ کار سردار ابوعمرو (یا ابوعمران) موسیٰ بن سعید کی قیادت میں تیس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ایک جنگی بیڑا اندلس روانہ کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے جزیرہ طریف پر قبضہ کیا اور پھر زبردست یلغار کر کے قرطبہ، اشبیلیہ، قرمونہ، غرناطہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد عبدالمومن نے اپنے بیٹے ابوسعید کو بھی ایک مضبوط لشکر دے کر اندلس روانہ کیا۔ اس نے المیریا بطلیوس اور کچھ دوسرے مقامات فتح کر لیے۔

۵۴۸ھ / ۱۱۵۴ء میں عبدالمومن خود آبنائے جبل الطارق کو عبور کرکے اندلس پہنچا، اندلس کے تمام مسلمان امراء اور سربرآوردہ لوگوں نے اس کی اطاعت کا اقرار کیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی ـــــ اب عبدالمومن نے عیسائیوں پر پے بہ پے ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں دبک کر رہ گئے طلیطلہ کے فرمانروا الفانسو نے بری طرح شکست کھائی۔ اس طرح پانچ سال کے اندر اندر سارا اسلامی اندلس عبدالمومن کے عَلَمِ اقبال تلے آگیا۔ اندلس اور مراکش کی تسخیر کے بعد عبدالمومن نے اپنی عنانِ توجہ مشرقی مہمات کی جانب پھیر دی، بَری فوج کی قیادت یحییٰ بن عبدالعزیز کے سپرد کی اور دو زبردست جنگی بیڑے اس کے حوالے کیے اس سے پہلے ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء میں وہ بنو حمّاد کو تخت و تاج سے محروم کرکے الجزائر پر قابض و متصرف ہوچکا تھا۔ اسی سال اس نے بجایہ کو صقلیہ کے نارمن حکمرانوں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ ۵۵۳ھ / ۱۱۵۸ء میں اس نے تیونس سے نارمن غاصبوں کو نکال باہر کیا جنہوں نے صنہاجی (زیاری) خاندان سے حکومت چھینی تھی[1] اس کے بعد طرابلس الغرب کو مسخر کیا لیکن زویلہ، سوسہ، اور مہدیہ جیسے اہم مقامات پر نارمنوں

---

[1] نارمنوں نے ۴۸۴ھ / ۱۰۹۰ء میں سسلی (صقلیہ) پر قبضہ کیا تھا جس پر مسلمانوں کے جاہ و جلال کا عَلَم تین سو سال تک لہراتا رہا تھا اور بالآخر وہ اپنے باہمی افتراق اور خانہ جنگی کی وجہ سے نارمنوں سے مات کھا گئے تھے۔ سسلی پر قابض ہونے کے بعد نارمنوں نے اپنے دندانِ آز شمالی افریقہ پر تیز کرنے شروع کر دیئے اور اپنی حکمتِ عملی کے بل پر آہستہ آہستہ شمالی افریقہ (بہ استثنائے مراکش) کے مختلف مقامات پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ۵۳۹ھ / ۱۱۴۴ء میں انہوں نے برشک، سفاقس اور بجایہ پر قبضہ کیا، ۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء میں طرابلس پر، ۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء میں قابس پر اور ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء میں مہدیہ پر مسیحی عَلَم نصب کرکے دولتِ صنہاجیہ کا خاتمہ کر دیا اور اپنی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے بدستور اپنا قبضہ برقرار رکھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) طرف سے مختلف علاقوں پر ولاۃ مقرر کر دیئے جن میں سے بعض مسلمان بھی تھے۔ یہ لوگ بظاہر تو صقلیہ کی نارمن حکومت کی اطاعت کا دم بھرتے تھے لیکن بباطن اپنی محکومانہ زندگی پر سخت پیچ و تاب کھاتے رہتے تھے۔ عبدالمؤمن کے عروج اور فاتحانہ پیشقدمی نے ان لوگوں کو ولولۂ تازہ عطا کیا اور انہوں نے جابجا نارمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے، مؤرخین نے اس سلسلہ میں والیٔ سفاقس عمر کے والد حسینؒ کی قربانی کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ عمر بن حسین کو نارمنوں نے سفاقس کا امیر مقرر کیا تھا اور اس کی اطاعت کی ضمانت میں اس کے والد حسین کو صقلیہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ حسین ایک غیرت مند مسلمان تھا اس نے اپنے فرزند کو خفیہ پیغام بھیجا کہ میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، آج نہیں تو کل مر جاؤں گا، تمہیں جب بھی موقع ملے نارمنوں کی غلامی کا جُوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکو اور میری زندگی کی کچھ پروا نہ کرو۔

۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء میں عمر بن حسین نے نارمنوں کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا۔ پہلے نارمن غارت گروں کو چن چن کر ختم کیا اور پھر سفاقس کے قلعہ پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔ نارمن حکمران کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو اس نے ایک نہایت سخت خط عمر کو بھیجا، عمر نے نارمن قاصد کو سفاقس میں روک لیا اور چند دن بعد اس کے سامنے ایک جنازہ اس شان سے اٹھایا کہ سفاقس کے تمام باشندے اس میں شریک تھے۔ یہ جنازہ دفن کرنے کے بعد عمر نے نارمن ایلچی کو دربار میں بلا کر یہ پیغام دیا۔

"میں نے سفاقس کی آزادی پر اپنے باپ کو قربان کر دیا ہے۔ شاہِ صقلیہ کو بتا دو کہ میرا باپ خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اسے سپردِ خاک کر دیا، اب ہم لوگ اس کی عزاداری کر رہے ہیں"۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ایلچی نے واپس جاکر سارے حالات شاہِ صقلیہ کے گوشگزار کیے تو اس نے جوشِ غضب میں حسینؒ کو پھانسی دینے کا حکم دیا۔ مجاہدِ ملت حسینؒ ہنسی خوشی تختۂ دار پر چڑھ گیا اور اپنا خون دے کر شمالی افریقہ میں نارمن اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس کی شہادت نے شمالی افریقہ کے مسلمانوں کو شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ عمر نے سفاقس سے نارمنوں کا آخری نشان تک مٹا دیا۔ ابو یحییٰ بن مطروح نے طرابلس الغرب میں آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا اور نارمنوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ قابس میں محمد بن رشید نے علمِ بغاوت بلند کیا اور نارمنوں کو کچل کر رکھ دیا۔ چند ماہ بعد عبدالمومن نے بجایہ اور بونہ پر یلغار کی اور وہاں سے نارمنوں کے شجرِ اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

زویلہ اور مہدیہ وغیرہ کی فتح

جب شمالی افریقہ کے متعدد مقامات یکے بعد دیگرے نارمنوں سے چھن گئے تو زویلہ کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا اور انہوں نے نارمنوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی، بدقسمتی سے حالات نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ نارمنوں سے شکست کھا گئے۔ نارمنوں نے مسلمانوں سے اس بغاوت کا خوفناک انتقام لیا اور ان کے ہزاروں مردوں عورتوں اور بچوں کو بڑی سفاکی سے ذبح کر ڈالا، چند مسلمان بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا کر عبدالمؤمن کے پاس پہنچے، انہوں نے جب اس کے سامنے زویلہ کے مسلمانوں کی مظلومی اور بے کسی کی داستان بیان کی تو وہ آبدیدہ ہو گیا اور مسلمانانِ زویلہ کا بدلہ لینے کے لیے اعلانِ جہاد کر دیا۔ اس وقت مہدیہ نارمنوں کی قوت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ صفر ۵۵۴ھ / ۱۱۵۹ء میں عبدالمؤمن نے ایک لاکھ مجاہدین کے ساتھ مہدیہ کا رُخ کیا پہلے اس نے زویلہ کو مسخر کیا اس کے بعد آگے بڑھ کر سمندر اور خشکی دونوں طرف سے مہدیہ کا محاصرہ کر لیا، اثنائے محاصرہ میں سفاقس، طرابلس، جبال نفوسہ، قابس، اور قفصہ بھی اس کے زیرِ اطاعت آ گئے، اواخر ماہ شعبان میں صقلیہ سے ۱۵۰ جہازوں پر مشتمل نارمنوں کا ایک جنگی بیڑا مہدیہ کے محصورین کی امداد کے لیے پہنچا لیکن عبدالمؤمن کے جنگی بیڑے نے اس کو شکست فاش دے کر بھگا دیا۔ محصورین نے ناامید ہو کر عبدالمؤمن سے امان کی التجا کی، اس نے انہیں اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے قبول نہ

کی اور جان بخشی کی التجائیں کرتے رہے۔ آخر عبدالمؤمن کو ان پر رحم آگیا اس نے ان کو امان دے دی لیکن شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ نارمنوں نے اسی کو غنیمت جانا اور بہت سی کشتیوں میں سوار ہو کر مہدیہ سے روانہ ہو گئے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اثنائے سفر میں ان کشتیوں کو طوفانِ باد نے آلیا اور وہ سب سمندر میں غرق ہو گئیں۔ مسافروں میں سے بہت ہی تھوڑے لوگ زندہ بچے، باقی سب کشتیوں کے ساتھ غرقِ آب ہو گئے۔ محرم ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء میں عبدالمؤمن فاتحانہ مہدیہ میں داخل ہوا اور نارمنوں کے جھنڈے کی جگہ اس پر پرچم اسلام لہرا دیا۔ اس کے بعد اس نے حسن بن علی صنہاجی کو جو اب تک آوارۂ وطن پھر رہا تھا، مہدیہ کا والی مقرر کیا اور محمد بن فرج الکومی کو اس کا معاون بنایا۔ اس طرح وہ تمام شمالی افریقہ کو نارمنوں کے وجودِ نامسعود سے پاک کر کے مغرب (مراکش) کو واپس چلا گیا۔

یہ عبدالمؤمن کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور مصر سے لے کر تمام سواحلِ اٹلانٹک اور موری سپین (اندلس) پر اس کے اقتدار کا پھریرا اڑ رہا تھا۔

وفات

مہدیہ کی تسخیر کے بعد ۵۵۷ھ / ۱۱۶۲ء میں اندلس کے دو مسلمان سرداروں ابراہیم اور مردنیش نے عبدالمؤمن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور غرناطہ پر قبضہ کرلیا۔ عبدالمؤمن نے ایک جرّار لشکر اپنے بیٹے ابولیعقوب یوسف کی قیادت میں اپنے دوسرے فرزند ابوسعید والیٔ اندلس کی مدد کے لیے روانہ کیا، ایک خونریز لڑائی کے بعد اس فوج نے باغیوں کو کچل دیا۔

اب عبدالمؤمن ہر طرف سے مطمئن ہوگیا اور اس نے ارادہ کیا کہ اندلس کی شمالی عیسائی ریاستوں کی تسخیر کرنے کے بعد تمام یورپ پر پرچمِ اسلام بلند کردے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے پانچ لاکھ مجاہدین جمع بھی کرلیے لیکن ع

تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

۵۵۸ھ / ۱۱۶۳ء میں اسے پیامِ اجل آ پہنچا اور اسی سال ۲۷ جمادی الآخر کو جمعہ کے دن یہ عظیم الشان فرمانروا اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ مسلمان مؤرخین کی رائے ہے کہ اگر عبدالمؤمن کی زندگی وفا کرتی تو کوئی چیز اس کو اپنا ارادہ پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

اوصاف وخصائل

عبدالمؤمن نہایت عالم وفاضل شخص تھا اور ابن تومرت کی خصوصی توجہ اور تربیت کی بدولت اس کو مختلف علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل ہوگئی تھی وہ اہلِ علم وہنر کی قدر افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے دربار میں اہلِ کمال کی کثیر تعداد جمع ہوگئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شاعر طویل قصیدہ لکھ کر اس کے پاس آیا اور اس کا آغاز اس شعر سے کیا

مَامِنْ خَلِيفَةٍ بَيْنَ الْبِيْضِ وَالْاَسَلِ
مِثْلُ الْخَلِيفَةِ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ بْنِ عَلِيّ

(کسی خلیفہ کے مونڈھے تلوار اور نیزہ کے درمیان نہیں ہیں جیسے کہ خلیفہ عبدالمؤمن بن علی کے)

ابھی اس نے مطلع کا یہ شعر ہی پڑھا تھا کہ عبدالمؤمن نے کہا، بس آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں اور حکم دیا کہ اس شاعر کو دس ہزار دینار انعام دیا جائے۔

عبدالمؤمن کو مبداء فیض نے شجاعت، بے خوفی، ذہانت، تدبر، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کے اوصاف سے بھی نوازا تھا، دشمن کے مقابلہ پر وہ ہمیشہ اگلی صف میں ہوا کرتا تھا، بخت اس کا ایسا یاور تھا کہ اپنی زندگی میں اس نے بیسیوں لڑائیاں لڑیں لیکن صرف ایک لڑائی کے سوا سب میں فتحیاب رہا۔ اس نے ہمیشہ سخت کوشی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور اپنے آپ کو ہمیشہ عیش وعشرت اور لہو ولعب سے دور رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی حکومت کو خلافتِ راشدہ کے انداز پر ڈھالنے کی کوشش کی اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے عدل و انصاف کا برتاؤ کیا۔ وہ امورِ ملکی اور سیاست میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتا تھا، اس نے اپنے دورِ حکومت میں تمام بلادِ مغرب اور افریقیہ کی مساحت کرائی اور اس کے مطابق مالیہ وغیرہ کی رقم مقرر کی۔ اس نے اپنی برّی اور بحری فوج نہایت اعلیٰ پیمانے پر مرتّب کی اور حلق الوادی، طنجہ، سبتہ، بادلیس، اور مہدیہ وغیرہ کی بندرگاہوں میں چار سو جہاز تیار کروائے۔ اس کے علاوہ گھوڑوں کے مہیا کرنے کا خاص انتظام کیا اور سامانِ حرب و ضرب کی تیاری پر بھی خاص توجہ دی۔ وہ ایک دردمند اور غیور مسلمان تھا اور اس کے دل میں جذبۂ جہاد ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ سید امیر علی "مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب" میں عبدالمؤمن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ ایک خوب صورت آدمی تھا۔ آنکھیں بھوری نیلی تھیں، بارعب، وجیہ، بہادر، دانا، مستعد اور عالموں کا قدردان تھا، اس کے عہدِ حکومت میں ساری سلطنت بالخصوص ہسپانیہ میں علم و ہنر کو بڑی ترقی ہوئی۔ اس نے مراکش میں کئی سکول اور کالج جاری کیے اور ۳۲ سال کی عظیم الشان حکومت کے بعد ۱۱۶۳ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔"

عبدالمؤمن کی اولاد

عبدالمؤمن کی اولاد میں سولہ لڑکے تھے نام یہ ہیں:

(۱) محمد (۲) علی (۳) عمر (۴) یوسف (ابویعقوب) (۵) عثمان (۶) سلیمان (۷) یحییٰ (۸) اسماعیل (۹) حسن (۱۰) حسین (۱۱) عبداللہ (۱۲) عبدالرحمٰن (۱۳) عیسیٰ (۱۴) موسیٰ (۱۵) ابراہیم (۱۶) یعقوب۔

وزراء

عبدالمؤمن کے آغاز حکومت سے اس کی وفات تک جو لوگ یکے بعد دیگرے عہدۂ وزارت (عظمیٰ) پر فائز ہوئے ان کے نام یہ ہیں :

۱۔ ابوحفص عمر ازناج

۲۔ ابوجعفر احمد بن عطیہ ـــــ یہ وزیر بھی تھا اور کاتب بھی۔ عبدالمؤمن نے ۵۵۳ھ میں اسے قتل کرا دیا۔ تفصیل آگے آئے گی۔

۳۔ عبدالسلام کومی المقرب ـــــ عبدالمؤمن نے کسی بات پر ناراض ہو کر ۵۵۵ھ میں اسے بھی مروا ڈالا۔

۴۔ عمر بن عبدالمؤمن ـــــ یہ خود عبدالمؤمن کا بیٹا تھا اور اس کی وفات تک وزیر رہا۔

قضاۃ

عبدالمؤمن کے پہلے قاضی القضاۃ ابو محمد عبداللہ بن جبل تھے جو ضلع تلمسان کے شہر وہران کے رہنے والے تھے۔ ان کے بعد عبداللہ بن عبدالرحمٰن المعروف بہ مالقی قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور عبدالمؤمن کی وفات کے بعد تک بھی کچھ عرصہ اسی عہدے پر قائم رہے۔

کُتّاب

۱۔ ابوجعفر احمد بن عطیہ : یہ ایک نہایت قابل اور ذہین شخص تھا اور ادب و انشا کی جملہ اصناف میں ماہرانہ دسترس رکھتا تھا۔ مرابطین کے دورِ اقبال میں وہ علی بن یوسف اور تاشفین بن علی بن یوسف کے درباروں میں کتابت کے

فرائض نہایت عمدگی سے انجام دے چکا تھا۔ جب گردشِ زمانہ نے دولتِ مرابطین کا خاتمہ کر دیا تو وہ ایک لشکری کا بھیس بدل کر ابوحفص عمر اینیتی کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ ابوحفص نے جب سوس میں اپنے مخالفین پر فتح پائی تو اسے ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو عبدالمؤمن کو بھیجنے کے لیے فتح کا بشارت نامہ مناسب الفاظ میں لکھ سکے۔ کچھ لوگوں نے ابوجعفر کا نام لیا، ابوحفص نے اسے بلا کر بشارت نامہ لکھنے کا حکم دیا۔ ابوجعفر نے یہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ جب یہ خط عبدالمؤمن کے پاس پہنچا تو وہ اسے پڑھ کر بہت محظوظ ہوا اور ابوجعفر کو اپنے پاس بلا کر عہدۂ کتابت پر فائز کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اس کی قابلیت اور ذہانت سے ایسا متاثر ہوا کہ اس کو وزارت بھی عطا کر دی گویا ابوجعفر بیک وقت کاتب بھی تھا اور وزیر بھی۔ وہ کئی سال تک کتابت اور وزارت کے فرائض بڑے احسن طریقے سے انجام دیتا رہا لیکن بدقسمتی سے اخیر میں عبدالمؤمن کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک دفعہ عبدالمؤمن لمتونہ کے موحدین کے سردار یحییٰ بن ابوبکر بن یوسف بن تاشفین سے بگڑ بیٹھا اور اس کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا۔ یحییٰ بن ابوبکر، ابوجعفر کا برادرِ نسبتی تھا، (اس کی بہن بنت الصحراویہ ابوجعفر کی بیوی تھی)۔ ابوجعفر نے اپنی بیوی کے ذریعے یحییٰ کو کہلا بھیجا کہ کل جب اسے دربار میں طلب کیا جائے تو علالت کا بہانہ کر کے حاضری سے معذرت کر دے اور اگر ممکن ہو تو درپردہ جزیرہ میرقہ کی طرف فرار ہو جائے۔ عبدالمؤمن کو کسی طرح ابوجعفر کی اس کارروائی کا علم ہو گیا۔ اس نے برافروختہ ہو کر ابوجعفر کو قتل کرا دیا اور یحییٰ کو گرفتار کر کے حوالۂ زنداں کر دیا جہاں سے اس نے چند سال بعد قیدِ حیات سے آزاد ہو کر ہی رہائی پائی۔

۲۔ ابوالقاسم عبدالرحمٰن قالمی۔ ابوجعفر احمد بن عطیہ کے قتل کے بعد عبدالمؤمن نے وزارت اور کتابت کے عہدوں کو الگ کر دیا اور کتابت کے عہدے پر ابوالقاسم

عبدالرحمٰن قالمی کو اور وزارت کے عہدے پر عبدالسلام کومی کو فائز کیا۔ ابوالقاسم قالمی بھی فنِ کتابت پر کامل عبور رکھتا تھا۔ عبدالمؤمن کی وفات کے بعد ابو یعقوب یوسف نے بھی اسے عہدۂ کتابت پر قائم رکھا اور وہ اپنی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔

۴۔ **ابو محمد عیاش بن عبدالملک قرطبی** ۔ یہ ابوالقاسم قالمی کا مددگار کاتب تھا۔ عبدالمؤمن کے بعد ابو یعقوب یوسف نے قالمی کے ساتھ اسے بھی اپنے عہدے پر برقرار رکھا۔

امیر المؤمنین
ابو یعقوب
یوسف بن عبد المؤمن
۵۵۸ھ ۱۱۶۳ء تا ۵۸۰ھ ۱۱۸۴ء

محمد بن عبدالمؤمن

عبدالمؤمن کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد تختِ حکومت پر متمکن ہوا مگر وہ رندِ بلانوش، کاہل، سخت تند مزاج، سریع الغضب، پرلے درجے کا احمق اور جھلا تھا۔ چنانچہ لوگ بہت جلد اس کے مخالف ہو گئے اور صرف ۴۵ دن کے بعد اسے تختِ حکومت سے اتار کر ابو یعقوب یوسف کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

ابو یعقوب یوسف

ابو یعقوب یوسف خلیفہ بننے کے بعد پانچ سال تک خاندانی جھگڑوں میں الجھا رہا۔ اس کا بھائی ابو حفص عمر بن عبدالمؤمن تو خوشدلی سے اس کے حق میں حکومت کے دعوے سے دستبردار ہو گیا (بلکہ فی الحقیقت اسی کی مساعی کے نتیجہ میں یوسف کو حکومت ملی) لیکن اس کے تین دوسرے بھائیوں علی والیٔ فاس، عبداللہ والیٔ بجایہ اور عثمان والیٔ قرطبہ نے اس کی خلافت کو تسلیم نہ کیا تاہم ابو یعقوب یوسف کا بخت یاور تھا علی اور عبداللہ تو یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے اور عثمان بالآخر اس کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس اثناء میں یوسف نے امیرالمسلمین کے لقب پر اکتفا کیا لیکن جب اسے بھائیوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور دوسری چھوٹی موٹی بغاوتیں بھی فرو ہو گئیں تو اس نے باپ کی طرح امیرالمؤمنین کا لقب اختیار کر لیا اور سب سے پہلے یہ کام کیا کہ عبدالمؤمن نے جو بھاری فوج جہاد اور

جنگ کے لیے رباط الفتح میں جمع کی تھی، اس کو منتشر کر کے اپنے اپنے وطن اور قبائل) طرف واپس بھیج دیا، اس کے بعد اس نے تمام قیدیوں کو عام معافی دے دی اور اپنے خزانے کا منہ صدقات اور خیرات کے لیے کھول دیا، اس کی فیاضی اور رحمدلی نے لوگوں کے دل موہ لیے اور دولت موحدین خوشحالی اور اقبال مندی کے راستے پر گامزن ہوگئی۔ اب اس نے اندلس کی طرف توجہ کی جس کے بعض مغربی اضلاع پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور محمد بن سعد المعروف بہ ابن مَرْدَنِیش حاکم جیاں و مرسیہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

اندلس کی فتوحات

۵۶۷ھ/۱۱۷۲ء میں ابو یعقوب یوسف نے ایک زبردست لشکر تیار کیا اور اس کو ساتھ لے کر اندلس پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس نے ابن مردنیش کی طرف توجہ کی اور اشبیلیہ کو اپنا مرکز بنا کر اپنے بھائی عثمان کو مرسیہ کی طرف روانہ کیا۔ ابن مردنیش "الجلاب" کے مقام پر عثمان کے مقابل ہوا لیکن اپنے عیسائی مددگاروں کے باوجود اس نے شکست کھائی اور پیچھے ہٹ کر مرسیہ میں محصور ہو گیا۔ موحدین نے نہایت سختی سے مرسیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اثنائے محاصرہ میں ابن مردنیش قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا، اس کے بیٹے دل شکستہ ہو گئے اور انھوں نے نہ صرف ابو یعقوب یوسف کی اطاعت قبول کر لی بلکہ اپنے باپ کا تمام علاقہ اس کی نذر کر دیا۔ یوسف نے ان کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا اور ان کے باپ کے علاقے پر انھیں ہی اپنی طرف سے حاکم مقرر کر دیا۔

مرسیہ کے قضیے سے نبٹنے کے بعد یوسف عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا اور

بلنشر، الکرازہ، شاطبہ، کونکہ اور یولہ، الیش وغیرہ بہت سے مقامات ایک ایک کرکے عیسائیوں سے چھین لیے۔ چند ماہ بعد اس نے اپنے ایک جرنیل ابوحفص عمرالہنتانی کو اپنے دو بھائیوں یحییٰ اور اسماعیل کی معیت میں کاؤنٹ جمینو (TIMENO) کی سرکوبی کے لیے بھیجا، جس نے وادی الکبیر کے علاقے میں قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ابوحفص نے کراکوٹیل کے قریب کاؤنٹ جمینو کو عبرتناک شکست دے کر قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد موحدین نے دریائے تاجہ (TAGUS) کے کنارے طلیطلہ (TOLEDO) تک کا سارا علاقہ زیروزبر کر ڈالا۔ یوسف کی یلغار سے عیسائیوں پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ قشتالہ کے کاؤنٹ نونو ڈی لارا اور پرتگال کے افانسو ہنریقیس (ابن الریق) نے گڑگڑا کر ابولیعقوب یوسف سے صلح کی درخواست کی۔ یوسف نے اسے منظور کر لیا اور فریقین میں پانچ سال کے لیے صلح کا معاہدہ طے پا گیا۔ پورے پانچ سال اندلس میں قیام کے بعد یوسف نے ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) کے آخر میں مراکش کو معاودت کی۔

۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) سے ۵۷۹ھ (۱۱۸۳ء) تک یوسف نے مسلسل نو برس تک مراکش میں قیام کیا اس دوران میں اس کو افریقیہ کے عربوں کی خوفناک بغاوت کا سامنا کرنا پڑا ان لوگوں کا سردار ایک شخص علی المعروف بہ ابن الرند تھا جس نے "الناصر لدین النبی" کا لقب اختیار کر رکھا تھا اور شہر قفصہ کو اپنا مرکز بنا کر موحدین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔ یوسف نے ۵۷۶ھ (۱۱۸۱ء) میں ایک زبردست فوج کے ساتھ قفصہ کا محاصرہ کر لیا اور تین ماہ کے بعد اس کو مسخر کر لیا۔

شنترین کا محاصرہ اور شہادت

ادھر اندلس سے خلیفہ کی مسلسل غیر حاضری کے سبب عیسائیوں نے پھر زور پکڑ لیا تھا اور کونکہ، باجہ، المساجد، لبلہ، حصن الفارشہ وغیرہ کئی مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۵۸۰ھ ۱۱۸۴ء میں یوسف عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے ایک بھاری فوج کے ساتھ دوبارہ اندلس پہنچا اور پرتگیزی عیسائیوں کے اہم قلعے شنترین (SANTAREM) کا محاصرہ کرلیا۔ اثنائے محاصرہ میں ایک دن وہ اپنے افسروں کی اتفاقی غلطی سے (جس کی تفصیل یعقوب المنصور کے حالات میں آئے گی) دشمن کے گھیرے میں آکر شدید زخمی ہوگیا اور ۱۸ ربیع الآخر ۵۸۰ھ (مطابق ۲۹ جولائی ۱۱۸۴ء) کو اشبیلیہ کے راستے میں ایبورا (EVORA) کے نزدیک وفات پا گیا۔ اس کی لاش اشبیلیہ اور پھر اشبیلیہ سے مراکش لے جاکر سپردِ خاک کی گئی۔

اوصاف و خصائل

اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابو یعقوب یوسف نہایت اعلیٰ اخلاق و اوصاف کا حامل تھا، وہ ایک متبحر عالم اور نہایت خوش بیان شخص تھا۔ ذہانت، فراست، شجاعت، ہمت اور سخاوت کے لحاظ سے وہ قریب قریب اپنے باپ کا ہم پلّہ تھا، وہ ایک معارف پرور حکمران تھا اور اہلِ فضل و کمال کی کھلے دل سے سرپرستی کرتا تھا۔ بعض مؤرخین نے اس کی تدبیر و سیاست کی بھی تعریف کی ہے لیکن جس حد تک اندلس کا تعلق ہے عسکری اور سیاسی لحاظ سے اس کو وہاں مکمل کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اس کے سارے عہدِ حکومت میں عیسائی اس کو لگاتار پریشان کرتے رہے یہاں تک کہ انہیں سے لڑتے لڑتے وہ خود بھی شہید ہوگیا۔

ابُویعقوب یوسُف کی اولاد

ابویعقوب یوسف نے اپنے پیچھے اٹھارہ لڑکے اور چند لڑکیاں چھوڑیں۔

لڑکوں کے نام یہ ہیں:۔
(۱) عمر (۲) یعقوب (ولی عہد) (۳) ابوبکر (۴) عبداللہ (۵) احمد (۶) یحییٰ (۷) موسیٰ (۸) ابراہیم (۹) ادریس (۱۰) عبدالعزیز (۱۱) طلحہ (۱۲) اسحاق (۱۳) محمد (۱۴) عبدالواحد (۱۵) عثمان (۱۶) عبدالحق (۱۷) عبدالرحمن (۱۸) اسمٰعیل۔

قضاۃ

(۱) ابومحمد مالقی

(۲) عیسیٰ بن عمران تازی ــــ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ وہ ایک یگانہ روزگار عالم تھے، نہایت فصیح و بلیغ خطیب ایک باکمال شاعر اور اکثر علوم کے جامع تھے۔

وزراء

ابویعقوب یوسف نے اپنے دورِ حکومت میں یکے بعد دیگرے تین وزیر مقرر کیے۔ سب سے پہلے اپنے بھائی عمر کو وزارت عظمیٰ پر فائز کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ابوالعلاء ادریس بن ابراہیم کو اس کی جگہ وزیراعظم بنایا۔ ۵۷۷ھ میں ابوالعلاء ادریس کو معزول کر کے ولی عہد ابو یوسف یعقوب کو اس عہدے پر مقرر کر دیا۔

کُتّاب

مؤرّخین نے ابو یعقوب یوسف کے پانچ کُتّاب کا نام خصوصیت سے لیا ہے: (۱) ابوالقاسم قالمی

(۲) ابو محمد عیاش بن عبدالملک۔

(۳) ابوالفضل جعفر بن احمد محشوہ

(۴) ابو عبدالرحمان طوسی

(۵) ابوالحسین ہوزنی اشبیلی

امیر المومنین
ابو یوسف
یعقوب المنصور باللہ
بن
ابو یعقوب یوسف بن عبد المومن

۵۸۰ھ تا ۵۹۵ھ
۱۱۸۴ء ۱۱۹۹ء

یعقوب المنصور
کے حدود مملکت

ابتدائی زندگی

ولادت ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں مراکش میں پیدا ہوا۔ اصل نام یعقوب، ابو یوسف کنیت اور المنصور باللہ لقب تھا۔ اس کی والدہ "ساحرہ" نامی ایک رومی خاتون تھی۔ یعقوب کی پیدائش کے وقت اس کا نامور دادا عبدالمؤمن زندہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال اپنے دادا اور والد ابو یعقوب یوسف دونوں کے سایۂ عاطفت میں گزارے۔ یعقوب المنصور کی دادی کا نام زینب بنت موسیٰ الضریر تھا جو ایک شریف اور آزاد خاتون تھی۔

تعلیم و تربیت مؤرخین نے یعقوب المنصور کے بچپن اور تعلیم و تربیت کا حال نہیں لکھا، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ عبدالمؤمن (دادا) اور ابو یعقوب یوسف (والد) دونوں جید عالم تھے۔ اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ دونوں نے یعقوب کو خود بھی تعلیم دی ہوگی اور دوسرے بلند پایہ علماء کو بھی اس کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا ہوگا کیونکہ اس کی آئندہ زندگی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جملہ علوم و فنون میں درجۂ کمال پر فائز تھا۔

عبدالمؤمن نے اندلس پر قبضہ کرنے کے کچھ عرصہ بعد اپنے بیٹے یوسف (ابو یعقوب) کو اشبیلیہ اور اس کے اعمال کا والی بنا دیا تھا اور اس کی مدد کے لیے الموحدون

کے نہایت عاقل و فرزانہ اور صائب الرائے لوگوں کو مقرر کیا تھا۔ خیال یہ ہے کہ یعقوب المنصور نے طفولیت کا کچھ زمانہ اندلس میں اپنے والد کے پاس گزارا اور اس کی تعلیم و تربیت میں بعض اونچے درجہ کے اندلسی علماء نے بھی حصہ لیا۔

علامہ عبدالواحد مراکشی نے "کتاب المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" میں کنایتاً لکھا ہے کہ "ابویوسف یعقوب کے بچپن کا زمانہ بُری طرح گزرا تھا۔"

علامہ موصوف نے "بُری طرح" کی تصریح نہیں کی۔ یعقوب دوسرے شہزادوں کی طرح ایک شہزادۂ ذی جاہ تھا اس لیے اس کے بچپن کا بُری طرح "گزرنا" ناقابلِ فہم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس پر بعض پابندیاں لگائی گئی ہوں یا کچھ سختی کی گئی ہو، سادہ زندگی کا عادی بنانے کے لیے موٹا جھوٹا لباس پہنایا گیا ہو، سادہ خوراک دی گئی ہو لیکن ان سب باتوں سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا عہدِ طفلی "بُری طرح" گزرا۔ ایسی سختیوں کو تو جذبۂ خیر خواہی پر محمول کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی طرح ایک شہزادے کو مستقبل کی عظیم ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بنایا جا سکتا تھا۔ ہاں اس روایت کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے شہزادے کے عادات و اطوار ناپسندیدہ ہوں۔

واللہ اعلم بالصواب

عہدۂ وزارت کا تقرر

۵۷۷ھ / ۱۱۸۱ء میں ابویعقوب یوسف اپنے وزیر ابوالعلاء ادریس بن ابراہیم بن جامع سے ناراض ہو گیا اور اس کو گرفتار کر کے تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ اس کی جگہ اس نے اپنے فرزند ابویوسف یعقوب کو وزیر مقرر کیا اور وہ تین سال تک (یعنی اپنے والد کی وفات تک) نہایت حسن و خوبی کے ساتھ وزارت کے فرائض انجام

دیتا رہا۔ علامہ عبدالواحد مراکشی اس کے زمانۂ وزارت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

" ابو یوسف یعقوب اپنے والد کے زمانہ میں نہایت عمدگی سے وزارت کرتا تھا، وہ تمام امورِ سلطنت کا بنظرِ غائر جائزہ لیتا تھا اور ہر معاملے کے حسن و قبح کے بارے میں متعلقہ حکام سے کافی وشافی بحث کرتا تھا۔ عمّال، ولاۃ، قضاۃ اور دیگر تمام اہم ملازمین کے احوال کا مطالعہ نہایت حسنِ لیاقت سے کرتا تھا اور ان سے جو تجربے حاصل ہوتے تھے ان کو پیشِ نظر رکھ کر کمال حسنِ تدبیر سے کام لیتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اس کی وزارت کے دوران میں تمام امورِ مملکت اقتضاء زمانہ کے مطابق راست و مستقیم اور اقتضاءِ ملک کے مطابق چست و درست ہو گئے تھے۔"

ولی عہدی

شہزادہ یعقوب کے سترہ بھائی اور تھے ان میں سے ایک بھائی ابو حفص عمر اس سے عمر میں بڑا تھا اور دوسرے سب چھوٹے تھے۔ یعقوب ان سب میں قابل تھا اور علم، لیاقت، تدبیر، سیاست، جہانبانی، شجاعت غرض ہر لحاظ سے دوسرے بھائیوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اپنے اوصافِ حمیدہ کی بدولت وہ باپ کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا اور وہ اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا، یہاں تک کہ ابو یعقوب یوسف نے اپنی وفات سے چند سال پہلے یعقوب کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا اور تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس کی بیعت کریں، سب نے اس کو خوش دلی سے ولی عہد تسلیم کر لیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ قیاس یہ ہے کہ اس کی ولی عہدی کا اعلان عہدۂ وزارت پر فائز ہونے سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔

محاصرۂ شنترین میں باپ کی میّت

پیچھے ذکر آچکا ہے کہ امیر المؤمنین ابو یعقوب یوسف بعض ناگزیر حالات کی بناء پر ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) سے ۵۷۹ھ (۱۱۸۳ء) تک مراکش میں مقیم رہا اور اندلس کی طرف کما حقہٗ توجہ نہ دے سکا۔ اس دوران میں الفانسو ہشتم نے کونکہ (CUENCA) کا اہم قلعہ مسلمانوں سے چھین لیا (۵۷۳ھ ۱۱۷۷ء)۔ پھر اس نے استجہ کی طرف پیشقدمی کر کے شنت فیلہ (SANTAFILA) کا مقام فتح کر لیا۔ دوسری طرف موحّدین سے عارضی صلح کی میعاد ختم ہونے کے بعد پرتگال کے ولی عہد سینکو (SANCHO) نے وادی الکبیر کے زیرین علاقے کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا اور باجہ سمیت کئی اہم شہروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں قشتالہ اور لیون کی عیسائی ریاستوں نے بھی فرسینو لیو ندرہ (FRESNO LAVANDERA) کے مقام پر آپس میں معاہدہ کیا کہ مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر جنگ کی جائے۔ ابو یعقوب یوسف کو ان حالات کا علم ہوا تو وہ ایک زبردست فوج لے کر اندلس پہنچا۔ اس فوج میں وزیر سلطنت شہزادہ یعقوب بھی شامل تھا۔ ابو یعقوب یوسف نے حسب عادت پہلے شہر اشبیلیہ میں قیام کیا۔ جب اچھی طرح سستا لیا تو شہر شنترین (SANTAREM) کی جانب روانہ ہوا۔ اس شہر کے دفاعی انتظامات یوں بھی نہایت مضبوط تھے لیکن گزشتہ چند ماہ میں تو عیسائیوں نے اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔ ۱۶ ربیع الاوّل ۵۸۰ھ (۲۷ جون ۱۱۸۴ء) کو موحّدین کا لشکر شنترین کے سامنے جا پہنچا اور اس کے نواحی علاقے کو تاخت و تاراج کر ڈالا لیکن شنترین کے اندر پرتگیزوں نے کثیر مقدار میں سامانِ

خوردونوش اور آلاتِ حرب و ضرب جمع کر رکھے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی زبردست مزاحمت کی اور کئی ہفتے تک انہیں شہر کے قریب نہ آنے دیا تاہم موحدین اہل شہر پر برابر دباؤ ڈالتے رہے۔ جب محاصرہ طویل ہو گیا تو مسلمانوں کو خطرہ پیدا ہوا کہ عنقریب شروع ہونے والی سردی ان کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت نہ ہو دوسرے کہیں دریائے تاجہ میں (جو شہر کے قریب بہتا تھا) طغیانی نہ آجائے اور اسے عبور کرنا اور مدد حاصل کرنا ناممکن ہو جائے۔ چنانچہ فوج کے افسروں نے امیر المؤمنین کو مشورہ دیا کہ شنترین کو فتح کرنے میں کچھ وقت لگے گا اس لیے ہمیں فی الحال محاصرہ اٹھا کر اشبیلیہ واپس جانا چاہیے، جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو ہم پھر اس پر یلغار کریں گے۔ امیر المؤمنین نے ان کا مشورہ قبول کر لیا اور کہا کہ انشاء اللہ کل یہاں سے کوچ کریں گے۔

بادشاہ کے اس ارشاد کا علم صرف فوجی افسروں کو تھا، عام لشکری اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس موقع پر ایک سربرآوردہ امیر ابوالحسن علی عبداللہ بن عبدالرحمٰن المعروف بہ مالقی سے ایک خطرناک غلطی سرزد ہوئی اس نے فوج میں بادشاہ کے حکم کی مناسب تشہیر کیے بغیر اپنے خیموں کو اکھاڑنا شروع کر دیا اور کوچ کا سامان کرنے لگا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کے دیکھا دیکھی اپنے خیمے اکھاڑ کر کوچ کر دیا اور فوج کا بیشتر حصہ دریا عبور کر کے دوسری طرف پہنچ گیا صرف ایک قلیل تعداد پیچھے رہ گئی جو بادشاہ کے اردگرد خیمہ زن تھی اس نے رات وہیں گزاری اور بادشاہ کو عام لشکر کے کوچ کا مطلق علم نہ ہوا، ادھر محصورین نے مسلمانوں کو کوچ کرتے دیکھا تو انہوں نے یکبارگی ابو یعقوب یوسف اور اس کے محافظوں کے خیموں پر حملہ کر دیا، تمام محافظ اور امیر المؤمنین کے متعدد امراء ایک ایک کر کے کٹ مرے اور خود ابو یعقوب نے بھی مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن

من کے ایک سپاہی نے اس کی ناف کے نیچے برچھی ماری جس سے وہ شدید زخمی ہو کر زمین پر گر گیا۔ عین اس وقت کوچ کرنے والے لشکریوں میں سے کچھ اس واقعہ کی سن گن پا کر پیچھے کی طرف پلٹ پڑے اور پرتگیزیوں کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا تھوڑی ہی دیر میں وہ پسپا ہو کر شہر میں گھس گئے اور دروازے بند کر لیے۔ شہزادہ یعقوب نے زخمی باپ کو اٹھا کر ایک محافے میں لٹایا اور بڑی حفاظت کے ساتھ اشبیلیہ کی طرف لے چلا۔ راستے میں زخم کی حالت روز بروز بگڑتی گئی اور کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا چنانچہ اثنائے سفر میں ہی امیر المؤمنین ابو یعقوب یوسف نے ۷ رجب سنہ ۵۸۰ھ (شنبہ) کو غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے وفات پائی۔ اس کی رحلت کا علم شہزادہ یعقوب اور اعیانِ دولت کے سوا کسی کو نہ ہوا اور اس واقعہ کو اشبیلیہ پہنچنے تک بالکل پوشیدہ رکھا گیا ــــــ سفر کی یہ کیفیت تھی کہ ایک سواری پر مرحوم امیر المؤمنین کا محافہ رکھا ہوا تھا جس کے اردگرد ایک سبز پردہ لٹکا ہوا تھا۔ شہزادہ یعقوب اور اس کے ساتھی اس محافہ کے ساتھ ساتھ کبھی پیدل چلتے تھے اور کبھی سوار ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ سب اشبیلیہ پہنچ گئے۔

ابویوسف یعقوب المنصور کی مسند نشینی

اشبیلیہ پہنچ کر مرحوم امیر المؤمنین یوسف کے بھتیجے ابو زید عبدالرحمان بن عمر بن عبدالمؤمن اور دوسرے امراء سلطنت نے امیر المؤمنین ابو یعقوب یوسف کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ ولی عہد شہزادہ یعقوب بن یوسف کی تجدید بیعت کی جائے۔ المصامدہ اور موحدین کے دوسرے تمام قبیلوں نے اسے امیر المؤمنین یوسف کا حکم سمجھ کر بلا تامل یعقوب بن یوسف کی دوبارہ بیعت کر لی۔ (پہلی دفعہ انہوں نے اس کے ولی عہد نامزد ہونے پر بیعت کی تھی) جب یہ کام سر انجام پا گیا تو اعیان سلطنت نے امیر المؤمنین ابو یعقوب یوسف کی وفات کا اظہار کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ اب ابو یوسف یعقوب بن یوسف دولت موحدین کے فرمانروا اور امیر المؤمنین ہیں۔ چنانچہ رجب ۵۸۰ھ ۱۱۸۴ء میں یعقوب المنصور کی خلافت کا آغاز ہو گیا۔

جب لوگ اس کے مرحوم والد کی تعزیت سے فارغ ہو چکے تو ابو یعقوب یوسف کی لاش کو ایک تابوت میں رکھ کر تینملل لے گئے جہاں اس کو عبدالمؤمن اور ابنِ تومرت کی قبروں کے پاس سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ ابو یعقوب اشبیلیہ کے راستے میں سرِ شام فوت ہوا تو چند خاص آدمیوں کے سوا اہلِ لشکر میں سے کسی کو اس کی وفات سے مطلع نہیں کیا گیا البتہ مغرب اور عشاء کے درمیان یہ اعلان کیا گیا کہ ایک شخص فوت ہو گیا ہے اس کی نمازِ جنازہ

پڑھی جائے گی۔ چنانچہ سارے لشکر نے یہ جانے بغیر نماز پڑھی کہ یہ کس کا جنازہ ہے۔
علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ وفات سے دو تین دن پہلے ابو یعقوب یوسف نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟ جب اسے بتایا گیا کہ یہ سب کچھ ابوالحسن علی مالقی کی جلدبازی کی وجہ سے ہوا تو ابو یعقوب کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے۔ "انشاءاللہ وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا۔" مالقی کو بادشاہ کے اس فقرے کا علم ہوا تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور بھاگ کر پرتگیزی حکمران ابن الریق کے پاس پناہ لی۔ اس نے مالقی کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اس کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ چونکہ اس کے اہل و عیال مسلمانوں کے پاس تھے اس لیے کچھ عرصہ بعد اس نے موحدین کو ایک خط لکھا جس میں معافی کی التجا کی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ شنترین کے استحکامات فلاں جگہ سے کمزور ہیں۔ اب اگر اس پر حملہ کیا جائے تو یہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ یہ خط ابن الریق کے ہاتھ آ گیا وہ سخت برافروختہ ہوا اور غداری کے جرم میں مالقی کو زندہ جلوا دیا۔
اگرچہ امیر المومنین یعقوب کی خلافت کا اعلان اشبیلیہ میں کر دیا گیا تھا لیکن اس کی "تجدید بیعت" کی تکمیل شمالی افریقہ کے شہر سلا میں ہوئی جہاں وہ اشبیلیہ میں چند دن قیام کے بعد اپنے لشکر سمیت وارد ہوا۔ یہاں اس کے چچاؤں اور بعض دوسرے اقارب نے اہل مغرب کی ایک کثیر تعداد کے ہمراہ اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ خلیفہ نے بھی اپنے چچاؤں اور دوسرے اعزہ واقارب کو وسیع جاگیریں انعام میں دیں اور بہت کچھ زرِ نقد بھی عطا کیا۔ اس بخشش و عطا کا سبب ان لوگوں کی تالیفِ قلب کرنا تھا تاکہ وہ اطمینان اور آسودگی سے زندگی بسر کر سکیں اور خلافت کی طمع نہ کریں۔
سلا سے ابو یوسف یعقوب مراکش پہنچا اور شہر کے قریب ساحلِ بحر پر اُس شہر کی تکمیل کی جس کی تعمیر کا آغاز اس کے والد ابو یعقوب یوسف نے کیا تھا۔

اس شہر کا بیشتر حصہ یعقوب المنصور کی زندگی میں آباد ہوگیا تاہم وہ عظیم الشان مسجد مکمل نہ ہوسکی جس کی بنا شہر کے ساتھ ہی ڈالی گئی تھی۔ اس کی تفصیل تعمیرات کے باب میں آئے گی۔

مراکش پہنچ کر امیر المؤمنین ابو یوسف یعقوب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مالی امور کے متعلق چند سخت احکام جاری کئے اور ساتھ ہی رعایا کو ہدایت کی کہ وہ اسراف اور بدعات سے گریز کرے اور اپنے قدیم عقائد پر سختی سے کاربند رہے۔ خلیفہ نے عدلیہ پر بھی اپنی ذاتی توجہ مبذول کی اور تمام قاضیوں کو ہدایت جاری کی کہ وہ عدل وانصاف میں مطلق کسی کی رُو رعایت نہ کریں اور تمام فیصلے قوانینِ شرعی کے مطابق (یعنی کتاب وسُنّت کی روشنی میں) کریں۔ ابھی اس نے نظم ونسق میں اصلاح کا آغاز کیا ہی تھا کہ بنو غانیہ نے عَلَمِ بغاوت بلند کرکے ملک میں طوفان برپا کردیا۔ اگر ان لوگوں کو مزید ڈھیل دی جاتی تو دولتِ موحدین کو سخت نقصان پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ کو ان کی طرف ذاتی طور پر متوجہ ہونا پڑا اور اس کی خلافت کے پہلے چار سالوں کا بیشتر حصہ بنو غانیہ سے معرکہ آرائیوں اور دوسری بغاوتیں فرو کرنے میں صَرف ہوا۔

عہدِ خلافت
کے
اہم واقعات

(۱)

بنو غانیہ سے معرکہ آرائیاں

بنو غانیہ جن کے خروج نے یعقوب المنصور کی خلافت کو ابتدا ہی میں زبردست خطرے سے دوچار کر دیا، فی الحقیقت المرابطون ہی کی ایک شاخ تھے کیونکہ وہ المرابطون کے ہوا خواہ اور انہی کی دعوت کے علمبردار تھے۔ قبل اس کے کہ بنو غانیہ اور یعقوب المنصور کی معرکہ آرائیوں کا حال لکھا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بنو غانیہ کی مختصر تاریخ بیان کر دی جائے۔

مرابطی فرمانروا امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشفین نے اپنے دورِ حکومت میں یحییٰ بن علی بن یوسف المسُوفی کو مغربی اندلس کا والی مقرر کیا تھا۔ یحییٰ کی والدہ کا نام غانیہ تھا جو امیر المسلمین یوسف بن تاشفین سے رشتۂ قرابت رکھتی تھی چنانچہ اسی کی نسبت سے یحییٰ کو ابنِ غانیہ کہا جاتا تھا۔ یحییٰ کا والد علی بن یوسف المسُوفی دولتِ مرابطین کے اعیان میں سے تھا اور امیر المسلمین علی بن یوسف کے دربار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ یحییٰ اور اس کا بھائی محمد امیر المسلمین کے زیرِ سایہ مراکش میں ہی سنِ رشد کو پہنچے۔ سنہ ۵۲۰ھ (۱۱۲۶ء) میں امیر المسلمین علی بن یوسف نے ابنِ غانیہ (یحییٰ) کو مغربی اندلس کا والی مقرر کیا جہاں اس نے عیسائیوں کے خلاف شاندار کارنامے سرانجام دیئے اور کئی بار اندلسی مسلمانوں پر نازل شدہ مصائب کو اپنے زورِ بازو سے رفع کیا، عیسائیوں سے اس کے جہاد کے سلسلے میں فرغہ (FRAGA) کی لڑائی بہت مشہور ہے جس میں اس نے ارغون (ARAGON) کے اسلام دشمن بادشاہ "الفانسو جنگجو" (ALFANSO THE FIGHTER) کو عبرتناک شکست دی (سنہ ۵۲۸ھ / ۱۱۳۴ء)۔

ابنِ غانیہ کی زندگی کے آخری دور میں تحریکِ موحدین بہت زور پکڑ گئی اور اندلس میں موحدین کے حامیوں نے المرابطون کے بہت سے علاقوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا، اور ابنِ غانیہ کے مقبوضات کا دائرہ بہت محدود کر دیا۔ ابنِ غانیہ ۱۰ شعبان ۵۴۳ھ (۲۴ دسمبر ۱۱۴۸ء) کو غرناطہ میں فوت ہو گیا۔

علامہ عبدالواحد مراکشی نے ابنِ غانیہ کی شخصیت اور کردار کی بے حد تعریف کی ہے، وہ "المعجب" میں لکھتے ہیں:

> "یحییٰ (ابنِ غانیہ) ایسے اوصافِ جمیلہ کا حامل تھا جو کسی فردِ واحد میں بمشکل جمع ہو سکتے ہیں، وہ ایک مردِ صالح تھا، خشیتِ الٰہی سے ہر وقت لرزہ براندام رہتا تھا، علماء اور صلحاء کی عزت افزائی اور قدردانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، وہ خود بھی ایک متبحر عالم، فقیہ اور محدث تھا، مزید برآں وہ ایک بہادر شہسوار بھی تھا اور پانچ صد سواروں کے برابر متصور کیا جاتا تھا۔"

ابنِ غانیہ کا بھائی محمد اس کی طرف سے جزائر بالیاری (BALEARIC) کا والی تھا۔ یحییٰ کی وفات کے بعد محمد کی ہوا اندلس میں اکھڑ گئی، جب موحدین نے مرابطین پر غلبہ پا لیا تو وہ شہر دانیہ پہنچا اور وہاں سے سمندر عبور کر کے جزیرہ میورقہ (MAJORCA) میں جا پہنچا جہاں اس کے اہل وعیال اور دوسرے اہلِ قبیلہ (بنو غانیہ) مقیم تھے۔ میورقہ پہنچنے کے چند دن بعد اس نے قریب کے دو جزیروں منرقہ اور یابسہ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح ان تین جزیروں میں اس نے اپنی مستقل حکومت قائم کر لی۔ محمد لوگوں کو المرابطون کی دعوت دیتا تھا اور اپنے آپ کو عباسی خلیفۂ بغداد کا اطاعت گزار کہتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد اس نے وفات پائی تو بنو غانیہ کی قیادت اس کے بیٹے ابو ابراہیم اسحاق نے سنبھالی۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ ابو ابراہیم اسحاق نے اپنے بڑے بھائی عبداللہ

کو (جو ولی عہد تھا) قتل کرکے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اسحاق ایک صاحب تدبیر، شجاع اور غیور مسلمان تھا۔ اس نے ایک طرف تو بلادِ روم کے عیسائیوں سے جنگ و جہاد کا سلسلہ شروع کر دیا اور دوسری طرف الموحدون سے صلح اور دوستی کا رشتہ قائم کیا۔ وہ ہر سال باقاعدگی سے دو مرتبہ رومیوں سے جنگ آزما ہوتا، ان کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا اور بے شمار مالِ غنیمت اور قیدی لے کر وطن کو لوٹتا۔ اس مالِ غنیمت اور قیدیوں میں سے وہ الموحّدون کا حصہ بھی نکالتا اور موحّد فرمانروا ابو یعقوب یوسف کو ہر مہم سے واپس آنے کے بعد جنگی قیدی اور بیش قیمت تحائف ارسال کرتا۔

ابو یعقوب یوسف سے اس کا نامہ و پیام بھی ہوتا رہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ لوگوں کو بنو عباس اور المرابطون کی دعوت بھی برابر دیتا رہا۔ ابو یعقوب یوسف نے مدت تک اس کے مقبوضات کو حقیر اور ناقابلِ التفات سمجھا لیکن اپنی خلافت کے آخری دور (۵۷۸ھ ۱۱۸۲ء) میں اس نے ابو ابراہیم اسحاق کو پے بہ پے کئی خطوط لکھے جن میں اس کو الموحّدون کی دعوت اور اطاعت قبول کرنے کی ترغیب دی اور منبر دل پر اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کو کہا۔ ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر اس نے ان احکام کی تعمیل سے گریز کیا تو اس کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ ابو ابراہیم نے اپنے اعیان و انصار سے مشورہ کیا تو سب نے یہی رائے دی کہ الموحدین کی اطاعت کا قلادہ ہرگز گلے میں نہ ڈالا جائے۔ چنانچہ ابو ابراہیم ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد (۵۷۹ھ ۱۱۸۳ء) میں وہ حسبِ معمول جہاد کے لیے بلادِ روم کی طرف گیا وہاں رومیوں سے ایک خونریز جنگ میں گردن میں برچھی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا، بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ اس زخم کی وجہ سے وہیں فوت ہو گیا اور بعض نے بیان کیا ہے کہ وہ زخمی حالت میں وطن واپس آ گیا اور یہیں اپنے محل میں فوت ہوا۔ اس نے اپنے پیچھے کئی بیٹے چھوڑے جن کے نام یہ ہیں، علی، یحییٰ، ابوبکر، سیر، تاشفین، محمد المنصور اور ابراہیم علی سب سے

بڑا تھا اور ابوابراہیم اسحاق نے اسی کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ چنانچہ باپ کی وفات کے بعد علی نے بنو غانیہ کی قیادت سنبھالی۔ ابو یوسف یعقوب ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں مسندِ خلافت پر بیٹھا تو یہی علی بن اسحاق بنو غانیہ کا سردار تھا۔ وہ ایک بلند ہمت اور جنگجو آدمی تھا۔ جب اسے شنترین میں موحدین کی پسپائی اور امیر المومنین ابو یعقوب یوسف کی وفات کا علم ہوا تو اس نے اس موقع کو غنیمت جانا، پہلے تو موحدین کی طرف سے اطاعت کے مطالبہ کو رد کیا اور اس کے بعد ان کے خلاف جنگی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔

(۲)

بجایہ، الجزائر وغیرہ پر بنو غانیہ کا استیلا

یعقوب المنصور کی خلافت کے آغاز (۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء) میں علی بن اسحاق نے ایک زبردست بحری بیڑا تیار کیا اور یکایک شہر بجایہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، کہا جاتا ہے کہ خود بجایہ کے بہت سے سربرآوردہ لوگوں نے اس کو بجایہ پر قبضہ کرنے کی دعوت دی تھی تاہم جب علی شہر پر حملہ آور ہوا تو الموحدون کے حامیوں کی ایک مختصر جماعت نے اس کی زبردست مزاحمت کی لیکن علی نے ان کو مغلوب کر لیا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ اتفاق سے وہاں یعقوب المنصور کا چچا ابو موسیٰ عیسیٰ بن عبدالمؤمن بھی موجود تھا علی نے اس کو قید کر لیا[1]

---

[1] موحدین کی طرف سے بجایہ کا حاکم یعقوب المنصور کا چچا زاد بھائی سلیمان بن عبداللہ بن عبدالمؤمن تھا۔ ابو موسیٰ عیسیٰ بن عبدالمؤمن افریقیہ کے ایک حصے کا گورنر تھا، بنو غانیہ کے

علی نے بجایہ میں سات دن قیام کیا، اس دوران میں اس نے وہیں جمعہ کی نماز ادا کی۔ بجایہ کے خطیب ابو محمد عبدالحق بن عبدالرحمٰن ازدی اشبیلی نے بنو غانیہ کے پاسِ خاطر سے خطبہ میں عباسی خلیفہ بغداد احمد الناصر کا نام لیا [1]۔ علی نے بجایہ پر اپنی طرف سے امیر مقرر کیا اور پھر وہاں سے نکل کر ایک طوفانی یلغار میں الجزائر، ملیانہ، اشیر قلعہ بنو حماد اور اس کے تمام نواحی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) بجایہ پر قبضہ کے وقت وہ محض اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ اس کی وہاں موجودگی کا پس منظر یہ تھا کہ افریقیہ کے بعض علاقوں میں عربوں نے بغاوت کر دی تھی۔ ابو موسیٰ اپنے بھائی ابو علی حسن کے ساتھ ایک زبردست فوج لے کر ان کی سرکوبی کے لیے آیا لیکن شکست کھا کر عربوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا۔ ابو یعقوب یوسف کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے عربوں کو اس کی رہائی کے لیے لکھا۔ انہوں نے اس کے عوض چھتیس ہزار دینار کا مطالبہ کیا۔ ابو یعقوب نے یہ رقم انہیں بھیج دی (بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے پیتل کے دینار بنوا کر ان پر سونے کا رنگ پھروا دیا، اسطرح عرب دھوکا کھا گئے) اور انہوں نے ابو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا، رہا ہو کر واپس جاتے ہوئے وہ چند دن کے لیے بجایہ میں ٹھہرا۔ اسی دوران میں بنو غانیہ نے بجایہ پر قبضہ کر لیا۔

[1] ابو محمد عبدالحق بن عبدالرحمٰن کا شمار اپنے دور کے مشاہیر علماء میں ہوتا تھا، وہ بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ یعقوب المنصور نے خطبہ کا واقعہ سنا تو اس کو ابو محمد عبدالحق پر سخت غصہ آیا اور اس نے ان کے قتل کا ارادہ کر لیا لیکن خدا کی قدرت چند دن بعد وہ بیمار رہ کر طبعی موت مر گئے۔

(۳)

یعقوب المنصور کی جوابی یلغار

امیر المومنین یعقوب المنصور کو بنو غانیہ کی ترکتازیوں کا علم ہوا تو اس نے ایک زبردست فوج تیار کی اور اسے ساتھ لے کر بنو غانیہ کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا۔ موحدین کی بری فوج کو سبتہ (CEUTA) کے بحری بیڑے کی امداد بھی حاصل تھی ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء کے موسم بہار میں یعقوب المنصور نے یکے بعد دیگرے کئی مقامات بنو غانیہ کے قبضے سے نکال لیے۔ ان میں الجزائر اور بجایہ بھی شامل تھے۔ موحدین کی یلغار کی خبر سن کر اہل بجایہ سخت خوفزدہ تھے کیونکہ انہی کے ایماء اور دعوت پر بنو غانیہ نے بجایہ پر تسلط جمایا تھا اور ان کو ڈر تھا کہ وہ موحد فرمانروا کے شدید عتاب کا ہدف بن گے۔ لیکن ان کی مسرت اور تعجب کی انتہا نہ رہی جب یعقوب المنصور نے بجایہ میں داخل ہو کر عفوِ عام کا اعلان کر دیا اور کسی شخص کو معمولی سرزنش تک نہ کی، اس کے برعکس وہ اہل بجایہ سے کمال حسنِ سلوک سے پیش آیا اور ان پر عنایات و نوازشات کی بارش کر دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب المنصور بوجوہ ان لوگوں کی تالیفِ قلب کرنا چاہتا تھا یہ مقصد اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کر کے بآسانی حاصل کر لیا۔ بجایہ کے بنو غانیہ کے قبضے سے آزاد ہوتے ہی یعقوب المنصور کے دونوں چچاؤں، ابو موسیٰ عیسیٰ اور حسن بن عبدالمؤمن کو بھی آزادی نصیب ہو گئی۔ بجایہ میں چند روز قیام کے بعد یعقوب نے اپنے ایک بااعتماد آدمی محمد بن ابوسعید جنفیسی کو بجایہ کا حاکم مقرر کیا اور خود پھر علی بن اسحاق (ابنِ غانیہ) کی طرف متوجہ ہوا جس نے شہر قسطنطینہ (COSANTINA) کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ علی نے یعقوب المنصور کے آنے کی خبر سنی تو اس نے بلاد الجرید

(مشرقی تونس) کا رُخ کیا اور توزر اور قفصہ (CAFSA) پر قبضہ کر کے وہاں سے مُوحدین کو نکال باہر کیا۔ اس زمانے میں طرابلس (بلادِ لیبیا) کے ایک حصّے پر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے مولیٰ (غلام) قراقوش کا قبضہ تھا، چونکہ قراقوش اور علی بن اسحاق دونوں بغداد کی خلافتِ عباسیہ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ اس لیے دونوں نے آپس میں اتحاد کر لیا اور موحدین سے یکے بعد دیگرے بہت سے شہر اور علاقے چھین لیے، یہاں تک کہ افریقیہ میں تونس اور مہدیہ کے شہروں کے سوا باقی تمام علاقوں پر بنو غانیہ اور قراقوش کا استیلا ہو گیا۔

یہ صورتِ حال یعقوب المنصور کے لیے سخت تشویشناک تھی، چنانچہ اس نے اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر ایک بڑی فوج تیار کی اور اس کو ساتھ لے کر بسرعت تمام تونس پہنچا، چند دن بعد وہاں سے فوج کا ایک حصہ بنو غانیہ اور قراقوش کی سرکوبی کے لیے بھیجا، اس فوج کی قیادت اس کا چچا زاد بھائی یعقوب بن عمر بن عبد المؤمن کر رہا تھا۔

۱۵ ربیع الثانی ۵۸۳ھ (۲۴ جون ۱۱۸۷ء) کو قفصہ کے قریب عمرہ کے مقام پر موحدین کی مڈبھیڑ علی بن اسحاق اور قراقوش کے متحدہ لشکر سے ہوئی۔ موحدین جان توڑ کر لڑے لیکن غنیم کے لشکر میں شامل عربوں اور بربریوں کے جان لیوا حملوں کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے اور افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ عرب اور بربر فوجیوں نے ان کا تعاقب کیا اور جو اُن کے ہتھے چڑھ گیا اسے تہ تیغ کر دیا۔ ہزیمت خوردہ لشکریوں میں سے ایک کثیر تعداد بھوک پیاس سے بھی ہلاک ہو گئی[1] جو لوگ باقی بچ گئے وہ نہایت بُری حالت میں امیر المؤمنین یعقوب کے

---

[1] علامہ عبدالواحد مراکشی نے اس لڑائی کے بارے میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے۔
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پاس تونس پہنچے۔ خلیفہ نے ان لوگوں سے نہ کوئی باز پرس کی اور نہ انہیں ہدفِ ملامت بنایا بلکہ ان سے اظہارِ ہمدردی کیا اور ان کی ہمت بندھائی۔ اس کے بعد اس نے بڑے زور شور سے جنگ کی تیاری کی اور تین ماہ بعد خود فوج لے کر غنیم پر حملہ آور ہوا۔

۹ شعبان ۵۸۳ھ (۱۴ اکتوبر ۱۱۸۷ء) کو الحمّیٰ (یا حامۃ دقیوس) کے مقام پر فریقین کے درمیان خونریز جنگ ہوئی، میدانِ کارزار میں خلیفہ کی موجودگی کی وجہ سے موحدین کے حوصلے بہت بلند تھے انہوں نے غنیم پر تابڑ توڑ ایسے خوفناک حملے کیے کہ علی اور قراقوش کے متحدہ لشکر کے قدم بہت جلد اکھڑ گئے۔ علی بذاتِ خود بڑا دلاور آدمی تھا وہ آخری دم تک شدید زخمی ہونے کے باوجود میدانِ جنگ میں ڈٹا رہا جب خون زیادہ بہہ جانے سے بالکل نڈھال ہو گیا تو طوعاً کرہاً بھاگ کر ایک بدوی عورت کے خیمے میں پناہ لی اور اسی جگہ فوت ہو گیا اس کی موت کے بعد بنو غانیہ نے بالاتفاق اس کے بھائی یحییٰ بن اسحاق کو اپنا امیر منتخب کیا جو بڑا شجاع اور قابل شخص تھا۔ اس کے تینوں بھائیوں عبداللہ، سیر اور ابوبکر نے بھی اس کی اطاعت کا عہد کیا لیکن الحمّیٰ (حامۃ دقیوس) کی شکست کے بعد اب ان بھائیوں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ الموحدین سے لڑائی جاری رکھ سکیں چنانچہ انہوں نے عارضی طور پر اپنی عسکری سرگرمیاں ترک کر دیں اور افریقیہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ کہتے ہیں کہ یعقوب المنصور کے پاس ایک کپڑا تھا جس پر لکھا ہوا تھا کہ یعقوب نامی ایک شخص کی قیادت میں موحدین کو وطاعمرہ کے مقام پر دشمن سے شکست کھانی پڑے گی چنانچہ اس نے خود فوج کی قیادت کرنے کے بجائے اپنے ہمنام ابن عم یعقوب کو فوج کا سپہ سالار بنایا اور اس نے حسبِ تحریر سخت شکست کھائی۔

صحرائی علاقے کی طرف پسپا ہو گئے۔

(۴)

تقفصہ کی از سرِ نو تسخیر

بنو غانیہ کو شکست دے کر ابو یوسف یعقوب نے تقفصہ کا رُخ کیا جہاں کے باشندوں نے اس کی بیعت توڑ کر المرابطین (بنو غانیہ) کی دعوت قبول کر لی تھی اور ان کو بلا کر شہر ان کے حوالے کر دیا تھا۔ الموحدی حکمرانوں نے اہلِ تقفصہ کے ساتھ ہمیشہ نہایت فیاضانہ برتاؤ کیا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے نقضِ عہد کیا اور بغیر کسی جواز کے نہایت اشتعال انگیز حرکتیں کیں چنانچہ ابو یوسف یعقوب کے دل میں ان لوگوں کے خلاف سخت غصہ تھا۔ اس نے بڑی سختی سے تقفصہ کا محاصرہ کر لیا، اگر تقفصہ کے باشندے اس موقع پر بھی اس کی اطاعت قبول کر لیتے تو شاید وہ درگزر سے کام لیتا لیکن اہلِ تقفصہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اس پر ابو یوسف نے حکم دیا کہ منجنیقوں سے تقفصہ کی فصیلوں پر شدید سنگ باری کی جائے، اس سنگباری نے شہر کی فصیلوں میں جگہ جگہ شگاف ڈال دیئے اور موحدین یلغار کر کے شہر کے اندر داخل ہو گئے، امیر المؤمنین نے غیظ و غضب کے عالم میں مزاحمت کرنے والے بہت سے لوگوں کو قتل کرا دیا اور شہر کی فصیلوں کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ اس موقعہ پر ایک درباری شاعر ابو اسحٰق ابراہیم زویلی نے اس کی مدح میں ایک طویل قصیدہ کہا جس میں اہلِ تقفصہ کو کافر اور ابولہب کے مماثل قرار دیا۔ تقفصہ کی تسخیر کے بعد یعقوب المنصور نے توزر اور قابس کی طرف پیشقدمی کی اور ان کو زیر کر کے افریقیہ کے سارے جنوبی علاقے پر از سرِ نو موحدین کا اقتدار قائم کر دیا۔ اس کے بعد اس نے مغرب کو

مراجعت کی۔

(۵)

چچا اور بھائی کی بغاوت

جس زمانے میں یعقوب المنصور افریقیہ کے معاملات میں الجھا ہوا تھا، اس کے بھائی ابوحفص عمر اور چچا ابوالربیع سلیمان بن عبدالمؤمن کے دل میں بادشاہت کا شوق چرایا۔ ابوحفص عمر جس نے "الرشید" کا لقب اختیار کر رکھا تھا، اندلس کے مشرقی شہر مرسیہ کا والی تھا اور ابوالربیع سلیمان بن عبدالمؤمن بلادِ صنہاجہ کے شہر "تادلا" کا حاکم تھا۔

ابوحفص عمر الرشید نے کھلم کھلا امیر المؤمنین ابویوسف یعقوب کی بیعت سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور اندلس کے بہت سے بااثر امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ تاہم مرسیہ کے قاضی وخطیب ابن ابی جمرہ نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا اور ابوحفص عمر کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر ابوحفص عمر سخت برافروختہ ہوا اور قاضی صاحب کو اپنے دربار میں بلا بھیجا، وہ آئے تو ابوحفص نے اپنی تلوار کی نوک ان کے سینے پر رکھ دی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ امیر المؤمنین ابویوسف یعقوب کی بیعت سے منحرف ہونے کا اعلان کریں۔ انہوں نے یہ بات نہ مانی اس پر ابوحفص نے تلوار کی نوک اس زور سے ان کے سینے میں چبھوئی کہ وہ سخت زخمی ہو گئے اور چند دن بعد اسی زخم کے صدمے سے جاں بحق ہو گئے۔ یعقوب المنصور کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ سخت غضب ناک ہوا۔ ادھر ابوالربیع سلیمان بن عبدالمؤمن نے خود بادشاہت کا دعویٰ کیا اور صنہاجہ کے شیوخ کو جمع کر کے ان سے اپنی بیعت کا مطالبہ کیا۔ ابوالربیع سلیمان

کو اپنے ارادے میں چنداں کامیابی نہ ہوئی پھر بھی کچھ نہ کچھ لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ یعقوب المنصور کو دم دم کی خبریں پہنچ رہی تھیں اور اس نے ابوحفص عمر اور ابوالربیع سلیمان کو قرار واقعی سزا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا چنانچہ وہ برق رفتاری سے منزلوں پر منزلیں مارتا بجایہ سے فاس پہنچا۔ ابوحفص عمر اور سلیمان کو خلیفہ کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو دونوں اپنے حامیوں کو ساتھ لے کر مرسیہ اور تادلا سے روانہ ہوئے۔ سلیمان شہر مکناسہ کے قریب خیمہ زن ہوا اور ابوحفص عمر بھی سمندر عبور کر کے اس سے آملا۔ یعقوب المنصور کی لشکر گاہ بھی قریب ہی تھی اور اس کے ساز و سامان اور فوج کی تعداد عمر اور سلیمان کے متحدہ لشکر سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کو دیکھ کر دونوں پر دہشت طاری ہو گئی اور انہوں نے مقابلہ کا ارادہ ترک کر کے امیر المؤمنین کو پیغام بھیجا کہ وہ انہیں ملاقات کا شرف بخشے۔ ابویوسف نے ان کی درخواست منظور کر لی لیکن کسی قسم کا وعدہ نہ کیا۔ پہلے ابوحفص عمر گھوڑے پر سوار ہو کر خلیفہ کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا، شاہی نشست گاہ کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترا ابویوسف کے قریب پہنچا اور بڑے ادب کے ساتھ سلام کیا لیکن ابویوسف نے کوئی بات نہ کی اور حکم دیا کہ اس کی مشکیں کس لی جائیں، سپاہیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اسی حالت میں اس کو شہر سلا کی طرف لے گئے۔ اس کے بعد ابوالربیع سلیمان ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا، ابویوسف اس کو اپنے ساتھ لے کر سلا پہنچا اور وہاں ان دونوں کو زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا جس پر سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ اس کے بعد خلیفہ سلا سے کوچ کر کے مراکش پہنچا وہاں سے اس نے قید خانے کے محافظِ اعلیٰ کو حکم بھیجا کہ ان دونوں کو قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد باقاعدہ تجہیز و تکفین کر کے اور نماز جنازہ پڑھ کر ان کو دفن کر دیا جائے۔ محافظِ اعلیٰ نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ چونکہ دونوں مقتول

شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے محافظِ اعلیٰ نے سنگِ مرمر اور سنگِ خارا سے ان کی شاندار قبریں بنوادیں لیکن جب اس نے اس کی اطلاع ابو یوسف کو بھیجی تو اس نے محافظِ اعلیٰ کے اس کام پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس کو لکھا کہ :

"ہم کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ظالموں کو کیسے دفن کیا گیا ہے۔ وہ دونوں معمولی مسلمان تھے، ان کو اسی طرح دفن کرو جس طرح عام مسلمانوں کی تدفین ہوتی ہے۔"

یہ واقعہ جو ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) میں پیش آیا، بڑے دُور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ اس سے پہلے ابو یوسف کے رشتہ دار اس کو حقیر اور معمولی آدمی سمجھتے تھے لیکن اب ان پر اس کا رعب طاری ہو گیا اور انہوں نے صدقِ دل سے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔

(۶)

بنو غانیہ کا دوبارہ خروج

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد بنو غانیہ نے افریقیہ (تیونس) اور جزیرہ میورقہ میں پھر فساد کی آگ بھڑکا دی۔ افریقیہ میں بنو غانیہ کے حوصلہ مند سردار یحییٰ بن اسحاق کی ترکتازیوں کی داستان بہت طویل ہے، کبھی تو وہ صحرا کی پہنائیوں میں روپوش ہو جاتا اور کبھی اس طرح نمودار ہوتا جیسے شیر اپنی کچھار سے نکلتا ہے پھر وہ کئی شہروں اور علاقوں پر قبضہ کر کے صاحبِ طبل و علم بن جاتا۔ جب شاہی عمّال اس پر حملہ آور ہو کر زبردست دباؤ ڈالتے تو وہ پھر قعرِ گمنامی میں جا پڑتا۔ بہرحال اس نے سالہا سال تک موحدین کے مقابلے میں اپنی جدوجہد کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تک یعقوب المنصور زندہ رہا اس نے بنو غانیہ کو دبا کر رکھا اور

انہیں ایسی حریف قوت بننے کا کبھی موقع نہ دیا جو الموحدین کے اقتدار کے لیے خطرہ کا باعث بن سکے۔

جزیرہ میورقہ میں عجیب حالات پیدا ہوئے جس زمانے میں علی بن اسحاق میورقہ سے افریقیہ کی طرف گیا تو اس نے اپنے ایک بھائی ابو عبداللہ محمد بن اسحاق کو میورقہ کے امور کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑ دیا۔ (باقی تینوں بھائی عبداللہ، سیر اور ابوبکر اس کے ساتھ ہر مہم میں شریک رہے) علی کی غیر حاضری میں محمد بن اسحاق نے الموحدین کی دعوت قبول کرلی اور اہل میورقہ نے بھی اس کی پیروی کی۔ علی کے انتقال کے بعد یحییٰ تو افریقیہ کے صحرائی علاقے کی طرف چلا گیا اور عبداللہ بن اسحاق واپس میورقہ آگیا، یہاں اس نے محمد بن اسحاق اور اہل میورقہ کو موحدین کی اطاعت کا دم بھرتے دیکھا تو وہ سخت حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ اب کیا لائحۂ عمل اختیار کیا جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مرابطین کے حامیوں کی ایک جماعت نے اسے اپنے قلعہ میں بلا بھیجا، ان لوگوں کا سردار نجاح نامی ایک عیسائی جنگجو تھا، جب وہ قلعہ میں پہنچا تو جزیرہ کے بہت سے دیہاتی (کسان اور گڈریے) بھی اس سے آن ملے۔ عبداللہ نے ان لوگوں کی مدد سے میورقہ پر اپنا اقتدار قائم کرلیا اور محمد بن اسحاق کو اندلس کی طرف جلا وطن کردیا، محمد تا دمِ مرگ موحدین کی حمایت میں سرگرم رہا اور موحدین نے بھی اس کی کما حقہٗ قدر افزائی کی۔

علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ یعقوب المنصور نے اسے شہر دانیہ کا حاکم مقرر کردیا، چند سال بعد جب اس نے وفات پائی تو وہ اسی عہدے پر فائز تھا۔ عبداللہ نے میورقہ پر تسلط جما کر اپنے مجاہد باپ اسحاق کی حکمتِ عملی اختیار کی اور موحدین سے لڑنے کے بجائے رومیوں پر حملوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ یعقوب المنصور نے بھی اس سے چنداں تعرض نہ کیا بلکہ بالکل ہی نظر انداز کردیا۔

(۷)

غز ترکوں کی پذیرائی

۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) ہجری میں موحدین کے جاہ و جلال اور اہلِ کمال کی سرپرستی کا حال سن کر چند معزز اشخاص مصر سے یعقوب المنصور کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ لوگ ترکانِ غز میں سے تھے۔ ان میں سے چار آدمی علم و حکمت اور تدبیر و فراست میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک کا نام قاضی عماد الدین تھا اور ان کا تعلق مصری افواج سے رہا تھا۔ دوسرے کا نام قراقوش (یا قراقش) تھا، وہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے بھتیجے تقی الدین کا خادمِ بارگاہ رہ چکا تھا، تیسرے کا نام شعبان تھا وہ ایک کامل الفن شاعر، بلند پایہ ادیب اور نہایت نفیس مزاج آدمی تھا۔ چوتھے کا نام احمد الحاجب تھا۔ وہ بھی ایک صاحبِ کمال آدمی تھا۔ یعقوب المنصور نے ان کی شاندار پذیرائی کی اور ان کو اپنا مصاحب بنا لیا، وہ ان چاروں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا اور ان پر اس قدر مہربان تھا کہ الموحدین کے سرکردہ لوگ بھی ان پر رشک کرتے تھے۔ یعقوب المنصور نے موحدون کی طرح تمام ترکانِ غز کا بھی مستقل وظیفہ مقرر کر دیا لیکن موحدین اور ان میں یہ تخصیص تھی کہ اول الذکر کو چار ماہ کے بعد وظیفہ ملتا تھا لیکن ان ترکوں کو ہر ماہ وظیفہ ادا کر دیا جاتا تھا۔ خلیفہ کہا کرتا تھا کہ:

> ''میں ان لوگوں کو اس لیے الموحدون پر ترجیح دیتا ہوں کہ یہ غریب الوطن ہیں اور یہاں ان کے پاس تنخواہ کے سوا کوئی جائداد وغیرہ نہیں ہے جس پر بسر اوقات کر سکیں مگر الموحدون کے پاس جائداد اور اموال موجود ہیں اور ان کی معاش کا انحصار صرف تنخواہ پر نہیں ہے۔''

علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ بعد میں امیر المؤمنین یعقوب المنصور نے ترکانِ غز کو اتنے بڑے بڑے قطعات زمین عطا کیے جو الموحدون کے اعیان کے پاس بھی نہیں تھے۔ بالخصوص احمد الحاجب اربلی کو ایسی ایسی عمدہ زمینیں دی تھیں کہ خود خلیفہ کے اقرباء کے پاس بھی نہیں تھیں۔ اسی طرح شعبان کو اندلس میں بہت سے شاداب گاؤں بطور جاگیر عنایت کیے۔ ان کی سالانہ آمدنی نو ہزار دینار سے بھی زیادہ تھی۔

خلیفہ نے ان لوگوں کی قدردانی میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ انہیں قیمتی جائدادیں دینے کے علاوہ ان کی ماہانہ تنخواہیں بھی برقرار رکھیں اور ان تنخواہوں کی رقم اتنی زیادہ تھی کہ فوج کے بڑے بڑے افسروں کو بھی نصیب نہ تھی۔

مؤرخین نے یہ تصریح نہیں کی کہ یعقوب المنصور نے کونسی خدمت ان ترکانِ غز سے متعلق کی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ وہ اربابِ کمال میں سے تھے اور مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے کے علاوہ تلوار کے دھنی بھی تھے، خلیفہ کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ دولتِ موحدین کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اسی لیے اس نے ان کی قدردانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

(۸)

تینملل کی زیارت

اسی زمانے میں یعقوب المنصور تینملل کی زیارت کے لیے روانہ ہوا، الموحدون کو اس قصبے سے جذباتی وابستگی تھی کیونکہ اسی جگہ کو محمد بن تومرت نے تحریکِ موحدین کا مرکز بنایا تھا اور پھر اسی جگہ پیوندِ خاک ہوا تھا۔ یعقوب المنصور کے لیے اس قصبے

میں دوہری کشش تھی، ایک تو تحریکِ موحدین کا اوّلین مرکز اور اس کے بانی کا مدفن ہونے کی وجہ سے اور دوسرے یہ کہ خود اس کے باپ (ابو یعقوب یوسف) اور دادا عبدالمؤمن بن علی کی ہڈیاں بھی وہیں گڑی تھیں۔ تینملل کے سفر میں ترکانِ غز بھی اس کے ہمراہ تھے۔ تینملل پہنچ کر خلیفہ اور اس کے ہمراہی مسجد کے سامنے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اہلِ تینملل میں محمد بن تومرت کی ایک پیشگوئی بہت مشہور تھی، ایک مرتبہ اس نے اپنے رفقاء سے کہا تھا کہ

"تم میں سے جو کوئی زندہ رہا وہ دیکھ لے گا کہ ایک دن مصر کے امراء اس درخت کے سایہ میں آکر بیٹھیں گے۔"

ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ خلیفہ کے ساتھ جو لوگ درخت کے نیچے بیٹھے ہیں ان میں امراءِ مصر (ترکانِ غز) بھی ہیں تو وہ اپنے بانی اور امام کی پیشگوئی کے پورا ہونے پر فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے اور سارے گاؤں میں جشن کا سا سماں پیدا ہو گیا، ہر طرف سے تکبیروں کی صدائیں آنے لگیں اور قصبے کی عورتیں بڑے جوش و خروش سے دف بجاتی ہوئی خلیفہ کے استقبال کے لیے نکلیں اس وقت وہ بربری زبان میں یہ شعر پڑھ رہی تھیں۔

"ہمارے آقا مہدی نے سچ فرمایا تھا،
ہم شہادت دیتی ہیں کہ وہ امامِ برحق تھے۔"

یعقوب المنصور ان لوگوں کے جوشِ مسرت کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا تھا اور کہتا تھا، "یہ لوگ بڑے سادہ مزاج اور بھولے ہیں، مجھے تو ان باتوں میں کچھ نظر نہیں آتا، ایک ذراسی بات کو یہ لوگ خواہ مخواہ اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔"

بہر صورت اس نے ابنِ تومرت، عبدالمؤمن اور ابو یعقوب یوسف کی قبور کی زیارت کی، عبرت کے آنسو بہائے اور اہلِ تینملل پر انعام واکرام کا مینہ

برسا دیا۔ اس کے بعد اس نے مراکش کو مراجعت کی۔ اہلِ قصبہ نے اس کے ورودِ تینملل کو مدت العمر یاد رکھا۔

(۹)

اشاعتِ حدیث میں غیر معمولی انہماک

ابو یوسف یعقوب المنصور تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی جن مشکلات اور خطرات میں گھر گیا تھا، ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء کے اواخر تک اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ان سب پر قابو پالیا۔ اب وہ دلجمعی کے ساتھ دوسرے امورِ سلطنت کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا آغاز یوں کیا کہ نہایت زاہدانہ زندگی اختیار کرلی۔ موٹا جھوٹا لباس پہنتا، بالکل معمولی کھانا کھاتا اور احکامِ شریعت کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے علماء و صلحاء کی قدر افزائی کو اپنا معمول بنالیا، وہ مختلف بلاد و امصار کے اہلِ علم اور علومِ دینی کے طلبہ کو اپنے پاس بلاتا، ان سے اپنے لیے دعا کرواتا اور ان کو اس قدر انعام و اکرام دے کر رخصت کرتا کہ وہ فکرِ معاش سے بے نیاز ہو جاتے۔ اس کی معارف پروری اور داد و دہش کا شہرہ سن کر علماء اور طلبہ دُور دُور سے مراکش کا رُخ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی اس کے پاس آنے میں عار نہ سمجھتے تھے جنہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی اور جو عام حالات میں شاہی دربار اور سرکاری حُکام کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے۔ یعقوب المنصور کا سلوک ان لوگوں کے ساتھ ایسا منکسرانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا کہ وہ یہ محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ کسی بادشاہ کے پاس بیٹھے ہیں۔

مختلف مؤرخین نے یعقوب المنصور پر جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے،

کہ خلیفہ کو قرآن اور حدیث سے غیر معمولی شغف تھا اور وہ صدقِ دل سے چاہتا تھا کہ لوگ قرآن اور حدیث کے احکام کی سختی سے پابندی کریں اور خلافِ شرع رسوم سے مجتنب رہیں۔ علامہ عبدالواحد مراکشی نے اپنی کتاب "المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" میں لکھا ہے کہ یعقوب المنصور نے دربار سے وابستہ علماء اور محدثین کو حکم دیا کہ وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، مؤطا امام مالکؒ، سنن ابی داؤد، سنن نسائیؒ، سنن بزاز، مسند ابی شیبہ، سنن دارقطنی، سنن بیہقی فی الصلوٰۃ اور دوسری کتب احادیث سے طہارت کے بارے میں تمام احادیث جمع کریں۔ چنانچہ اس کے حکم کے مطابق ایسی تمام احادیث کا ایک مجموعہ بہت جلد تیار ہو گیا۔ امیر المؤمنین یعقوب المنصور خود وہ احادیث سب کو لکھواتے اور ان کے حفظ کی تاکید کرتے تھے۔ احادیث کا یہ مجموعہ المغرب (دولتِ موحدین) کے تمام اطراف میں پھیل گیا اور عوام و خواص سبھی نے اس کو حفظ کر لیا۔ جو لوگ تمام احادیث کو حفظ کر لیتے تھے، امیر المؤمنین ان کو بیش بہا لباس اور مال و زر انعام دیتے تھے۔ اس تمام کام سے ان کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ امام مالکؒ کے مذہب اور اثر و رسوخ کو سرزمینِ مغرب سے دور کر دیا جائے اور لوگوں کو قرآن مجید اور احادیث کے ظاہری معنوں کے اخذ کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

(مرابطین کے عہد میں فقہ مالکی کو مغرب میں زبردست فروغ حاصل ہوا تھا اس کے برعکس موحدین عقائد کے معاملہ میں بڑی حد تک اشعری تھے)

علمِ حدیث کی اشاعت میں یعقوب المنصور نے اس قدر انہماک ظاہر کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی، اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس نے "طہارت" کے موضوع پر احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کروایا تھا، یہ حدیثیں صرف جسمانی طہارت کے بارے میں نہیں تھیں بلکہ یہ ہر قسم کی طہارت سے تعلق رکھتی تھیں مثلاً طہارتِ نفس، طہارت

قلب، طہارتِ لباس، طہارتِ طعام، طہارتِ آب وغیرہ - اس طرح یہ بہت سے ایسے دینی مسائل پر بھی محیط تھیں جن کا بظاہر طہارت سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا - طہارت سے متعلق احادیث سے خلیفہ کی دلچسپی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دوسری احادیث کو اہمیت نہیں دیتا تھا - فی الحقیقت علمِ حدیث مجموعی طور پر اس کے نزدیک بڑی وقعت اور توقیر کا حامل تھا چنانچہ اس نے طلبۂ حدیث کے ساتھ حسنِ سلوک اور مہربانی کی انتہا کر دی تھی، ان پر اس نے اپنے خزانوں کے دروازے کھول رکھے تھے اور ان کے اکرام و اعزاز میں اس قدر مبالغہ کرتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو ان پر رشک آتا تھا - ایک دفعہ خلیفہ کے کانوں میں بھنک پڑی کہ موحدین میں سے بعض افراد طلبہ کی قدر و منزلت اور بادشاہ سے ان کے تقرب کی وجہ سے خار کھاتے ہیں چنانچہ ایک دن اس نے موحدین کے بہت سے اکابر اور زعماء کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر بڑے وقار اور جلال کے ساتھ کہا :

> "اے موحدین تمہارا تعلق مختلف قبائل سے ہے - جب تم پر کوئی افتاد آپڑتی ہے تو تم اپنے قبائل کی پناہ ڈھونڈتے ہو مگر یہ طلبۂ علمِ حدیث کسی خاص قبیلے کے نہیں ہیں بلکہ میرے ہیں، اگر ان پر کبھی کوئی مصیبت آئی تو ان کی حفاظت اور نصرت میرے ذمہ ہوگی، میں ہی ان کو پناہ دوں گا اور وہ خود کو مجھ سے ہی منسوب کریں گے -"

خلیفہ کی تقریر سے سبھی موحدین پر روشن ہو گیا، کہ اس کے نزدیک طلبۂ علمِ حدیث کا کیا درجہ ہے اور وہ ان کو کس قدر عزیز جانتا ہے - چنانچہ اس دن کے بعد انھوں نے بھی طلبہ کی تعظیم و تکریم کو اپنا شعار بنا لیا اور خلیفہ کی طرح ان کی خدمت اور قدردانی میں فخر محسوس کرنے لگے -

---

(۱۰)

اسلامی اندلس پر عیسائیوں کی یلغار

پیچھے ذکر آچکا ہے کہ ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں شنترین (SANTAREM) کے ناکام محاصرے کے دوران میں خلیفہ ابو یعقوب یوسف شدید زخمی ہو گیا تھا اور اشبیلیہ کے راستے میں فوت ہو گیا تھا اس سانحہ کے بعد یعقوب المنصور تختِ سلطنت پر بیٹھا لیکن وہ مغرب کی داخلی شورشوں اور دوسرے امور میں ایسا الجھا کہ پانچ سال تک اندلس کی طرف ذاتی توجہ نہ دے سکا۔ اگرچہ جزیرہ نمائے آئی بیریا (سپین و پرتگال) کے بیشتر علاقوں پر اس کے گورنر، قضاۃ اور دوسرے حکام اپنے فرائض انجام دیتے رہے لیکن اندلس سے اس کی مسلسل غیر حاضری اندلسی مسلمانوں کے لیے بڑی مضر ثابت ہوئی۔ اس دوران میں پرتگال اور قشتالیہ کے عیسائی حکمرانوں نے بڑی طاقت پکڑ لی اور مسلمانوں کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ یعقوب المنصور کو اندلسی عیسائیوں کی ترکتازیوں کی اطلاع ملی تو اس نے خود اندلس جا کر ان کو قرار واقعی سزا دینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں، ایک طرف تو اس نے اپنے بحری بیڑے میں اضافہ کر کے اس کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ عیسائیوں کے متحدہ بیڑے سے ٹکر لے سکے اور دوسری طرف اپنی بری افواج کی تعداد اور سامانِ حرب و ضرب میں اتنا اضافہ کر دیا کہ وہ بیک وقت اندلس اور مغرب میں دشمنوں سے نبرد آزما ہو سکیں، ابھی وہ ان تیاریوں میں ہی مشغول تھا کہ پرتگال کے بادشاہ سینکو اوّل (SANCHO-I) نے جنوبی ساحل کے مقام شلب (SILVES) پر چڑھائی کر دی۔ اس کو انگلستان اور فلیمنگ وغیرہ کے ان صلیبی جنونیوں

(CRUSADERS) کی مدد بھی حاصل تھی جو فلسطین کو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ سے لڑنے جا رہے تھے۔ عیسائیوں کی اس متحدہ فوج نے شلب کا محاصرہ کر لیا اور تین ماہ بعد ۲۰ رجب ۵۸۵ھ (۳ ستمبر ۱۱۸۹ء) کو اس شہر کو فتح کر کے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا۔ دوسری طرف قشتالیہ کے بادشاہ الفانسو ہشتم نے اسلامی اندلس کے بہت سے علاقوں پر حملہ کر دیا۔ اس نے القلعہ وادی آرا (ALCALADE GADAIRA) کلیسرا (CALASPARRA) رین (REINA) اور مغاسلہ (MAGACELA) وغیرہ کئی مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اندلس میں موجود موحدین کی فوجوں نے عیسائیوں کا زبردست مقابلہ کیا لیکن عیسائیوں کے دوطرفہ حملوں اور مجنونانہ جوش کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اگر وہ ایک جگہ سے عیسائیوں کو پیچھے ہٹاتے تو وہ دوسری طرف سے آگے بڑھ آتے۔ غرض حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے گئے۔ یعقوب المنصور بھی حالات پر کڑی نظر رکھ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے اندلسی صوبوں کے والیوں کو پیغام بھیجتا تھا کہ دشمن تمہارے گھروں میں گھس آیا ہے اور تم خواب خرگوش میں پڑے ہوئے ہو، ان دشمنان دین سے سر سے کفن باندھ کر لڑو ورنہ سزا پاؤ گے، وہ بیچارے بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ عیسائیوں کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن عیسائی اپنی کثیر تعداد اور بے پناہ ساز و سامان کی بدولت ان پر ایسا شدید دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ یعقوب المنصور خود اندلس کی طرف متوجہ ہو کیونکہ اندلس کے مسلمان اسی صورت میں بچ سکتے تھے۔

---

(۱۱)

یعقوب المنصور کی جوابی یلغار

۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء کے آغاز میں یعقوب المنصور نے اندلس کے غارت گر عیسائی حکمرانوں اور صلیبی جنونیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا اور ایک جرار لشکر اور مضبوط بحری بیڑے کا ساتھ اندلس کا رُخ کیا۔ قصر المجاز سے روانہ ہو کر اس نے پہلے جزیرۃ الخضرا (ALGECIRAS) میں قیام کیا اور اس کے بعد یکایک شنترین (SANTAREM) کے سامنے جا نمودار ہوا۔ یہ وہی شہر تھا جس کے زبردست دفاعی استحکامات نے چند سال پہلے مؤحدین کو محاصرہ اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ پرتگیزوں نے اب کی بار بھی سخت مزاحمت کی لیکن جذبۂ جہاد سے سرشار مؤحدین نے بہت جلد ان کے دفاعی انتظامات کو روند ڈالا اور فاتحانہ شہر میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد یعقوب المنصور برق رفتاری کے ساتھ شاہ قشتالیہ و لیون الفانسو ہشتم کی طرف پلٹا اور اسے پے بہ پے شکستیں دے کر اپنے تمام علاقے اس سے واپس لے لیے اور پھر اس پر ایسا شدید دباؤ ڈالا کہ وہ بلبلا اٹھا اور بڑی لجاجت کے ساتھ صلح کی درخواست کی۔ یعقوب المنصور نے اس کی درخواست قبول کر لی اور فریقین کے درمیان پانچ سال کے لیے اس شرط پر صلح ہو گئی کہ نہ الفانسو اپنے علاقے سے باہر قدم نکالے گا اور مسلمانوں پر حملہ کرے گا اور نہ مسلمان اس کے علاقے پر حملہ کریں گے۔

اس صلحنامہ پر دستخط کرتے وقت یعقوب المنصور کے ذہن میں یہ خیال بھی

کارفرما تھا کہ اس طرح وہ الفانسو کو پرتگال کے سینکو اوّل سے الگ تھلگ کردے گا اور اپنی طاقت مؤخر الذکر کی سرکوبی پر صرف کر سکے گا۔ سینکو نے صلیبی جنونیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر بڑے ستم ڈھائے تھے اور یعقوب المنصور کے دل میں اس کے خلاف سخت غصہ تھا۔ الفانسو سے صلح کے بعد اس نے اپنی تمام فوجیں ارکش (ARCOS) (DE LAFRONTERA) کے مقام پر جمع کیں اور وہاں سے بیک وقت پرتگیزوں کے تین قلعوں طورس نووس (TORRES NOVAS) تومر (TOMAR) اور شلب (SILVES) پر حملہ بول دیا۔ پرتگیزوں نے قلعوں کے دروازے بند کر لیے اور بڑی ثابت قدمی کے ساتھ پرجوش موحدین کی مزاحمت کی۔ ٹورس نووس کے محصورین کی قوتِ مدافعت تو جلد ہی جواب دے گئی اور انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر کے قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔ البتہ تومر اور شلب نے مزاحمت جاری رکھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ تومر کی حفاظت پرتگیزوں کے ساتھ صلیبی محارب ٹمپلرز بھی کر رہے تھے[1] ان لوگوں نے قلعے سے کئی بار باہر نکل کر موحدین کے لشکر پر شدید حملے کیے۔ اثنائے

---

[1] ٹمپلرز (TEMPLERS KINGHTS) ابتدا میں ایک مذہبی تنظیم تھی جس کی بنیاد ۱۱۱۸ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کا مرکز یروشلم (بیت المقدس) میں تھا اور اس کا مقصد یروشلم کے عیسائی زائرین کی حفاظت کرنا تھا، بعد میں یہ فوجی تنظیم کی صورت اختیار کر گئی۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ۱۱۸۶ء میں یروشلم کو مسخر کیا تو ان لوگوں نے (CYPRUS) کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اندلس کا رخ کیا اور کچھ لندن جا کر آباد ہو گئے۔ لندن کا یہ علاقہ آج بھی ٹمپل (THE TEMPLE) کے نام سے مشہور ہے اور وہاں ایک گرجا بھی ان سے منسوب ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اس تنظیم کا خاتمہ ہو گیا۔

محاصرہ میں بدقسمتی سے موحدین کے لشکر میں ایک وبائے عام پھوٹ پڑی اور سامانِ رسد کی قلت بھی ہوگئی ۔ خلیفہ نے مجبور ہو کر ان دونوں قلعوں کا محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا اور پیچھے ہٹ کر قرطبہ میں مقیم ہوگیا۔ اسی دوران میں پرتگیزوں نے دھاوا بول کر باجہ (BEJA) یبورہ (EVORA) اور کئی دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے مسلمان باشندوں کو بڑی بیدردی سے تہ تیغ کر ڈالا۔ یعقوب المنصور کو ان واقعات کا علم ہوا تو وہ سخت غضب ناک ہوا اور والئ قرطبہ کو ایک جرار لشکر دے کر پرتگیزوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ مؤرخین نے والئ قرطبہ کے نام کی تصریح نہیں کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یعقوب المنصور کا بھائی ابو یحییٰ تھا ۔ والئ قرطبہ طوفانِ برق و باد کی طرح پرتگیزوں کی طرف بڑھا اور انہیں تابڑ توڑ شکستیں دے کر باجہ ، یبورا، شبونہ وغیرہ تمام مقامات ان سے واپس لے لیے ۔ خلیفہ خود بھی آرام سے نہیں بیٹھا بلکہ اس نے ایک مضبوط فوج کے ساتھ دریائے تاجہ (TAGUS) کے جنوب میں واقع پرتگیزوں کے متعدد شہروں اور قلعوں پر یلغار کر دی اور یکے بعد دیگرے قصرابی دانس (ALCACER DOSOL) پلملہ (PALMELLA) اور المعدن (ALMADA) وغیرہ کو فتح کر لیا اور پھر ۲۵ جمادی الآخر ۵۸۷ھ (۱۰ جولائی ۱۱۹۱ء) کو اچانک شلب پر جا پڑا اور اس کو بزورِ تیغ فتح کر لیا۔ موحدین کی ان فاتحانہ یلغاروں نے پرتگیزوں کا کچومر نکال دیا اور وہ کئی سال تک سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔

علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ ۵۸۶ھ (۱۱۹۰ء) میں شلب کا محاصرہ ختم کر کے یعقوب المنصور واپس مراکش چلا گیا تھا ، اگر یہ بیان درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں خلیفہ نے دوبارہ مراکش سے اندلس آکر پرتگیزوں کی سرکوبی کی۔ بہر صورت ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں اس کی مہم کا مقصد پورا ہوگیا ۔

---

(۱۲)

مراکش کو واپسی اور شدید علالت

الفانسو ہشتم اور سینکو اوّل کی سرکوبی کے بعد ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں یعقوب المنصور نے مراکش کو مراجعت کی اور تقریباً چار برس تک مسلسل مراکش میں قیام کیا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ وہ سخت بیمار ہو گیا، طبیبوں نے علاج کی ہر تدبیر کی لیکن اس کا مرض بڑھتا گیا، اتفاق سے اس موقعہ پر اس کا بھائی ابو یحییٰ والیٔ قرطبہ بھی مراکش میں موجود تھا۔ اس نے خلیفہ کے مرض کی شدت دیکھ کر خیال کیا کہ بس اب وہ چند دنوں کا مہمان ہے، ادھر خلیفہ نے اسے بستر علالت سے حکم دیا کہ فوراً اندلس کو واپس جائے تاکہ وہاں کے حالات میں خلل نہ پڑے، ابو یحییٰ اس طمع سے کہ خلیفہ انتقال کر جائے تو وہ خلافت کا دعویٰ کرے، اندلس جانے میں حیلے بہانے سے پس و پیش کرتا رہا۔ خلیفہ کو جب ہوش آتا تو وہ یہی پوچھتا کہ "ابو یحییٰ اندلس کو روانہ ہو گیا ہے کہ نہیں؟" جب جواب نفی میں ملتا تو وہ تاکید کرتا کہ اس کے حکم کی بلا تاخیر تعمیل کی جائے۔ آخر ابو یحییٰ مجبور ہو گیا اور سمندر عبور کر کے اندلس پہنچ گیا لیکن اس کو پورا یقین تھا کہ خلیفہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ اس نے اندلس پہنچ کر وہاں کے بااثر شیوخ و اکابر پر غیر معمولی نوازشات کا مینہ برسا دیا اور ان کو باور کرایا کہ امیر المؤمنین کا وقت آخر آ پہنچا ہے ان کے انتقال کی خبر آج آئی کہ کل آئی۔ ان کے بعد خلافت کا حقدار مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ان لوگوں نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا اور ہوں ہاں کر کے اس کی دعوت کو ٹال دیا۔ ابو یحییٰ نے صرف قرطبہ ہی کے نہیں کئی دوسرے شہروں کے اکابر کو بھی اپنی خلافت پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ سب نے بلطائف الحیل

اپنا دامن بچا لیا۔ جب اہل مرسیہ تک نوبت پہنچی تو انہوں نے خلیفہ کو خطوط لکھ کر اس معاملے کی اطلاع دی۔ اس اثناء میں خلیفہ صحت یاب ہو گیا اور اطباء نے اسے آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا چنانچہ وہ ایک محافے میں بیٹھ کر فاس کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اسے ابو یحییٰ کی کارستانی کا علم ہوا تو وہ سخت غضبناک ہوا، ابو یحییٰ کو بھی خلیفہ کی صحت یابی کی خبر پہنچ گئی اور اہل اندلس کے خطوط اور عرضداشتوں کا بھی اسے علم ہو گیا، اب اس کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ خود خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عفوِ تقصیر کا خواہاں ہو چنانچہ وہ سمندر کو عبور کر کے شہر سلا میں یعقوب المنصور کی خدمت میں حاضر ہوا، خلیفہ اس وقت بہت سے امراء سلطنت کے درمیان بیٹھا تھا۔ ابو یحییٰ کو دیکھتے ہی اس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا:

"دیکھو وہ بدبخت آیا۔"

پھر اس نے حکم دیا کہ اس نابکار کو فوراً گرفتار کر لو چنانچہ اسے گرفتار کر کے محبوس کر دیا گیا۔ اس کے بعد خلیفہ نے اندلس کے اکابر و شیوخ کو بلا بھیجا۔ ان سب نے شہادت دی کہ ابو یحییٰ نے ان کو اپنی خلافت کی دعوت دی ـــ اس طرح جب ابو یحییٰ پر جرم ثابت ہو گیا تو اس نے ابو یحییٰ کو بلا کر کہا۔

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کے مطابق تمہارے قتل کا حکم دیتا ہوں کہ جب کسی سرزمین میں دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو جس نے خلافت کا ناجائز دعویٰ کیا وہ واجب القتل ہے۔"

چنانچہ خلیفہ کے حکم کے مطابق اس کے چچا عبدالرحمٰن بن یوسف بن عبدالمؤمن نے مجمع عام میں ابو یحییٰ کی گردن مار دی، پھر خلیفہ نے اس کے کفن دفن کا حکم دیا، اور اس دن کے بعد اپنے قرابت داروں سے ایسا سخت رویہ اختیار کیا کہ اس کی آئندہ زندگی میں کسی کو سر ابھارنے کا موقع نہ ملا حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنے

تمام اعزّہ واقارب سے نہایت فیاضانہ بلکہ برابری کا برتاؤ کرتا تھا۔

(۱۳)

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی سفارت

بعض مؤرخین نے، جن میں علامہ ابنِ خلکان کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، بیان کیا ہے کہ یعقوب المنصور کے ہم عصر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ والیٔ شام و مصر پر جس زمانے میں تمام یورپ کے صلیبی جنونیوں (THE CRUSADERS) نے چڑھائی کر رکھی تھی اس نے ایک سفارت ابوالحرث عبدالرحمٰن بن منقذ[1] کی قیادت میں یعقوب المنصور کے پاس بھیجی۔ اس سفارت کے ہاتھ سلطان صلاح الدینؒ نے جو خط یعقوب المنصور کے نام بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ ساری عیسائی دنیا نے متحد ہو کر ارضِ مقدس (فلسطین) پر ہلّہ بول دیا ہے۔ اگر آپ اس وقت اپنے جنگی جہاز مسلمانوں کی امداد کے لیے بھیجیں اور ساحلِ فلسطین کی حفاظت کے کام میں میرا ہاتھ بٹائیں تو صلیبی جنونیوں کو آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے۔ آپ کی یہ مدد گویا اسلام کی مدد ہوگی۔

---

[1] ابوالحرث عبدالرحمٰن کا تعلق شیزر کے حکمران خاندان بنو منقذ سے تھا۔ ابتدائی صلیبی جنگوں کا نامور مجاہد امیر مؤید الدولہ اسامہ بن مرشد بھی اسی خاندان سے تھا اور ابوالحرث عبدالرحمٰن اسی کے اخلاف یا اقارب میں سے تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر اور نہایت ذہین اور قابل شخص تھا۔ شرفِ خاندانی اور قابلیت کے لحاظ سے وہ بجا طور پر اس سفارت کی قیادت کا اہل تھا جو یعقوب المنصور جیسے فاضل اور باجبروت فرمانروا کے دربار میں بھیجی گئی۔

اس خط میں سلطان صلاح الدین نے یعقوب المنصور کو "امیر المؤمنین" کے بجائے "امیر المسلمین" کے لقب سے مخاطب کیا تھا کیونکہ اس کے نزدیک امیر المؤمنین کے خطاب کا مستحق صرف عباسی خلیفۂ بغداد ہی تھا یعقوب المنصور کو یہ طرزِ خطاب ناگوار گزرا تاہم اس نے بظاہر سفارت کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور جب قائدِ سفارت نے اس کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا تو اس نے اس کے صلہ میں ابن منقذ کو چالیس ہزار درہم بطور انعام عطا کیے لیکن جس مقصد کے لیے سفارت آئی تھی یعقوب المنصور نے اس کے پورا کرنے سے معذرت کر دی۔

یہ سفارت یعقوب المنصور کے پاس کب پہنچی، اس کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بعض نے مراکش میں اس کا سالِ ورود ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء لکھا ہے اور بعض نے ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے مقالہ "ابنِ رُشد" میں اس روایت پر یہ حاشیہ آرائی کی ہے:

> "منصور بالطبع نہایت فخر پسند اور جاہ طلب تھا، یورپ نے بیت المقدس کو جب مسلمانوں کے ہاتھ سے چھیننا چاہا اور اس ارادہ سے یورپ کے ہر حصے سے فوجوں کا بادل اٹھ کر بیت المقدس کی طرف بڑھا تو صلاح الدین نے منصور کے پاس قاصد بھیجا کہ یہ اسلام کی حمایت کا وقت ہے۔
> منصور ہر طرح اعانت دینے کے قابل تھا اور اعانت دینا بھی چاہتا تھا لیکن اتنی بات پر برہم ہو گیا کہ صلاح الدین نے خط میں اس کو امیر المؤمنین کے لقب سے مخاطب نہیں کیا تھا۔"

اسی قسم کے خیالات کا اظہار مولانا عبدالسلام ندوی نے "حکمائے اسلام حصۂ دوم" (ترجمہ ابنِ رُشد) میں کیا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ یعقوب المنصور کس حد تک فخر پسند (فختار) اور جاہ پسند تھا، یہ بات محلِ نظر ہے کہ یعقوب المنصور نے محض امیر المؤمنین مخاطب نہ کیے جانے پر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو امداد نہ بھیجی، اس ضمن میں یہ بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ یعقوب المنصور اس زمانے میں کس قسم کے حالات سے دوچار تھا۔

اگر اس سفارت کا زمانہ ۵۸۵ھ / ۱۱۸۹ء تسلیم کیا جائے تو اس وقت اندلس میں عیسائیوں نے مسلمانوں پر قیامت ڈھا رکھی تھی اور یعقوب المنصور بڑی سرگرمی کے ساتھ ان کے خلاف تیاریوں میں مصروف تھا، ظاہر ہے کہ سینکو اور الفانسو جیسے طاقتور دشمنوں کے لیے اس کو خود ایک مضبوط بحری بیڑے کی ضرورت تھی چہ جائیکہ اس کا ایک حصہ الگ کر کے وہ اس کو کمزور کر دیتا۔

اگر یہ سفارت اس کے پاس ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں پہنچی تو یہ وہ زمانہ تھا جب وہ اندلس میں لڑائیوں کے ایک طویل سلسلے سے فارغ ہو کر مراکش کو لوٹا تھا۔ ان لڑائیوں میں دشمن کے بیڑوں سے کئی خوفناک بحری ٹکریں بھی شامل تھیں۔ ایسی لڑائیوں میں طرفین کا کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہوتا ہے۔ تو یہ بات کوئی غیر اغلب نہیں کہ یعقوب المنصور کا بحری بیڑا متعدد بحری لڑائیوں کے بعد اس قابل نہ رہا ہو کہ سلطان صلاح الدین کی مدد کر سکے۔ پھر موحد فرمانروا کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ ہمیشہ ایک طاقتور بحری بیڑا اپنے پاس رکھے کیونکہ اندلسی عیسائیوں کے بحری بیڑے ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ مسلمانوں کے جہازوں کو نقصان پہنچائیں یا شمالی افریقہ اور اندلس کے ساحلوں پر واقع اسلامی شہروں پر چھاپے ماریں۔ اس کے علاوہ یورپ کے صلیبی جنونیوں کی جنگی کشتیاں بھی ساحلِ اندلس اور ساحلِ شمالی افریقہ کے درمیان سمندر میں آئے دن گشت لگاتی رہتی تھیں، ان سب کی مؤثر روک تھام کی ضمانت ایک طاقتور اسلامی بیڑا ہی دے سکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہی بات پیشِ نظر رکھ کر یعقوب المنصور نے سلطان صلاح الدینؒ

کو بحری کمک بھیجنے سے معذوری کا اظہار کیا ہو۔ یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ یعقوب المنصور کے زمانے کے سب سے قریبی مؤرخ علامہ عبدالواحد مراکشی نے اس سفارت کا مطلق ذکر نہیں کیا اور بہت سے دوسرے مشہور مؤرخین بھی اس کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک روایت ایسی بھی ملتی ہے جو ابن خلکان کے بیان سے یکسر مختلف ہے۔ اس روایت کے مطابق سلطان صلاح الدین ایوبی نے یعقوب المنصور کے دربار میں ایلچی بھیجے اور یہاں سے سلطان کی مدد کے لیے ایک سو اسی جہاز بھیجے گئے۔ (دیکھئے تاریخ اسلام جو جناب محمود الحسن صدیقی صدر شعبۂ تاریخ اردو کالج کراچی اور مولانا چراغ حسن حسرت نے ڈاکٹر ریاض الاسلام پی ایچ ڈی، ریڈر ان ہسٹری کراچی یونیورسٹی کی مدد سے لکھی اور جسے سلور برڈٹ کمپنی۔ نیویارک نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا) اس روایت کا ماخذ بیان نہیں کیا گیا لیکن باور کرنا چاہیے کہ یہ کسی قدیم تاریخ سے اخذ کی گئی ہوگی۔ ان متضاد روایتوں کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ واللہ اعلم بالصواب۔

اب رہی یعقوب المنصور کی فخاری اور جاہ طلبی تو وہ ایک خاص دائرے کے اندر محدود تھی ورنہ بالعموم وہ بڑا سادہ مزاج، منکسر المزاج اور پابند شریعت حکمران تھا، اس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

(۱۴)

الفانسو (ادفنش) کی باسی کڑھی میں اُبال

۵۹۱ھ / ۱۱۹۰ء میں اس پانچ سالہ صلح نامے کی میعاد ختم ہوگئی جو ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء میں یعقوب المنصور اور الفانسو ہشتم (ادفنش) شاہ قشتالیہ دلیون کے مابین قرار پایا تھا۔ ان پانچ سالوں میں الفانسو زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف رہا اور اتنا کثیر لشکر اور سامانِ حرب و ضرب جمع کرلیا جو کسی بڑی سے بڑی سلطنت سے ٹکر لینے کے لیے کافی تھا، چنانچہ صلح کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ اشبیلیہ اور بعض دوسرے مسلم علاقوں پر ٹوٹ پڑا اور قتل و غارت کا بازار گرم دیا، اس کی فوج میں بہت سے صلیبی رضاکار بھی شامل ہوگئے تھے جو کوہ پرنیز کے پار سے آئے تھے، یہ لوگ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے، انھوں نے الفانسو کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ایسے مظالم ڈھائے کہ انسانیت اور شرافت سر پیٹ کر رہ گئی [1]

یعقوب المنصور کو ان حالات کی اطلاع ملی تو اس نے بھی اعلانِ جہاد کر دیا۔ اور اندلسی عیسائیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک زبردست فوج تیار کی جمادی الاخریٰ ۵۹۱ھ / ۱۱۹۵ء میں اس نے یہ فوج ساتھ لے کر سمندر عبور کیا اور سیدھا اشبیلیہ میں جا

---

[1] اس سلسلے میں علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان حیران کن ہے وہ لکھتے ہیں کہ "۵۹۰ھ میں امیر المومنین (یعقوب) نے وہ عہد توڑ دیا جو ان کے اور ادفنش کے مابین تھا۔ اس کے جواب میں ادفنش کے سواروں نے نکل کر بلاد کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا اور تمام اندلس میں کثرت سے شر و فساد پھیلایا۔" اس بیان کے برعکس دوسرے تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ صلح نامے کی میعاد ختم ہونے کے بعد لڑائی کی ابتداء الفانسو کی طرف سے ہوئی تھی۔

کر قیام کیا۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ خلیفہ نے اشبیلیہ کے مختصر قیام میں لشکر کو پھیلا دیا اور اموال تقسیم کیے۔ اس کے بعد اس نے الفانسو سے نبرد آزما ہونے کے لیے مورادل (MURADAL) کی تنگ گھاٹی کا رُخ کیا جہاں عیسائی افواج نے مورچے قائم کر رکھے تھے۔ اس مرتبہ الفانسو نے اتنا کثیر التعداد لشکر جمع کیا تھا کہ اس سے پہلے موحدون کو کبھی اتنی ضخیم فوج کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ الفانسو نے اپنی جنگی تیاریوں کو صلیبی لڑائیوں کی طرح مذہبی جہاد (HOLY WAR) قرار دے کر ہر قسم کی امداد و اعانت یورپی اور اندلسی عیسائیوں سے حاصل کر لی تھی! ور اندلس اور قریبی ملکوں کے تمام عیسائی فرمانروا اور بااثر امراء اپنی فوجوں کے ساتھ الفانسو کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔

سید امیر علی نے "مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب" میں لکھا ہے کہ "الفانسو نے تمام عیسائی دنیا سے فوجیں منگوا کر ایک بھاری لشکر جمع کر لیا تھا۔ بعض مؤرخین نے اس اس لشکر کی تعداد کا اندازہ چار لاکھ کے قریب لگایا ہے جبکہ یعقوب المنصور کی فوج چالیس ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی۔"

(۱۵)

معرکۂ الارک

(The Battle of Alarcos)

۸ شعبان ۵۹۱ھ (۱۸ جولائی ۱۱۹۵ء) کو باڈاجوز (بطلیوس) کے قریب نہر وادی انا (GUADIANA) اور پوبلیٹ (POBLETE) کے درمیان واقع ایک ناہموار میدان میں الفانسو ہشتم اور یعقوب المنصور کے درمیان وہ خونریز جنگ لڑی گئی جو تاریخ میں "جنگ الارک" کے نام سے مشہور ہے[1] اور دنیا کی چند اہم ترین لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔

---

[1] "الارک" ایک چھوٹے سے قلعے کا نام تھا جو میدانِ جنگ کے قریب ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا تھا۔ اسی کی نسبت سے اس لڑائی کا نام جنگِ الارک مشہور ہوگیا۔ آج کل اس قلعے کا نام "سانتا ماریا دا الارکو" (SANTAMARIA DE ALARCAS) ہے اور یہ سپین کے ایک ضلع کلتراوالاویئرا (CALATRAVA LA VIEJA) میں سوادری ال (CIUDAD REAL) سے سات میل جنوب مغرب میں ایک چوٹی پر واقع ہے۔

علامہ عبدالواحد مراکشی نے المعجب میں مقامِ جنگ کا نام "فحص الجدید" لکھا ہے تاہم انہوں نے لڑائی کے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ الارک کی لڑائی سے کلّی مشابہت رکھتے ہیں۔ فی الحقیقت فحص الجدید اور الارک کی لڑائی ایک ہی ہے۔ شاید اس زمانے میں اس مقام کو "فحص الجدید" بھی کہتے ہوں۔ علامہ مراکشی نے اس لڑائی کی تاریخ ۳ شعبان ۵۹۱ھ لکھی ہے۔ (بروز چہارشنبہ)۔

کہا جاتا ہے کہ غنیم کی زبردست جمعیت اور سازوسامان کو دیکھ کر موحدین میں سے بعض لوگ کچھ مرعوب سے ہو گئے لیکن یعقوب المنصور نے ان کی ہمت بندھائی اور کہا کہ لڑائی کا فیصلہ فوج کی قلت یا کثرت یا سامانِ جنگ پر نہیں ہوتا۔ اگر تم میں قوتِ ایمانی موجود ہے اور تمہارا عزم راسخ ہے تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دشمن پر غالب کرے گا۔

خود خلیفہ کا یہ حال تھا کہ برابر دعا میں مصروف تھا اور علماء و صلحاء سے بھی تکرار کہتا تھا کہ حق تعالیٰ سے مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دعا مانگو۔

عیسائی لشکریوں کے جوش اور غضب کا یہ عالم تھا کہ وہ بار بار کہتے تھے "ہم مسلمانوں کو پیس کر رکھ دیں گے اور اندلس میں ان کا نام و نشان تک نہ چھوڑیں گے"۔ چنانچہ مسلمانوں کا مقدمۃ الجیش (ہراول) جونہی ان کی زد میں آیا، ان کی ایک زبردست جمعیت اس پر اچانک ٹوٹ پڑی۔ مقدمۃ الجیش کی قیادت یعقوب المنصور کا وزیر ابویحییٰ ابوبکر بن عبداللہ بن ابی حفص عمر اینتی کر رہا تھا۔ اس نے بڑی جوانمردی اور استقامت کے ساتھ عیسائیوں کے تند و تیز حملے کو روکا اور جب تک کمک نہ پہنچ گئی وہ میدانِ جنگ میں ڈٹا رہا یہاں تک کہ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گیا لیکن اس کا خونِ شہادت رائیگاں نہ گیا۔ یعقوب المنصور نے خود، جذبۂ جہاد سے سرشار اپنی فوج کے چند مضبوط دستوں کو ساتھ لے کر عیسائی لشکر کے ایک بازو پر ایسا خوفناک حملہ کیا کہ غنیم کی صفیں ابتر ہو گئیں، عیسائیوں کا قلبِ لشکر اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے بڑھا تو یعقوب المنصور اپنے جاں نثاروں کے ساتھ اس پر ایسا ٹوٹ کر گرا کہ دُور دُور تک عیسائیوں کی لاشیں بچھا دیں اور ان کو حواس باختہ کر دیا، خلیفہ کو اس سرفروشانہ انداز میں لڑتے دیکھ کر بربری مجاہدین از خود رفتہ ہو گئے اور انہوں نے پے بہ پے اپنے تباہ کُن حملوں سے عیسائیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ الفانسو نے اپنی

فوج کو بہت سنبھالا اور اس کی فوج کے بہت سے دستوں نے سرفروشی کا حق ادا بھی کیا لیکن جوں جوں لڑائی طول کھینچتی گئی ان کی قوت مقاومت جواب دیتی گئی، رہی سہی کسر گرمی اور پیاس نے نکال دی اور وہ نہایت افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح الفانسو کو ایسی زبردست شکست ہوئی کہ جنگِ زلاقہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ مسلمان مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں ایک لاکھ چھیالیس ہزار عیسائی مارے گئے، تیس ہزار گرفتار کر لیے گئے۔ ڈیڑھ لاکھ خیمے، چار لاکھ گدھے، ایک لاکھ خچر، اسی ہزار گھوڑے اور ستر ہزار مختلف وضع کے زرہ بکتر مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ ان کے علاوہ زر و جواہر اور بیش قیمت ساز و سامان کا کوئی حساب ہی نہ تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ مالِ غنیمت کی کثرت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک غلام ایک درہم پر، تلوار نصف درہم پر، گھوڑا پانچ درہم پر اور گدھا ایک درہم پر فروخت ہوا۔ ہر مجاہد کے حصے میں اتنا کثیر مالِ غنیمت آیا کہ وہ آسودہ حال ہو گیا۔ مالِ غنیمت کی اس فراوانی سے آسانی کے ساتھ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ الفانسو نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے کیسی مکمل اور عظیم الشان تیاریاں کی ہوں گی[1]

علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ:

"یہ لڑائی ایک بلا تھی جو اذفنش (الفانسو) اور اس کے ہمراہیوں پر نازل

---

[1] بعض عیسائی مؤرخین نے مسلمانوں کی فتح کی اہمیت کو ہلکا کرنے کے لیے لکھا ہے کہ اس دور کے ایک نامور عیسائی شہسوار پیڈرو فرنیڈیز دی کاسترو (PEDRO FERNADEZ DE CASTRO) نے اپنے خاص سواروں کے ایک دستے کے ساتھ یعقوب المنصور کی مدد کی تھی کیونکہ وہ الفانسو ہشتم کا سخت دشمن تھا، اس نے خلیفہ کو بہت سے مفید مشورے بھی دیئے۔ اگر یہ روایت درست بھی ہو پھر بھی مسلمانوں کی کامیابی کی اہمیت برقرار رہتی ہے کیونکہ سواروں کا ایک دستہ الفانسو کی خوفناک جنگی قوت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

ہوئی، وہ خود اور اس کے صرف تیس سالارانِ فوج جان بر ہوئے، باقی
سب فنا ہو گئے۔"

اگرچہ علامہ مراکشی کے اس بیان میں یقیناً مبالغہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عیسائیوں کو زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور ان کے صرف چند ہزار سپاہی اور افسر جانیں بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکے۔ مسلمانوں کے بھی بہت سے آدمی شہید ہوئے (گو ان کی تعداد کو عیسائیوں کے مقتولین کی تعداد سے کوئی نسبت نہ تھی) ان میں وزیرِ سلطنت ابو یحییٰ ابوبکر بن عبداللہ انیتی کے علاوہ موحّدین کے متعدد دوسرے اعیان بھی شامل تھے۔

الفانسو نے الارک میں شکست کھا کر اپنے بچے کھچے سپاہیوں کے ساتھ ریاح یا کلٹرِدہ (CAMPÒ DE CALATRAVA) کے قلعے میں پناہ لی اور اسے خوب مضبوط کر لیا۔ (بروایتِ دیگر اس نے الارک ہی کے قلعے میں پناہ لی) یعقوب المنصور نے ایک زبردست یلغار کر کے نہ صرف اس قلعے پر بلکہ اس کے نواح میں پانچ اور اہم مقامات پر بھی قبضہ کر لیا۔ الفانسو کی سب تدبیریں خاکِ نامرادی میں مل گئیں تو وہ طلیطلہ (TOLEDO) کی طرف بھاگ گیا۔

---

(۱۶)

جشنِ فتح

معرکۂ الارک میں ابو یوسف یعقوب کی عظیم الشان فتح نے جہاں تمام عالم اسلام میں مسرت کی لہر دوڑا دی وہاں مسیحی دنیا (فرانس، اٹلی، برطانیہ وغیرہ) میں الفانسو کی ذلت انگیز شکست سے صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس لڑائی میں خلیفہ یعقوب نے بہترین حربی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا جرنیل ہے۔

اس عظیم الشان کامیابی پر اس کو بھی بے پناہ مسرت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ عیسائیوں کی ہزیمت کے بعد وہ بے اختیار سجدے میں گر گیا اور دیر تک سربسجود رہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا ——— الارک کے خونریز معرکے سے فارغ ہو کر امیر المومنین یعقوب نے مظفر و منصور اشبیلیہ کو مراجعت کی اور اپنے تعمیر کروائے ہوئے قلعہ حصن الفرج کے محلات میں قیام کیا۔[1]

---

[1] یعقوب المنصور کو تعمیرِ عمارات کا بہت شوق تھا۔ شلب کی فتح (۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء) کے کچھ عرصہ بعد اس نے حکم دیا کہ اشبیلیہ کے قریب "الشرف" (AJCRAFE) کے سب سے بلند اور تنگ مقام پر (دریا کے کنارے) ایک قلعہ تعمیر کیا جائے اور اس کے اندر چند خوبصورت محل اور قبے بنائے جائیں۔ یہ قلعہ اور محل تیار ہو گئے تو اس نے قلعہ کا نام حصن الفرج رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے شعراء نے اس قلعہ اور اس کے محلات کی تعریف میں قصیدے لکھے اور خلیفہ سے گرانقدر انعام پایا۔

اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب) کے مطابق ابو یوسف یعقوب نے اسی جگہ فتح اَلارک کی یادگار کے طور پر "المنصور باللہ" کا اعزازی لقب اختیار کیا۔

علامہ عبدالواحد مراکشی نے "المعجب" میں لکھا ہے کہ جب امیر المؤمنین ابو یوسف یعقوب ۵۹۱ھ میں فحص الجدید (اَلارک) کی زبردست جنگ سے واپس آئے تو انہوں نے "حصن الفرج" کے قبوں میں سے ایک میں بیٹھ کر وفود کو باریابی سے سرفراز ہونے کی اجازت دی — ان وفود میں امراء، غرباء، علماء، فضلاء اور شعراء ہر قسم کے لوگ شامل تھے اور وہ سب اپنے طبقات اور مراتب کے مطابق دربارِ شاہی میں باریاب ہوئے۔ یہ گویا ایک قسم کا دربارِ عام تھا جو معرکۂ اَلارک کی فتح کی خوشی میں منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر بہت سے شعراء نے بڑے پُرزور قصائد لکھے تھے جو انہوں نے دربار میں پڑھ کر سنائے اور خلیفہ سے معقول انعام پایا۔

ان قصیدوں میں علی بن حزمون کے قصیدے نے بڑی شہرت پائی۔ یہ قصیدہ اس نے ایک عجیب وغریب بحر "خبب" میں کہا تھا اور اس کے کئی ابیات بڑے نفیس تھے [1]

امیر المؤمنین اور دوسرے تمام حاضرین نے اس قصیدہ کو بہت پسند کیا وہ قصیدہ یہ ہے:۔

۱۔ حیّتک معطرة النفس نفحات الفتح باندلس

[1] علامہ مراکشی نے ابن حزمون کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ ادبیات میں اعلیٰ دستگاہ رکھتا تھا اور نہایت اچھا شاعر تھا، اس کو ہجو گوئی میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا لیکن اس میں وہ اکثر فحش بیانی سے کام لیتا تھا۔

۲۔ قدر الكفار وما تبعهم — انّ الاسلام لفي عرس
۳۔ امام الحق وناصره! — طهّرت الارض من الدنس
۴۔ وملأت قلوب الناس هدی — فدنا التوفيق لملتمس
۵۔ ورفعت منار الدين على — عمد شُمٍّ وعلى اسس
۶۔ وصدعت رداء الكفر كما — صدع الديجور سنا قبس
۷۔ لاقيت جموعهم فغدوا — فرسا في قبضة مفترس
۸۔ جاءوك تضيق الارض بهم — عدد المحصىٰ لملتمس
۹۔ خرجوا بطراً ورئاء الناس — ليختلسوا مع مختلس
۱۰۔ ومضيت لامر الله على — ثقة بالله ولم تخس
۱۱۔ فاناخ الموت كلاكله — بظباك على بشر رجس
۱۲۔ وتساوى القاع بها منهم — المرفض مع الحذب الضرس
۱۳۔ سقيت بنجيعهم اكم — وطئوا منهن على دهس
۱۴۔ فاولئك حزب الكفر الا — ان الكفار لفي نكس
۱۵۔ اذ ذوي الصلبان وراءكم — خيل الملك الخبرا لندس
۱۶۔ لو ان البحر تناولها — جرعا وطئته على يبس
۱۷۔ ولو ان الصُّم تراجمها — اضحت كحلا لمقل لنعس
۱۸۔ ملا التوحيد اعنتها — واغار بها روح القدس
۱۹۔ نهضت فمضت فقضت املا — الني عتب الدنيا فلنسی
۲۰۔ جاست جنبات الكفر فلم — تترك لهم ما لم تحبس
۲۱۔ لم يبق بها مثوىٰ رجل — الا وعليه شذىٰ فرس
۲۲۔ لحقوا القرون الشمّ فلا — سقيا نظلولهم الدرس

۲۳۔ ان کان غباد فنشهم — فالی عیش نکد تعس
۲۴۔ نظر الملک الاعلی مرای — مدکما بین قنا وقسی
۲۵۔ کالصبح توشح رونقه — کاسطور بنور الله کسی
۲۶۔ فمضی لم یلو علی احد — ورمی بالدرع وبالترس
۲۷۔ تصلیل الهند بمفرقه — لا یسمع صلصلة الجرس
۲۸۔ سهر الموتور وارقة — تذکار المنصل والمرس
۲۹۔ وبکاء عقائل هاتفة — کالورق یحن مع الغلس
۳۰۔ برزت وکان ذوا شبها — اذ ناب رواحة شمس
۳۱۔ ترلنو کظباء الرمل علی — وجل تضراغمة شرس
۳۲۔ قد کن مها انس فغدت — تحت الرایات بلا انس
۳۳۔ ان الایام قد ازدهرت — کالروض بروق لمغترس
۳۴۔ وتناسقت الامال لنا — کالثغر تنظم فی لعس
۳۵۔ وتلالأ نور الحق علی — الاثر المهدیة فاقتبس
۳۶۔ اجزیرة اندلس اعتصمی — بامام الامة واحترسی
۳۷۔ ارعاک حراسته ملک — جبریل له احد الحرس
۳۸۔ حکمت اسیافک سیدنا — فی کل مصر الکفر مسی
۳۹۔ ومضت فی الروم مضاربها — وکذلک تفعل فی الفرس
۴۰۔ لا یخلف ربک موعده — دوخ اقطارهم ودرس

ترجمہ: (۱) فتح اندلس کی عطر لپٹیں آپ کو مبارکباد دیتی ہیں۔

(۲) کفار کو اب قدر (عافیت) معلوم ہوئی ہے، ان کا ماتم یہ ہے کہ اسلام مسرت اور ابتہاج کے عالم میں ہے۔

(۳) اے حق کے امام اور اس کے مددگار، آپ نے زمین کو میل سے پاک کر دیا۔
(۴) آپ نے لوگوں کے دلوں کو ہدایت سے معمور کر دیا ہے اور اب توفیقِ الٰہی تلاش کرنے والے کے قریب ہو گئی ہے۔
(۵) آپ نے دین کے مَنارے کو بلند ستونوں اور مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا ہے۔
(۶) آپ نے کفر کی چادر کو اس طرح پھاڑ دیا ہے جس طرح ایک شعلے کی روشنی تاریکی کو پھاڑ دیتی ہے۔
(۷) آپ نے ان کی جمعیتوں کا مقابلہ کیا اور ان کی ایسی گت بنائی جیسے گردن توڑنے والے شکاری کے ہاتھ میں شکار ہو۔
(۸) جب وہ آئے تھے تو یہ حالت تھی کہ زمین ان کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی اور ان کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ اس کا شمار ہی نہ ہو سکتا تھا۔
(۹) وہ اکڑتے اور اینڈتے ہوئے نکلتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ لڑنے مرنے جا رہے ہیں۔
(۱۰) آپ اللہ کا امر قائم کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کو اللہ پر بھروسا تھا اور آپ مایوس اور غمگین نہیں تھے۔
(۱۱) موت نے اپنے سینے کو آپ کی تلواروں کی دھاروں کے ساتھ ایک ناپاک آدمی پر رکھ دیا۔
(۱۲) ان کی کھوپڑیاں اس میدان میں اور اس وسیع، پتھریلی اور گھاس والی وادی میں پھیل گئیں۔
(۱۳) پشتہ ہائے زمین ان کے خون سے سیراب ہو گئے جہاں وہ نرم زمین پر (اکڑ اکڑ کر) چل رہے تھے۔
(۱۴) وہ لوگ کافر دشمن ہیں بے شک کفار عاجز ہیں۔

(۱۵) اے صلیب بردارو! تمہارے پیچھے ایک ہوشیار اور زیرک بادشاہ کے سوار ہیں۔

(۱۶) اگر وہ لوگ سمندر کو ایک گھونٹ کر کے پی جاتے تو پھر اس کو خشک کر کے اس پر چلتے۔

(۱۷) اگر وہ پہاڑ پر سنگباری کرتے تو وہ خواب آلود آنکھوں کا سرمہ بن جاتا۔

(۱۸) ان کی باگوں میں توحید بھری ہوئی ہے اور روح القدس اس کو جلدی جلدی چلا رہے ہیں۔

(۱۹) وہ اٹھے، چلے اور انہوں نے امید کو پورا کر دیا، دنیا کی سختی کو بھلا دیا اور وہ بھلا دی گئی۔

(۲۰) انہوں نے کفر کے پہلوؤں کو اس طرح پامال کیا کہ ان کے لیے کوئی شے پامال کرنے کے لیے باقی نہ رہی۔

(۲۱) وہاں کسی شخص کا مکان ایسا نہ رہا جس پر گھوڑوں کی مکھیاں نہ بھنکتی ہوں۔

(۲۲) وہ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا پہنچے اور ان کے پر لگنے اور مٹے ہوئے آثار میں پانی تک نہ چھوڑا۔

(۲۳) اگر ان کا اوفنش بچ بھی گیا ہے تو اسے ایک پُر صعوبت اور تنگ زندگی گزارنی پڑے گی۔

(۲۴) شاہِ بلند منزلت نے نظر اٹھا کر دیکھا تو نیزوں اور کمانوں کے درمیان فرشتوں کو پایا۔

(۲۵) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح نے اس کو چمکا دیا ہے۔ گویا کہ کوہِ طور اللہ کے نور سے جگمگا رہا ہے۔

(۲۶) وہ وہاں سے اس طرح چلا کہ کسی کی طرف مڑ کر نہ دیکھتا تھا۔ اس نے زرہوں اور ڈھالوں پر وار کرنے شروع کر دیئے۔

(۲۷) اذفنش کو اپنے سر پر ہندی شمشیر کے پڑنے کی وجہ سے گھنٹیوں کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

(۲۸) ہلاکت رسیدہ کو تیروں کے سوفاروں اور رسیوں کے تصور نے

(۲۹) اور ان شریف زادیوں کی گریہ وزاری نے جگائے رکھا جو کبوتریوں کی طرح آخرِ شب کی تاریکی میں نوحہ کر رہی تھیں۔

(۳۰) اور ریگستان کے ہرنوں کی طرح ڈر ڈر کر

(۳۱) خونخوار شیروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

(۳۲) وہ محبت اور پیار کی بچھیریاں تھیں مگر جھنڈوں کے نیچے ان کا انس جاتا رہا (وہ وحشت زدہ ہوگئیں)

(۳۳) بے شک ایام اس طرح تر و تازہ ہوگئے ہیں جس طرح کوئی باغ اپنے لگانے والے کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔

(۳۴) اور امیدیں ہمارے لیے اس طرح روشن اور آراستہ ہوگئی ہیں جیسے لبہائے لعلین کے درمیان دانت خوبصورتی سے آراستہ ہیں۔

(۳۵) نورِ حق مہدیت کے نشان پر چمک رہا ہے اس سے نور حاصل کرلو۔

(۳۶) اے جزیرہ نمائے اندلس تو امامِ اُمت کی پناہ میں آجا اور مضبوط ہوجا۔

(۳۷) ایک ایسا بادشاہ تیرا نگہبان ہوتا ہے جس کے نگہبانوں میں سے ایک حضرت جبریلؑ بھی ہیں۔

(۳۸) اے ہمارے آقا آپ کی تلواروں نے تمام سخت کافروں اور اللہ کی نعمتوں کو بھول جانے والوں پر حکم بنایا ہے۔

(۳۹) ان کی دھاروں کی کاٹ روم اور فارس پہنچ چکی ہے۔

(۴۰) آپ کا رب اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا، ہاں ان کے ملکوں

کو تاخت و تاراج اور پامال کر دیجئے۔

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا، ایک نامور عالم ابو بکر بن ہانی (جو اندلس کے شہر جیان کے رہنے والے تھے) خلیفہ کو مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ اہل شہر نے خلیفہ سے گفتگو کرنے کے لیے انہیں منتخب کیا، اس نے ان سے پہلے شہر، قضاۃ، ولاۃ اور عُمّال کے بارے میں سوالات کیے۔ جب وہ جواب دے چکے تو اس نے ان کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے خلیفہ کا شکریہ ادا کیا اور اس کی درازیٔ عمر کی دعا کی پھر خلیفہ نے پوچھا۔ "آپ نے کون کون سے علوم حاصل کیے ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "میں نے امام (یعنی ابن تومرت) کی تالیفات پڑھی ہیں۔"

اس پر خلیفہ برہم ہو گیا اور اس نے بڑے تیز لہجے میں کہا:

"طالب علم یوں نہیں کہا کرتے، آپ کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ میں نے کتاب اللہ پڑھی ہے اور کچھ حدیث بھی پڑھی ہے۔ اس کے بعد آپ نے جو جو کچھ پڑھا ہے اس کا ذکر کریں۔"

ابو بکر بن ہانی کو خلیفہ کی غیرتِ دینی پر بڑا تعجب ہوا اور اپنے جواب پر سخت ندامت محسوس ہوئی۔

علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ اسی (دربارِ عام والے) دن امیر المؤمنین نے حکم دیا کہ تمام فوج پورے ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر ان کے سامنے حاضر ہو۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق تمام فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر ان کے سامنے پھیل گئی، یہ ایک عجیب پُر شکوہ منظر تھا۔ فوج کی سج دھج اور ہتھیاروں کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ امیر المؤمنین اس منظر سے اتنے متأثر ہوئے کہ فوراً کھڑے ہو کر دو رکعت نماز بطور شکرانہ ادا کی۔ اتفاق سے وہ جونہی رکوع و سجود سے فارغ ہوئے ایک ملکہ ابر نمودار ہوا اور اس قدر بارش ہوئی کہ سب لوگ بھیگ گئے۔ اس موقع

پر ابو الربیع سلیمان بن عبداللہ بن عبدالمؤمن کے کاتب خصوصی ابو عبداللہ محمد بن عبدربہ نے فی البدیہہ یہ اشعار کہے :

بادی الکرامۃ بل بادی الکرامات
قد شفع اللہ آیات بآیات
یالیت شعری ما شیئ دعوت بہ
قبل السلام و من بعد التحیات
شیئ تاثر عنہ الجو فاتصلت
من السحائب رایات برایات
من کل وطفاء لقاء الرباب ھمت
ماءً نقیا علی زغم لنقیات
قل کیف لا یفتح اللہ البلاد وقد
تفتحت لک ابواب السماوات

مطالب : اے کرامت نما بلکہ کرامات نما تحقیق اللہ تعالیٰ نے نشانیوں کو نشانیوں سے باہم ملا دیا ہے۔

اے (قوم) کاش مجھے معلوم ہوتا کس چیز سے میں نے دعا کی ہے۔ سلام سے پہلے اور التحیات یعنی تشہد کے بعد۔

وہ ایک چیز ہے جس سے فضاء متاثر ہوئی ہے پھر بادلوں کے جھنڈوں سے بادلوں کے جھنڈے مل گئے ہیں۔

زمین سے قریب گھنی بدلی نے صاف ستھرا پانی برسانے کا قصد کیا ہے۔

کہہ دو اللہ تعالیٰ شہروں کو کیسے نہیں کھولے گا (فتح کرے گا) درآنحالیکہ تیرے لیے تمام آسمانوں کے دروازے کھل گئے ہیں۔

(۱۷)

الفانسو کا جوشِ انتقام

الارک کی شرمناک شکست سے الفانسو ہشتم نے کچھ عبرت حاصل نہ کی۔ اس کے برعکس وہ جوشِ انتقام میں پاگل ہو گیا، عرب مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے غم و غصہ میں سر اور ریش کو منڈوا ڈالا اور صلیب کو اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک لاکھوں عیسائی مقتولوں کا مسلمانوں سے بدلہ نہ لے لوں گا، فرش پر نہ سوؤں گا، گھوڑے کی سواری نہ کروں گا اور ہر قسم کے عیش و آرام کو حرام سمجھوں گا۔ اس کے بعد وہ طلیطلہ (TOLEDO) جا کر زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے قریبی جزائر اور عیسائی ممالک سے تازہ دم فوجیں فراہم کیں، ان کے لیے بے حد و حساب سامانِ حرب و ضرب جمع کیا اور خوراک کا بھی اتنا ذخیرہ کر لیا جو طویل عرصے تک کافی ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائی پادریوں نے پورے یورپ میں گھوم کر مذہبی جہاد (HOLY WAR) کے لیے ایک مرتبہ پھر لوگوں کو ابھارنا شروع کر دیا۔ ان کے وعظ سے متاثر ہو کر بہت سے صلیبی جنونی بھی الفانسو کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ الفانسو نے طلیطلہ کے قلعہ اور شہر کی فصیلوں کو مضبوط کر کے اپنی طرف سے ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔

اس طرح وہ مسلمانوں سے دوبارہ پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہو گیا۔

---

(۱۸)

یعقوب المنصور کی طوفانی یلغار

الارک کی فتح کے بعد خلیفہ یعقوب المنصور کئی ماہ تک اشبیلیہ میں مقیم رہا۔ اس دوران میں اس کو الفانسو کی جنگی تیاریوں کی خبریں مسلسل ملتی رہیں۔ چنانچہ اس کو یقین ہو گیا کہ جب تک اس سانپ کا سر ہمیشہ کے لیے نہیں کچل دیا جاتا، مسلمانوں کو اس کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا، اب وہ بھی جوش غضب میں بے قرار ہو گیا اور الفانسو کی سرکوبی کے لیے بڑی سرگرمی سے فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ ۵۹۱ھ (۱۱۹۶ء) کے موسم بہار میں وہ طوفان بلاخیز کی طرح ان علاقوں کی طرف بڑھا جن کو عیسائی جنگجوؤں نے اپنا گڑھ بنا رکھا تھا، اس یلغار میں اس نے منتا لیس (MADNATANCHEZ) ترجالہ (TRUJILLO) شنت قردش یا سانتا کروز (SANTA CRUZ) اور کئی دوسرے شہروں پر آناً فاناً بزور شمشیر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے دریائے تاجہ کی وادی کو طلبیرہ (TALAVERA) کے علاقے تک روند ڈالا۔ نومبر ۱۱۹۶ء میں وہ یلغار کرتا ہوا طلیطلہ کے سامنے جا پہنچا اور اس شہر کا نہایت سختی سے محاصرہ کر لیا۔ الفانسو نے مسلمانوں کی شدید مزاحمت کی، جوں جوں محاصرہ طول پکڑتا گیا، یعقوب المنصور کی آتش غضب بھڑکتی گئی۔ اس نے طلیطلہ کے نواحی علاقے میں تمام درختوں کو کاٹ دیا۔ اہل شہر کو اشیائے خورد و نوش پہنچنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے اور بلاناغہ مسلسل حملوں سے اہل شہر کو سخت زِچ کیا، جب اس پر بھی انہوں نے ہتھیار نہ پھینکے تو اس نے منجنیقوں

اور قلعہ شکن توپوں کی مار سے شہر اور قلعہ کی دیواروں میں جگہ جگہ شگاف ڈال دیئے۔ اب اہلِ شہر اور الفانسو میں مزید مزاحمت کی تاب نہ رہی اور انہوں نے اپنے پرچم سرنگوں کر دیئے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ شہر پر مسلمانوں کا اقتدار تسلیم کرتے ہیں۔ اس وقت الفانسو کی ضعیف العمر ماں ابھی زندہ تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ حریف فتح پا گیا ہے تو اس کو اپنے بیٹے دوسرے اہلِ خاندان و اہلِ شہر کی جانوں کی فکر پڑ گئی۔ یہی خیال تھا کہ کسی طرح ان کو مسلمانوں کی تلواروں کا لقمہ بننے سے بچا لوں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ کسی طرح فاتح بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہو جائے۔ شاہی خاندان کی یہ دیرینہ سال خاتون جس نے کبھی اپنے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا حالات کے سامنے بے بس ہو گئی۔ اس نے الفانسو کی بیوی اور بیٹیوں کو ساتھ لیا اور یعقوب المنصور کی قیام گاہ کا رخ کیا، بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ الفانسو نے خود انہیں فاتح بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔

(۱۸)

یعقوب المنصور کی عالی ظرفی

الفانسو کے شاہی گھرانے کی عورتیں یعقوب المنصور کی خدمت میں کس طرح حاضر ہوئیں۔ اس کا نقشہ جسٹس سید امیر علی نے اپنی کتاب "مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب" میں یوں کھینچا ہے:

"الفانسو کی دیرینہ سال ماں نے جب دیکھا کہ دشمن فتح پا گیا ہے تو ایک دم اس پر حیرت کا عالم طاری ہو گیا، آخر کار کچھ بن نہ آیا تو شرم و حیا کے برقع کو پھاڑ حرم سرا سے نکلی، آگے آگے کچھ خواجہ سرا پیچھے

پیچھے الفانسو کی بیوی اور لڑکیاں، جگر غم سے داغ داغ اور کلیجے صدمات سے چاک چاک، دلوں میں آہیں مگر منہ سے دعائیں دیتی بادشاہ (یعقوب المنصور) کے سامنے آئی اور کہا، اے بادشاہِ بلند اقبال، اس چراغِ سحری کی التجا ہے کہ میرے بیٹے اور اہلِ شہر کی جان بخشی کر۔"

یعقوب المنصور کے دل میں الفانسو کے خلاف سخت غصہ تھا لیکن ان عورتوں کی آہ وزاری سے اس کا قہر و غضب سرد پڑ گیا اور عفو و درگزر کا جذبہ اس پر غالب آگیا۔ اس موقع پر اس نے بے مثال عالی ظرفی سے کام لیا، ان خواتین کا بے حد اعزاز و اکرام کیا، ان کی دلجوئی کی، ڈھارس بندھائی اور نہ صرف ان کی استدعا کو شرفِ قبولیت بخشا بلکہ ان کو بیش قیمت زیورات، زر و جواہر اور دوسرے تحائف دے کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ اس کے بعد اس نے طلیطلہ پر غالب اور متصرف ہونے کے باوجود شہر الفانسو کے حوالے کر دیا اور صرف وہی مالِ غنیمت اپنے پاس رکھا جو میدانِ جنگ میں حاصل ہوا تھا۔ اس قضیہ سے فارغ ہو کر اس نے مظفر و منصور قرطبہ کی جانب مراجعت کی۔ طلیطلہ کی جنگ سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کی مقدار اتنی وافر تھی کہ یہ ایک مہینہ تک لشکریوں میں تقسیم ہوتا رہا۔ اسی اثناء میں الفانسو نے اپنے سفیر اقرارِ اطاعت اور عہدنامہ کی تحریر و تکمیل کے لیے یعقوب المنصور کے پاس بھیجے، یہ سفارت قرطبہ میں حاضر ہوئی اور فریقین میں دس سال کے لیے معاہدۂ صلح طے پا گیا۔ تاہم خلیفہ کے پاس جو تیس چالیس ہزار عیسائی قیدی تھے، اس نے ان کو رہا نہ کیا کیونکہ وہ آئے دن شورشیں برپا کرتے رہتے تھے (کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بہت سے قیدیوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا) بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یعقوب المنصور نے ان قیدیوں کو مراکش بھیج کر آباد کرا دیا۔

اور ان کو ایک الگ قبیلے کی صورت دے دی۔

(۱۹)

غیر دینی علوم کے خلاف مہم

اگرچہ یعقوب المنصور اپنی حکومت کے آغاز ہی سے قرآن اور حدیث کے احکام کی ترویج میں کوشاں تھا لیکن اس نے فلسفہ، منطق، حساب اور دوسرے علوم الفروع کے خلاف سرکاری سطح پر کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ ۵۹۲ھ / ۱۱۹۶ء میں اس کے قیام قرطبہ کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کو سخت مشتعل کر دیا اور اس نے فلسفہ، منطق، طب، نجوم وغیرہ تمام علوم الفروع کے خلاف زبردست مہم شروع کر دی۔ اس کا پس منظر عبدالواحد مراکشی، ابن ابی اصیبعہ صاحب طبقات الاطباء اور بعض دوسرے مؤرخین نے یہ بیان کیا ہے کہ بعض لوگوں نے خلیفہ کو یہ اطلاع دی کہ قاضی القضاۃ ابوالولید ابن رشد نے ارسطو اور بعض دوسرے قدماء فلاسفہ کی کتابوں کی جو تلخیص یا شرح کی ہے اس میں الحاد اور بے دینی کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس الزام کے ثبوت میں انہوں نے ابن رشد کی لکھی ہوئی کتابیں خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ خلیفہ نے یہ کتابیں پڑھیں تو اس نے تمام اعیان سلطنت اور سربرآوردہ علماء کو جمع کیا اور پھر ابن رشد کو بلا بھیجا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو اس نے یہ کتابیں اور ان کے قابل اعتراض حصے انہیں دکھا کر پوچھا، کیا یہ تمہارے لکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ یہ فلاسفۂ قدیم کے خیالات ہیں جو میں نے نقل کیے ہیں۔ لیکن خلیفہ نے یہ عذر تسلیم نہ کیا اور کہا، جس شخص کی یہ تحریر ہے اس پر خدا کی لعنت ہو، پھر اس نے حاضرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اس پر لعنت بھیجیں۔ اس کے بعد اس نے ابن رشد

کو جلا وطن کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ فرمان جاری کر دیا کہ لوگ علوم الفروع کے حاصل کرنے سے اجتناب کریں اور ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی نہ کریں جن میں قرآن اور حدیث کو دین سے الگ کر دیا گیا ہو۔ اگر کوئی شخص ان علوم میں سے کسی کے متعلق ذرا بھی گفتگو کرتے ہوئے سنا جائے تو اس سے یکسر قطع تعلق کر لیا جائے۔

علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ بعد میں فلسفہ، منطق وغیرہ کی تمام کتابیں بادشاہ کے حکم سے نذرِ آتش کر دی گئیں۔ چنانچہ ابن حبیب کی "واضحۃ" ابن ابی زید کی "نوادر" اور اس کا خلاصہ، سحنون کی "مدونہ" البرذاعی "کتاب التہذیب" اور اسی قسم کی بے شمار دوسری کتابیں آگ کے حوالے کر دی گئیں۔ چونکہ بادشاہ نے ایسی کتابوں کا پڑھنا بلکہ ان کا اپنے گھر میں رکھنا بھی قابلِ تعزیر جرم قرار دیا تھا اس لیے لوگ گٹھوں کے گٹھے ان کتابوں کے لاتے تھے اور آگ میں پھینک دیتے تھے[1] فلسفی اور کلامی علماء یعقوب المنصور کے نزدیک ملحد اور بے دین تھے چنانچہ اس نے

---

[1] یعقوب المنصور کا والد ابو یعقوب یوسف بھی علم الفروع کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس نے کبھی کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ بظاہر علماء فلسفہ کی سرپرستی کرتا رہا۔ اس کے اصل خیالات کا اندازہ اس کے عہد کے ایک نامور عالم حافظ ابوبکر بن جد کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ایک دفعہ میں ابو یعقوب کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے سامنے ابن یونس کی کتاب رکھی ہوئی تھی انہوں نے مجھ سے کہا "ابوبکر میں اس کتاب میں وہ تمام مختلف النوع آراء دیکھ رہا ہوں جو دینِ حق میں نمودار ہو گئی ہیں، آپ نے کوئی ایسا مسئلہ بھی دیکھا ہے جس میں چار یا پانچ یا اس سے بھی زیادہ آراء نہ ہوں، آخر ان میں سے کونسی رائے درست اور قابلِ قبول ہے، میں نے ان کے جواب میں کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا کہ ابوبکر آخر جو کچھ بھی ہے وہ یا تو (قرآن مجید کی طرف اشارہ کر کے) یہ ہے یا (اپنے دائیں جانب سنن

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس قسم کے تمام علماء کو اپنے دربار سے نکال دیا، یہ سلسلہ دو تین سال تک جاری رہا۔ فلسفہ کے شبہ میں جن علماء پر اس کا عتاب نازل ہوا ان میں ابن رشد، ابوجعفر ذہبی، ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم، قاضی بجایہ ابوالربیع الکفیف، ابوالعباس الحافظ الشاعر القرابی جیسے سرآمد روزگار علماء کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کو جلاوطن (یا شہر بدر) کر دیا گیا۔

علامہ عبدالواحد مراکشی اور کئی دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ یعقوب المنصور نے قیام قرطبہ میں جب بعض علماء کو فلسفی ہونے کے شبہ میں دربار سے نکالا تو اس کے بعد اس نے ایک فرمان لکھوا کر تمام ملک میں شائع کرایا جس میں اس واقعہ کا پس منظر بیان کر کے لوگوں کو حکم دیا گیا تھا کہ فلسفہ کی کتابیں جلا ڈالیں۔ اس فرمان کی ابتدائی عبارت یہ تھی :-

"قد كان في سالف الدهر قوم خاضوا في بحور الاوهام و اقر لهم عوامهم بشفوف عليهم في الافهام حيث لا داعي يدعوا الى الحي القيوم ولا حاكم يفصل بين المشكوك فيه والمعلوم فخلدوا في العالم صحفا ما لها من خلاق مسودة المعاني والاوراق بعدها من الشريعة بعد المشرقين و

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابوداؤد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہے یا (تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ان کے بائیں ہاتھ کو رکھی ہوئی تھی) یہ ہے" ابویعقوب یوسف نے یہ خیالات رکھتے ہوئے بھی ان کی ترویج کے لیے کبھی کوئی سخت قدم نہ اٹھایا اور ہر خیال کے علماء سے نباہ کرتا رہا۔ البتہ اس کے بعد یعقوب المنصور نے علوم فلسفہ منطق وکلام وغیرہ کے خلاف کھل کر عملی اقدامات کیے۔

اتبانیہا تبائن الثقلین یولہمون ان العقل میزانہا والحق برہانہا وہم یتشعبون فی القضیۃ الواحدۃ فرقا ویسیرون فیہا شوا کل وطرقا الخ

اس فرمان کو یعقوب المنصور کے کاتب ابو عبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن بن عیاش نے نہایت مسجع ومقفیٰ عبارت میں لکھا اس لیے اس کا لفظی ترجمہ کرنا ممکن نہیں مختصراً اس کا مفہوم یہ تھا کہ

"قدیم زمانے میں کچھ ایسے لوگ تھے جو وہم کے پیرو تھے لیکن لوگ ان کی عقلی اور دماغی صلاحیتیں دیکھ کر ان کا احترام کرنے لگے۔ ان لوگوں نے اپنے خیالات کے مطابق کتابیں لکھیں جو شریعت سے اس قدر دور تھیں جس قدر مغرب سے مشرق دور ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی بعض لوگوں نے جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں، ان لوگوں کی تقلید میں کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں اگرچہ جگہ جگہ آیاتِ قرآنی درج ہیں لیکن ان کی تحریروں کی تہہ میں الحاد اور بے دینی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ لوگ اسلام کے لیے اہلِ کتاب سے بھی زیادہ ضرر رساں تھے، ان لوگوں کی گمراہ کن تحریروں کا زہر تمام ملک میں پھیلنے لگا، ہم نے بڑے صبر اور ضبط کے ساتھ ان کی نیش زنی کو برداشت کیا لیکن ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے، یہ لوگ وضع قطع اور زبان کے لحاظ سے تو مسلمان تھے لیکن ان کا باطن سچے مسلمانوں سے مختلف تھا۔ جب ہمیں ان کی خلافِ شریعت باتوں کا علم ہوا تو ہم نے ان کو جلا وطن کر دیا۔ تم لوگ اس مارِ آستیں فرقے سے اس طرح ڈرو جس طرح لوگ زہر سے ڈرتے ہیں اور جو شخص ان کی کوئی کتاب پائے اس کو نذرِ آتش کر دے۔ اللہ تعالیٰ ملحدوں

کے گرد و غبار سے تمہارے ملک کو پاک وصاف کر دے۔"

علامہ عبدالواحد مراکشی، ابن ابی اصیبعہ (صاحب طبقات الاطباء) اور بعض دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ فلسفہ و منطق کی کتابیں جلانے، بعض علماء کو جلا وطن کرنے اور محولہ بالا فرمان جاری کرنے کے واقعات ۵۹۲ھ/۱۱۹۶ء اور ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء کے درمیانی عرصے میں پیش آئے۔

علامہ مراکشی کہتے ہیں کہ میں کتابیں جلائے جانے والے زمانہ میں شہر فاس (Fez) میں تھا، میں نے دیکھا کہ کتابوں کے پشتارے کے پشتارے چلے آتے ہیں اور ان کو رکھ کر آگ لگا دی جاتی ہے[1]

علامہ موصوف نے اپنے بیان میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ بادشاہ (یعقوب المنصور) نے طب، نجوم اور حساب کی ان کتابوں کو جلائے جانے سے مستثنیٰ کر دیا جن سے رات دن کے اوقات اور قبلہ کی سمت معلوم کی جاتی ہے۔

یعقوب المنصور نے صرف فرمان جاری کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس نے ایک خاص محکمہ اس مقصد کے لیے قائم کیا کہ فلسفہ اور منطق وغیرہ کی کتابیں ہر جگہ سے جمع کی جائیں اور جلا دی جائیں، اس محکمہ کا افسر اعلیٰ حفید ابوبکر بن زہر تھا۔

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب "طبقات الاطباء" میں اس ضمن میں یہ روایت درج کی ہے:

---

[1] علامہ عبدالواحد مراکشی کا سال پیدائش ۵۸۱ھ ہے وہ حصول تعلیم کی غرض سے نو برس کی عمر میں فاس گئے اور وہاں چند سال مقیم رہ کر علوم دینی کی تحصیل کی گویا علامہ موصوف کا فاس میں زمانۂ قیام ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء سے شروع ہوتا ہے اسی زمانے میں انہوں نے کسی وقت کتابیں جلنے کا مشاہدہ کیا۔

"یعقوب المنصور نے ارادہ کیا تھا کہ منطق و حکمت کی کوئی کتاب اپنے ملک میں باقی نہ رہنے دے اور اس نے بہت سی کتابوں کو آگ میں جلا کر برباد بھی کر دیا، اس نے نہایت سختی کے ساتھ یہ حکم دیا تھا کہ کوئی شخص منطق کو پڑھنے پڑھانے نہ پائے، اگر کوئی شخص اس علم میں مشغول پایا جائے گا یا اس علم کی کوئی کتاب اس کے پاس پائی جائے گی، تو اس کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جب اس نے اس کام کو شروع کیا تو یہ خدمت حفید ابوبکر بن زہر سے متعلق تھی۔"

علامہ ابنِ ابی اصیبعہ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ فلسفہ اور منطق وغیرہ کی کتابوں کی بربادی یعقوب المنصور کو دل سے پسند نہ تھی۔ اس نے یہ سب کچھ عوام کے دباؤ سے مجبور ہو کر کیا تھا کیونکہ اندلس کے بیشتر مسلمانوں میں علم الفرع سے سخت نفرت پائی جاتی تھی۔ ابوبکر بن زہر چونکہ خود فلسفہ و منطق وغیرہ کا قدردان تھا اس لیے اس کو ان علوم کی کتابیں جمع کرنے کی خدمت سپرد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح کچھ نہ کچھ کتابیں محفوظ رہ جائیں گی۔ چنانچہ علامہ ابنِ ابی اصیبعہ لکھتے ہیں کہ:

"خلیفہ کا مقصد یہ تھا کہ ابنِ زہر کے پاس منطق و حکمت کی کتابیں اگر ہوں گی تو وہ ظاہر نہ ہونے پائیں گی اور اس کی نسبت یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ ان کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتا ہے اور ان کی وجہ سے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔"

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے مقالہ "ابن رشد" میں ابنِ ابی اصیبعہ کے حوالے سے اس موضوع پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے:

"منصور نے یہ سب کچھ کیا لیکن وہ خود فلسفہ دان اور فلسفہ پرست

تھا، اس لیے فلسفہ کی یہ تباہی اور بربادی اس کو دل سے گوارا نہ ہو سکتی تھی تدبیر یہ اختیار کی کہ اس محکمہ کا افسر حفید ابوبکر بن زہر کو مقرر کیا جو خود بہت بڑا فلسفہ کا شیدا تھا۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ابوبکر بن زہر کے حال میں لکھا ہے کہ اس سے منصور کی غرض یہ تھی کہ ابوبکر بن زہر کے پاس فلسفہ اور منطق کی جو کتابیں آئیں گی وہ برباد ہونے سے محفوظ رہ جائیں گی۔ ابن زہر نے تمام کتب فروشوں کے پاس حکم بھیج دیا کہ فلسفہ کی جس قدر کتابیں موجود ہوں فوراً یہاں بھیج دی جائیں اور جو لوگ فلسفہ کی تحصیل میں مصروف ہوں، ان کو سزا دی جائے ابن زہر کا حکم منصور کا حکم تھا اس لیے ضرور اس کی تعمیل ہوئی ہوگی لیکن ابن زہر نے ان کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا اس کا فیصلہ تم خود کر سکتے ہو۔

قاصد رقیب بودہ دمن غافل از فریب
بیدرو مدعائے خود اندرمیانہ ساخت

عام لوگ اس نکتہ کو نہ سمجھے لیکن اشبیلیہ میں ایک شخص رہتا تھا جو ابن زہر کا پرانا دشمن اور حاسد تھا اس نے اس مضمون کا ایک محضر تیار کیا کہ ابن زہر خود فلسفہ کا بڑا حامی ہے اور اس کے گھر میں اس فن کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں جو رات دن اس کے مطالعہ میں رہتی ہیں محضر پر بہت سے لوگوں کے دستخط کرائے اور منصور کے پاس بھیجا۔ منصور نے محضر کو پڑھ کر حکم دیا کہ عرضی دہندہ قیدخانہ میں بھیج دیا جائے، وہ گرفتار ہوا اور تصدیق کرنے والے ڈر کے مارے روپوش ہو گئے۔ منصور نے لوگوں سے کہا، اگر سارا اندلس جمع ہو کر شہادت دے تب بھی میں ابن زہر کی نسبت کسی قسم کی بدگمانی نہیں کر سکتا۔"

علامہ شبلیؒ آگے چل کر لکھتے ہیں :

"منصور نے جو کچھ کیا صرف ایک حکمتِ عملی تھی جس سے ایک فوری ہنگامہ کا فرد کرنا مقصود تھا۔"

یعقوب المنصور کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو فلسفہ پرست کہنا بڑی زیادتی ہے۔ وہ ساری عمر قرآن و حدیث کی اشاعت میں مصروف رہا اور فلسفیانہ موشگافیوں سے ہمیشہ اپنا دامن بچاتا رہا۔ ہاں وہ فلسفہ دان ہو سکتا ہے لیکن اس کے بارے میں بھی علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ :

"امیر المؤمنین یعقوب عمر کے آخری سالوں میں قرطبہ سے مراکش واپس آکر فلسفہ کی تحصیل کی طرف راغب ہوا اور اس سلسلہ میں اس نے اپنی سابقہ حکمتِ عملی ترک کر دی۔"

اگر یعقوب المنصور کی "فلسفہ پرستی" کے حق میں یہ دلیل دی جائے کہ اس نے جن علماء کو فلسفی ہونے کے جرم میں جلاوطن یا قید کر دیا تھا، بعد میں ان کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ انعام و اکرام سے بھی نوازا[1] تو اس معافی کی حقیقت یہ ہے کہ ان علماء پر فلسفی ہونے کے ناتے سے الحاد کا جو الزام لگایا گیا تھا یا جو دوسرے

---

[1] اس ضمن میں ابن رشد اور ابوجعفر ذہبی کا خاص طور پر نام لیا جاتا ہے۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کے بیان کے مطابق خلیفہ منصور نے ابن رشد کو رہا کرنے کے بعد اس پر احسانات کیے۔ ابوجعفر ذہبی کے بارے میں علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ رہائی کے بعد وہ خلیفہ کی طرف سے اطباء اور طلبہ کے انسپکٹر مقرر کیے گئے۔ خلیفہ ان کی نسبت کہا کرتا تھا کہ ابوجعفر خالص سونے کی مانند ہے۔ پگھلانے سے اس کا جوہر اور زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

(حکمائے اسلام جلد اوّل از مولانا عبدالسلام ندویؒ)

فاسد عقائد ان سے منسوب کیے گئے تھے، وہ ان سے بری الذمہ قرار دیئے گئے اور یہ ثابت ہوا کہ وہ اتہام طرازی کا ہدف بنے تھے۔ گویا ان کی عفوِ تقصیر کا سبب خلیفہ کی "فلسفہ پرستی" نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ ان لوگوں کا تعلق "فلسفہ" سے ثابت نہیں ہو سکا تھا۔

اب رہی یہ بات کہ یعقوب المنصور دل سے فلسفہ کو پسند کرتا تھا اور اس نے محض لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے فلسفہ اور منطق وغیرہ کی کتابیں جلانے کا حکم دیا تھا تو یہ بھی محض قیاس آرائی ہے۔ یعقوب المنصور بڑے مضبوط کردار کا مالک تھا۔ ہم یہ گمان نہیں کر سکتے کہ اتنا اہم اور ملک گیر فیصلہ کرتے وقت اس نے منافقت سے کام لیا ہو۔ فی الحقیقت فلاسفۂ قدیم کی کتابوں میں ایسے فقرے ضرور موجود تھے جو دینی نقطۂ نظر سے سخت قابلِ اعتراض اور گمراہ کن تھے مثلاً ایک فقرہ تھا۔ "زہرہ بھی مختلف خداؤں میں سے ایک خدا ہے۔" ایک اور فقرہ تھا "افلاک قدیم اور ازلی ہیں۔ خدا نے ان کو نہیں پیدا کیا بلکہ صرف ان کی حرکت کا خالق ہے" وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ ابنِ رشد اور بعض دوسرے علماء نے ان فقروں کو اپنی کتابوں میں من و عن نقل کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یعقوب المنصور کے نزدیک ان کی یہ حرکت ناقابلِ برداشت تھی کیونکہ وہ قدیم عقائد پر کاربند تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں کا اثر قبول کریں۔ یہی سبب تھا کہ اس نے غیر دینی علوم کی بیشتر کتابوں کو تلف کروا دیا۔ تاہم علوم الفروع کے خلاف اس کا یہ جوش و خروش زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اور تین چار سال بعد اس نے میانہ روی اختیار کر لی۔

---

(۲۰)

ایک اور یلغار

۵۹۳ھ / ۱۱۹۷ء میں یعقوب المنصور نے مسیحی علاقوں پر ایک اور مجاہدانہ یلغار کی اور میڈرڈ (مجریط) (MADRID) القلعۃ النہر (ALCALA DE HENARES) اسکولنیا، سلامنیکا اور کئی دوسرے شہر اور قلعے فتح کرتا ہوا وادی الحجارہ (GUADAL JARA) تک پہنچ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مہم میں وہ عیسائی علاقوں میں اتنی دُور تک چلا گیا جہاں تک کوئی مسلمان فرمانروا اس سے پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ اس یلغار کے آغاز سے پہلے اس نے خطوط بھیج کر مملکت کے ہر حصے سے علماء اور صلحاء کی ایک بڑی جماعت اپنے پاس بُلالی تھی۔ لشکر روانہ ہوا تو سب سے آگے ان کو رکھا۔ (ہراول کے فوجی دستوں کے عقب میں) اثنائے سفر میں وہ ان سے وقتاً فوقتاً ملاقات کرتا اور دعا کرواتا، پھر اپنے قریب کے اصحاب سے جماعت صلحاء کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔ "لشکر یہ ہے نہ کہ ہماری فوج"۔ اس مہم سے فارغ ہو کر وہ واپس اشبیلیہ (یا قرطبہ) آیا اور کچھ عرصہ بعد مراکش کو معاودت کی۔

علامہ مراکشی کا بیان ہے کہ الفانسو سے اس کا دس سالہ معاہدۂ صلح اس دوسری مہم کے بعد ہوا لیکن بعض دوسرے مؤرخین کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ طلیطلہ کی فتح کے بعد قرطبہ میں طے پایا۔

---

(۲۱)

مراکش کو واپسی

اندلس میں تقریباً چار سال قیام کے بعد یعقوب المنصور مراکش واپس آیا تو اس وقت اس کی شہرت اور عظمت کے چار دانگ عالم میں ڈنکے بج رہے تھے اور دولت موحدین کے جاہ و جلال کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔

مراکش پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ یہودی مسلمانوں کے لباس میں مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی سازشوں اور شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے حکم دیا کہ المغرب کے تمام یہودی النسل لوگوں کے لیے ایک مخصوص لباس مقرر کیا جائے۔ جس سے ان کی شناخت آسانی سے ہو سکے چنانچہ ان کے لیے جو لباس مقرر کیا گیا اس کی آستینیں غیر معمولی طور پر دراز رکھی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سر پر عمامہ رکھنے کی ممانعت کر دی گئی اور حکم دیا گیا کہ وہ ایک خاص وضع کی ٹوپی سر پر رکھا کریں۔ اس کی شکل زیر پالان کی طرح تھی اور وہ کانوں کے نیچے تک جاتی تھی۔

اگرچہ ان یہودی الاصل لوگوں میں بہت سے لوگ بظاہر اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن یعقوب المنصور کو ان کے اسلام میں ہمیشہ شک رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ

"اگر مجھے ان کے اسلام کا یقین ہو جائے تو میں ان کو مخصوص لباس کی پابندی سے آزاد کر دوں اور ان کو شادی بیاہ اور دیگر تمام معاملات میں مسلمانوں سے خلط ملط کی اجازت دے دوں اور اگر مجھے اس بات کا پختہ ثبوت مل جائے کہ یہ لوگ فی الحقیقت کافر ہیں اور اسلام کی بیخ کنی

کی خاطر مسلمان بنے ہوئے ہیں تو میں ان کے مردوں کو قتل اور اولاد کو قید کردوں اور ان کے اموال کو مسلمانوں کے لیے مباح قرار دے دوں لیکن اسلام کا قانونِ عدل میرے ارادے کی راہ میں حائل ہے۔"

اسی زمانے میں اس کے خیالات میں اعتدال پیدا ہوا اور علوم الفروع (فلسفہ منطق وغیرہ) کی طرف سے اس کی وحشت اور نفرت کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ خود فلسفہ کی تحصیل کی طرف راغب ہوا۔ اس نے ابوالولید ابنِ رُشد کو بھی اندلس سے بُلا بھیجا اور اس کا قصور معاف کر کے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ (یہ بیان علامہ عبدالواحد مراکشی کا ہے۔ بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ نے ابنِ رُشد کو اپنے قیامِ اندلس کے دوران میں ہی معاف کر دیا تھا۔)

(۲۲)

عمر کا آخری دَور

مراکش واپس آکر یعقوب المنصور اکثر بیمار رہنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنی علالت سے عاجز آگیا اور امورِ سلطنت کی انجام دہی میں سخت دِقّت محسوس کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے اپنے نوجوان بیٹے محمد کو (جو ولی عہد تھا) حکومت کا نگران بنا دیا اور خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس زمانے میں وہ اپنا بیشتر وقت عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق میں گزارتا تھا۔ اپنے آخری ایام میں اس نے کئی بار اس بات پر سخت ندامت کا اظہار کیا کہ اس نے اپنے چچا اور بھائیوں کو قتل کروایا تھا اور بعض دوسرے قریبی رشتہ داروں پر بھی سختی کی تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ گوشہ نشینی کے زمانے میں اس نے درویشانہ لباس پہن کر بعض مشرقی

ممالک کی سیاحت بھی کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب

(۲۳)

وفات

صفر ۵۹۵ھ ۱۱۹۹ء اور ایک دوسری روایت کے مطابق ربیع الاول ۵۹۵ھ ۱۱۹۹ء میں یعقوب المنصور کا وقتِ آخر آپہنچا، اس نے الموحدون کے اکابر اور اپنے اعزہ و اقارب کو "قصر الصالحۃ" میں جمع کیا، انہیں ضروری وصیتیں کیں اور اس کے بعد پیکِ اجل کو لبیک کہا۔

اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ (دانش گاہ پنجاب) کے مطابق اس کی تاریخ وفات ۲۲ ربیع الاول ۵۹۵ھ (۲۳ جنوری ۱۱۹۹ء) متعین کی جاسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں بعض مؤرخین نے یہ عجیب روایت بیان کی ہے کہ یعقوب المنصور ترکِ حکومت کے بعد فقیرانہ بھیس بنا کر دنیا کی سیاحت میں مصروف ہو گیا اور اسی سیاحت کے دوران میں گمنامی کی حالت میں دمشق کے قریب فوت ہو گیا۔ اس کی قبر شام کے ایک گاؤں مجدل میں ہے، جو دمشق کے قریب ولایت العزیزی میں واقع ہے۔

کچھ دوسرے مؤرخین نے اس کی سیاحت کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ صراحت بھی کی ہے کہ وہ سیاحت سے واپس آکر مراکش میں فوت ہوا۔ لیکن خود یعقوب المنصور کے عہد کے مؤرخ علامہ عبدالواحد مراکشی نے اس کی سیاحت کا مطلق ذکر نہیں کیا حالانکہ اس نے اس عہد کی معمولی معمولی باتوں کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ خلیفہ کی سیاحت کوئی ایسی بات نہ تھی جسے پردۂ اخفاء میں رکھنا ضروری تھا۔

اس لیے قیاسِ غالب یہی ہے کہ یعقوب المنصور کی سیاحت کا واقعہ محض افسانہ ہے بالخصوص اس بات کے پیشِ نظر کہ وہ اپنی مسلسل علالت سے عاجز آ گیا تھا۔ اس حالت میں وہ دنیا کی طویل سیاحت پر کیسے نکل سکتا تھا؟

علامہ مراکشی نے "المعجب" میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"امیر المومنین یعقوب المنصور اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ تینمل میں دفن ہوئے۔"

جب اس کے زمانے کے سب سے قریبی مؤرخ نے جائے تدفین بھی بیان کر دی ہے تو پھر مجدل میں یعقوب المنصور کی نہیں، اس کے کسی ہمنام کی قبر ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ بھی کسی علاقے کا حکمران ہو۔

(۲۴)

اولاد

یعقوب المنصور نے اپنے پیچھے سولہ لڑکے اور بہت سی لڑکیاں چھوڑیں، جن میں سے کچھ شادی شدہ تھیں۔

لڑکوں کے نام یہ تھے:-

(۱) محمد (۲) ابراہیم (۳) عبداللہ (۴) عبدالعزیز
(۵) ابوبکر (۶) زکریا (۷) ادریس (۸) عیسیٰ
(۹) موسیٰ (۱۰) صالح (۱۱) عثمان (۱۲) یونس
(۱۳) سعد (۱۴) مساعد (۱۵) حسن (۱۶) حسین

یعقوب المنصور کے کچھ اور لڑکے اس کے سامنے ہی انتقال کر گئے تھے۔

شہزادہ محمد جو اس کا ولی عہد اور جانشین تھا ایک رومی خاتون "زہر" کے بطن

سے تھا جو اُمِ ولد تھی۔

(۲۵)

حُلیہ

یعقوب المنصور میانہ قد کا نہایت وجیہ آدمی تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی اور چہرہ قدرے لمبوترا لیکن بہت خوشنما تھا۔ آنکھیں روشن اور سرمگیں اور منہ کا دہانہ فراخ تھا، ڈاڑھی گول اور اعضاء نہایت قوی اور ضخیم تھے۔ جسم کا رنگ کھلا ہوا سُرخ تھا۔

وہ بلند آواز اور بسیار گفتار شخص تھا اور الفاظ کو نہایت صحت کے ساتھ ادا کرتا تھا۔

اوصاف و خصائل

اوصاف وخصائل

منصف مزاجی

یعقوب المنصور نہایت منصف مزاج اور عادل حکمران تھا۔ اس نے ایک وسیع اور مستحکم نظامِ عدل قائم کر دیا تھا اور قاضیوں کو نہایت سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اپنی حکومت کے آغاز میں وہ خود بیٹھ کر لوگوں کی داد رسی کیا کرتا تھا اور ہر کس و ناکس کو اس کے پاس آنے کی عام اجازت تھی۔ تاہم جب لوگوں نے معمولی معمولی باتوں پر اس کے پاس آنا شروع کر دیا تو اس نے یہ طریقہ ترک کر دیا اور اپنے دربارِ عدل کے چند خاص دن مقرر کر دیئے جن میں ایسے اہم یا خاص قسم کے مقدمات ہی پیش ہوتے تھے جو صرف شاہی حکم سے فیصل ہو سکتے تھے[1]۔ خلیفہ کی منصف مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر اس کے ماتحت کسی قاضی کا کوئی

---

[1] علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی نصف درہم کا جھگڑا لے کر خلیفہ سے داد خواہ ہوئے۔ اس نے فیصلہ تو دے دیا لیکن وزیر ابو یحییٰ کو حکم دیا کہ ان دونوں کو خفیف سی جسمانی سزا دی جائے۔ پھر ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"میں نے ایسے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے شہر میں بہت سے قاضی اور عالم مقرر کر رکھے ہیں کیا ان میں سے تمہیں کوئی ایسا نظر نہ آیا جو اس معمولی جھگڑے کا فیصلہ کر سکتا اور تم میرے پاس دوڑے آئے۔"

فیصلہ خود اس کی ذات یا مرضی کے خلاف ہوتا تو وہ اس کو بلا چون وچرا تسلیم کر لیتا۔

علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ امیر المؤمنین ابو یوسف یعقوب کی بہن عالم وقت شیخ عبد الواحد سے بیاہی گئی تھیں۔ ایک دفعہ میاں بیوی کے درمیان شکر رنجی ہو گئی۔ بیوی بادشاہ کی بہن تھی اور شاید اس کے دماغ میں شاہانہ نخوت تھی وہ ناراض ہو کر اپنے بھائی کے پاس شاہی محل میں چلی گئی۔ شیخ صاحب نے اسے واپس آنے کے لیے بار بار پیغام بھیجے لیکن اس نے ہر بار انکار کر دیا۔ ناچار شیخ صاحب نے قاضیٔ شہر کی عدالت میں دعویٰ کر دیا۔ قاضی صاحب نے تمام حقائق کا جائزہ لے کر شیخ صاحب کے حق میں فیصلہ دے دیا اور بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنی بہن کو شوہر کے گھر بھیج دے۔ بادشاہ نے بہن سے کہا لیکن اس نے شوہر کے ہاں جانا پسند نہ کیا۔ قاضی صاحب نے دوبارہ بادشاہ سے کہا لیکن پھر یہی صورت پیش آئی۔ تیسری بار قاضی صاحب نے بادشاہ کو پیغام بھیجا تو ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ اگر اب بھی میرے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو میں منصب قضا سے استعفا دے دوں گا۔ بادشاہ نے بھی اب سختی سے کام لیا اور بہن کی مرضی کی پروا کیے بغیر اس کو شوہر کے گھر بھیج دیا۔ اس طرح اس نے ثابت کر دیا کہ وہ انصاف کے معاملے میں شاہی خاندان کے افراد کی رعایت بھی ملحوظ نہیں رکھتا۔

مؤرخین نے یعقوب المنصور کی انصاف پسندی اور منصف مزاجی کے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں انہیں پڑھ کر کسی تامل کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ وہ عدل و انصاف کا پیکرِ مجسّم تھا۔

فیاضی اور سیر چشمی

تمام مؤرخین نے یعقوب المنصور کی فیاضی اور سیر چشمی کی بے حد تعریف کی

کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ نہایت کثیر الصدقہ اور سخی بادشاہ تھا، طلبہ اور ارباب علم کی قدردانی کے علاوہ (جس کا ذکر آئے گا) وہ غریبوں یتیموں بیواؤں اور دوسرے ضرورتمندوں کی باقاعدگی سے خدمت کرتا رہتا تھا اور ان کو فکرِ معاش اور ہر قسم کی احتیاج سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خاص خاص موقعوں پر بھی داد و دہش کرتا رہتا تھا۔ جنگ اَلارک کے لیے روانہ ہوا تو چالیس ہزار دینار طلائی لوگوں کو صدقے میں دیئے۔ تیلمسان گیا تو وہاں کے لوگوں میں مٹھیاں بھر بھر کر دولت تقسیم کی۔ مصر سے ترکان غز اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے ایسا فیاضانہ برتاؤ کیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسی کے ہو کر رہ گئے۔

اس نے شہر مراکش کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر ایک حصے پر ایک امین مقرر کر رکھا تھا جو پردہ میں بیٹھنے والی ضرورتمند خواتین اور خانقاہ نشین لوگوں کو اس کی طرف سے باقاعدہ خیرات تقسیم کیا کرتا تھا۔ اس کے حکم سے شہر کے تمام لاوارث یتیموں کے اسماء سے اس کو مطلع کیا جاتا تھا اور وہ ان کی ضروریات کا کفیل ہو جاتا تھا۔ ہر سال وہ اپنی نگرانی میں ایسے لاوارث بچوں کے ختنے کرواتا تھا اور ہر ایک کو ایک ایک مثقال، کپڑے، روٹی اور ایک ایک انار دیتا تھا بعض مرتبہ ان چیزوں کے علاوہ دو دو درہم بھی دیتا تھا۔ رفاہِ عامہ کے کاموں پر وہ نہ صرف سرکاری خزانے سے بلکہ اپنی جیب خاص سے بھی دل کھول کر روپیہ خرچ کرتا تھا۔ (اس کی تفصیل ایک الگ باب میں آئے گی)

مریضوں کی عیادت

یعقوب المنصور نے شہر مراکش میں ایک عظیم الشان بیمارستان (ہسپتال) تعمیر کروایا تھا۔ اس کے دروازے ہر غریب، امیر، مقامی اور مسافر مریض کے

لیے کھلے تھے اگر کوئی مفلس مریض بیمارستان سے صحت یاب ہو کر رخصت ہوتا تو خلیفہ کی طرف سے اس کو اس قدر زر و مال دیا جاتا کہ وہ عمر بھر کے لیے فکرِ معاش سے بے پروا ہو جاتا۔ خلیفہ کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو نماز سے فارغ ہو کر بیمارستان جاتا اور ہر مریض کے پاس خود جا کر اس کی خیریت دریافت کرتا اور اس کے گھر والوں کا حال احوال بھی پوچھتا۔ عیادت کے وقت وہ التزام کے ساتھ ہر مریض سے اس طرح کے سوالات پوچھتا۔ "اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" "تمہیں کوئی تکلیف یا ضرورت تو نہیں؟" "بیمارستان میں تمہاری نگہداشت کیسی ہوتی ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔ مریض اگر کسی چیز کی خواہش کرتا تو وہ فوراً پوری کر دیتا۔ اس طرح سارے بیمارستان میں گھوم پھر کر وہاں سے واپس جاتا۔ اس کا یہ معمول وفات کے دن تک برابر جاری رہا۔

شوقِ جہاد اور غیرتِ دینی

یعقوب المنصور جہاد کے فضائل سے بخوبی آگاہ تھا اسی لیے اس کے دل میں ہر وقت جذبۂ جہاد موجزن رہتا تھا اس نے کفار سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک زبردست لشکر اور طاقتور بحری بیڑا تیار کیا تھا، اسے جب اندلس میں عیسائیوں کی چیرہ دستیوں کا علم ہوا تو وہ طوفانِ برق و باد کی طرح ان پر جا پڑا اور ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ وہ خاکِ نامرادی چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔ ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء میں پرتگیزوں نے باجہ اور یبورا پر قبضہ کر کے نہایت سفاکی سے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ یعقوب المنصور نے یہ خبر سنی تو غیرتِ دینی نے اسے شعلۂ جوالہ بنا دیا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ پرتگیزوں سے ان مظلوم مسلمانوں کا انتقام لے کر رہے گا، چنانچہ اس نے قرطبہ کے گورنر کو ایک جرار لشکر دے کر ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا اور اس کو کمک بھی بھیجتا رہا، یہاں تک کہ اس نے پرتگیزوں کو قرار واقعی سزا دے کر بھاگنے

پر مجبور کر دیا۔

یعقوب المنصور اندلس میں مسلسل کئی سال تک عیسائی طالع آزماؤں کے خلاف جہاد میں مصروف رہا۔ اس دوران میں اس نے ہمیشہ علماء و صلحاء کو اپنے ساتھ رکھا اور ان سے مسلمانوں کی فتح کی دعائیں کرواتا رہا۔ نہ صرف وہ خود بلکہ اس کی فوج کے افسر اور سپاہی بھی نہایت پاکباز تھے اور ہمیشہ جہاد کے آداب کا خیال رکھتے تھے۔ اس کی دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ جب فلاسفہ قدیم کی کتابوں میں چند ملحدانہ فقرے دیکھے تو سخت غضبناک ہوا اور ایسی تمام کتابوں کو تلف کرنے کا حکم دے دیا۔

سادگی اور انکسار

یعقوب المنصور اگرچہ ایک عظیم الشان سلطنت کا فرمانروا تھا لیکن وہ شاہانہ کروفر اور نمود و نمائش سے بالعموم اجتناب کرتا تھا۔ اس کا لباس اور کھانا بالکل معمولی ہوتا تھا۔ اس نے ساری عمر سونا چاندی ریشم اور ہیرے جواہرات استعمال نہ کیے اور نہ کبھی اپنے لیے تاج شاہی بنوایا، اس کے سر پر ہمیشہ سادہ سا عمامہ ہوتا تھا۔ اس کے انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ طلبہ کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھا لیتا تھا اور قرآن و حدیث کے علماء کے سامنے بچھ بچھ جاتا تھا۔ مسندِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد وہ پانچوں وقت کی نماز میں خود امامت کرتا تھا۔ یہ سلسلہ مسلسل کئی ماہ تک جاری رہا۔ ایک دن کسی کام میں مشغولیت کی وجہ سے وہ نمازِ عصر کے لیے وقت پر مسجد نہ پہنچ سکا۔ یہاں تک کہ وقت تنگ رہ گیا لیکن لوگ اس کا انتظار کرتے رہے۔ آخر اس نے آ کر نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد لوگوں کو سخت ملامت کی اور کہا کہ:

"میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ صرف میری خاطر سے نماز پڑھتے ہیں ورنہ

آپ کو میرے بغیر وقت پر نماز پڑھنے میں کیا چیز مانع تھی۔ آپ میں سے کوئی بھی صاحب امامت کرا سکتے تھے، کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف نہ لا سکے تو صحابہ کرامؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو امام بنا کر نماز ادا کر لی تھی کیونکہ نماز کا وقت جا رہا تھا۔ کیا یہ آئمۂ دین اور آسمانِ ہدایت کے ستارے آپ کے لیے نمونہ نہیں ہیں؟"

اس واقعہ کے بعد خلیفہ نے خود امامت کرنا ترک کر دیا اور کسی دوسرے امام کی اقتدا میں نماز پڑھ لیتا۔

بعض مؤرخین نے یعقوب المنصور کو فخار اور جاہ پسند لکھا ہے اور اس کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس نے صلاح الدین ایوبیؒ کو اپنے امیرالمومنین مخاطب نہ کیے جانے پر امداد نہیں بھیجی تھی۔ اس واقعہ کے بارے میں ہم "سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی سفارت" کے باب میں بحث کر چکے ہیں۔ ایک اور واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن رشد نے اپنی ایک تحریر میں اس کو "شاہِ بربر" لکھ دیا تھا جس سے وہ برافروختہ ہو گیا تھا لیکن یہ بھی اس کی فخاری اور جاہ پسندی پر کوئی قوی دلیل نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو شاہِ بربر کہلانا ناپسند نہ کرتا ہو لیکن ابن رُشد پر جن اسباب کی بنا پر عتاب نازل ہوا وہ کچھ اور تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں متعدد شاندار اور پُرشکوہ عمارتیں تعمیر کروائیں تو یہ اس کا فطری شوق تھا نہ کہ فخاری اور جاہ پسندی ــــ باقی رہا امیرالمومنین کا لقب تو یہ سب سے پہلے عبدالمومن نے اختیار کیا تھا۔ دولتِ موحدین ایک آزاد خلافت تھی جس کا کوئی تعلق خلافتِ عباسیہ سے نہیں تھا اس لیے اس کے سربراہ نے اگر امیرالمومنین کا لقب اختیار کر لیا تو اس میں بھی فخاری اور جاہ پسندی کی کوئی بات نہیں ہاں اس بات سے کسی کو انکار نہیں

ہوسکتا کہ یعقوب المنصور صاحب عزّ وجاہ ضرور تھا اور قصیدہ گو شعراء کو دل کھول کر انعام دیا کرتا تھا تاہم ان قصائد پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں اس کی تعریف و توصیف میں بے جا مبالغے سے کام نہیں لیا گیا۔

تعمیرِ عمارات کا شوق

یعقوب المنصور کو فطری طور پر عمارات کی تعمیر کا بے حد شوق تھا چنانچہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں بے شمار عمدہ عمارتیں بنوائیں۔ ان میں مساجد، قلعے، مدرسے، بیمارستان اور محلات وغیرہ ہر قسم کی عمارتیں شامل تھیں ان کی تفصیل "رفاہِ عامہ اور تعمیرات" کے باب میں دی گئی ہے۔

شرافتِ نفس

یعقوب المنصور طبعاً نہایت شریف النفس اور عالی ظرف واقع ہوا تھا طلیطلہ پر اس نے بڑی جدوجہد کے بعد فتح حاصل کی تھی لیکن جب الفانسو کی ماں بیوی اور بیٹیاں اس کے پاس روتی دھوتی آئیں تو اس نے نہ صرف ان کی تعظیم و تکریم کی بلکہ ان کی التجا سے عفو کو قبول کر کے انہیں بیش بہا تحائف کے ساتھ رخصت کیا اور شہر پر بھی قبضہ نہ کیا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا تھا۔

ایک مرتبہ اہلِ بجایہ نے بلا وجہ اس کی بیعت توڑ دی اور شہر بنو غانیہ کے حوالے کر دیا۔ یعقوب المنصور نے چند دن بعد بجایہ پر قبضہ کیا تو اہلِ بجایہ اس ڈر سے لرزہ براندام تھے کہ خلیفہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن یعقوب المنصور نے ان کے ساتھ ایسا مشفقانہ سلوک کیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے اطاعت گزار بن گئے۔

ابنِ رشد اور بعض دوسرے علماء اس کے عتاب کا نشانہ بنے لیکن جب ان پر الحاد

اور زندقہ کے الزامات غلط ثابت ہو گئے تو اس نے ان کو معاف کر دیا اور پہلے سے بھی بڑھ کر عزت افزائی کی۔ اگرچہ اس نے چند موقعوں پر مخالفوں کے خلاف سختی کا مظاہرہ بھی کیا لیکن بالعموم اس کا رویہ دشمنوں کے ساتھ شریفانہ ہوتا تھا۔

عقائد

الموحدون مسلکِ اہل سنت والجماعت پر کاربند تھے۔ لیکن ان میں محمد بن تومرت کو "امامِ معصوم" ماننے کا عقیدہ رواج پا گیا تھا، وہ اس کو اپنے خطبۂ جمعہ میں امامِ معصوم، المہدی المعلوم (ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ) العربی القرشی الہاشمی الحسنی الفاطمی المحمدی کے القاب سے یاد کرتے تھے۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ ابو یوسف یعقوب المنصور محمد بن تومرت کی عصمت کا قائل نہ تھا اور ذاتی طور پر وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ (غالباً اس نے موحدین کی شورشِ عام کے خوف سے خطبۂ جمعہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی) ۔جب وہ زیارت کی غرض سے تینملل گیا اور وہاں کی عورتوں نے دَف بجا بجا کر محمد بن تومرت کی تعریف و توصیف میں گیت گائے تو اس نے ان باتوں کو ان لوگوں کی کم عقلی پر محمول کیا اور اپنے ہمراہیوں سے برملا کہا کہ مجھے تو ان باتوں میں کچھ نظر نہیں آتا اور یہ لوگ خواہ مخواہ ایک معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔

علامہ مراکشی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ صالح ابوالعباس احمد بن ابراہیم بن مطرف مُری اور ہیں خانہ کعبہ میں تھے کہ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ "امیرالمؤمنین ابو یوسف یعقوب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ آپ خدائے عزّ وجلّ کے سامنے میرے گواہ رہئیے گا کہ میں عصمت (یعنی عصمتِ ابنِ تومرت) کا قائل نہیں ہوں۔ اسی طرح میں نے ان سے ایک ایسے کام کی اجازت طلب کی جس میں امام کی ضرورت

پڑتی ہے۔ تو انہوں نے کہا "کون امام؟ کیسا امام؟ علیٰ ہٰذا القیاس۔ مشہور فقیہ ابوبکر بن ہانی جنگ الارک کے بعد یعقوب المنصور سے ملنے گئے تو اس نے ان سے پوچھا، آپ نے کون کون سی کتابیں پڑھیں، جب انہوں نے جواب میں یہ کہا کہ میں نے امام (یعنی ابن تومرت) کی تالیفات پڑھی ہیں تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس نے ترش روئی سے کہا۔ "آپ نے یہ کیوں نہیں کہا کہ میں نے قرآن مجید پڑھا ہے اور حدیث کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ کو کسی اور کتاب کا نام لینا چاہیئے تھا۔"

اسی طرح کے کئی اور واقعات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ محمد بن تومرت کی عصمت کا قائل تھا۔ (اہلِ سنت کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ انبیاءؑ اور مرسلینؑ کے بعد کسی بھی شخصیت کو خواہ وہ کیسی ہی برگزیدہ ہو، معصوم نہیں کہا جا سکتا۔) اور نہ وہ اس کو ان معنوں میں امام سمجھتا تھا جن معنوں میں عام مؤحدین سمجھتے تھے (ان کا یہ عقیدہ شیعہ حضرات کے عقیدہ "عصمت ائمہ" سے مماثلت رکھتا تھا)۔ مؤحدین اپنے ہر خلیفہ کو "خلیفۃ الامام" کہتے تھے۔ شاید وہ ان خلفاء کو بھی امام ہونے کی حیثیت سے معصوم سمجھتے ہوں لیکن یعقوب المنصور اگر ابن تومرت کو معصوم نہیں سمجھتا تھا تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہوگا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یعقوب المنصور کے حکم سے جہری نمازوں میں امام الحمد سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی بالجہر پڑھتے تھے۔

شجاعت اور عسکری صلاحیت

یعقوب المنصور نہایت شجاع اور دلاور شخص تھا۔ جن لڑائیوں میں وہ بذاتِ خود شریک ہوتا، ان میں وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کرتا اور عام بادشاہوں

کی طرح میدانِ جنگ کے عقب میں کسی محفوظ خیمے میں ہرگز نہ بیٹھتا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا شہسوار تھا اور شمشیر زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی میں کمال درجے کی مہارت رکھتا تھا، المغرب اور اندلس میں اس نے جن لڑائیوں کی قیادت کی۔ ان میں اس نے دوست اور دشمن سبھی سے اپنی عسکری صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا وہ ہر لڑائی کا منصوبہ بڑی احتیاط اور دقتِ نظر سے تیار کرتا تھا اور لڑائی کے اچھے اور بُرے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے شاذ ہی کسی لڑائی میں ہزیمت اٹھائی ہو۔ یعقوب المنصور کو کسی تامل کے بغیر دنیا کے بہترین جرنیلوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

تدبّر و فراست

مؤرخین نے یعقوب المنصور کی جودتِ طبع اور تدبّر و فراست کی بہت تعریف کی ہے۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ اس کا ذہن صحتِ امور کی طرف اس طرح منتقل ہوتا تھا کہ کسی امر کے متعلق اس کا جو خیال ہوتا تھا، انجامِ کار وہی صحیح ثابت ہوتا تھا۔ وہ ایک نہایت ذہین اور بیدار مغز آدمی تھا اور تمام امورِ سلطنت پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اپنے والد کے زمانے میں وہ عہدۂ وزارت پر فائز ہوا تو اس کی عمر صرف انتیس برس کی تھی لیکن اس نے ایسی عمدگی سے حکومت کا کاروبار چلایا کہ بقول علامہ مراکشی " تمام امورِ مملکت اقتضاءِ زمانہ کے مطابق راست و مستقیم اور اقتضاءِ ملک کے مطابق چست و درست ہو گئے تھے۔" اسے مردم شناسی کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ ہر کام کے لیے موزوں ترین آدمیوں کا انتخاب کرتا تھا اور ہر معاملے کی جزئیات تک پر نظر رکھتا تھا۔ وہ اپنے تمام عمال، ولاۃ، قضاۃ اور دوسرے اہم عہدہ داروں کی سیرت و کردار سے بخوبی آگاہ تھا اور اس کی دانشمندانہ

نگرانی کی بدولت کسی کی مجال نہ تھی کہ بے راہروی اختیار کر سکے۔ جب وہ مسندِ خلافت پر بیٹھا تو اس کو تمام امورِ سلطنت کا وسیع تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہ اس کی فراست اور حسنِ تدبیر ہی کا کرشمہ تھا کہ اس کے زمانے میں دولتِ موحدین منتہائے عروج پر پہنچ گئی ۔ اس کا معمول تھا کہ ہر ماہ شہر کے عمائد اور بازاروں کے نگران افسروں کو اپنے پاس بلاتا تھا اور ان سے منڈیوں کے اتار چڑھاؤ، مختلف اشیاء کی قیمتوں اور حکام کے بارے میں سوال کرتا تھا اگر وہ کوئی ایسی بات بتاتے جو اصلاح طلب ہوتی تو وہ فوراً ضروری احکام جاری کر دیتا تھا جن سے تمام معاملات درست ہو جاتے تھے اور اگر وہ لوگ اپنے قاضیوں اور دوسرے حاکموں کی تعریف کرتے تو وہ ان سے کہتا کہ "یاد رکھو جو شہادت تم دے رہے ہو قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ تم کو چاہیے کہ ہمیشہ راست بازی سے کام لو۔ اس میں نہ کسی کی رُو رعایت کرو اور نہ کسی کے خلاف ذاتی عناد کی بنیاد پر کوئی بات کہو۔" بعض اوقات وہ ان لوگوں کے سامنے یہ آیت پڑھا کرتا تھا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء)

(اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر گواہی دینے والے محض اللہ کے لیے چاہے گواہی دینی پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف)

سبھی مؤرخین نے یعقوب المنصور کی ذہانت، تدبر، دوراندیشی، حسنِ لیاقت، بیدار مغزی اور اعلیٰ کردار کی بے حد تعریف کی ہے۔ وہ الجھے ہوئے مسائل کو آنِ واحد میں سلجھا دیتا تھا۔ جہاں سختی کی ضرورت ہوتی سختی سے کام لیتا تھا اور جہاں نرمی سے کام نکلتا ہو نرمی اختیار کرتا تھا۔ بالعموم ہر معاملے میں وہ بڑی احتیاط اور سوجھ بوجھ

سے کام لیتا تھا۔ اور اپنے غضب کو عقل پر غالب نہیں آنے دیتا تھا۔

احکامِ شرع کی پابندی

اکثر مسلمان مؤرخین نے یعقوب المنصور کے تدیّن اور پابندیٔ سنت کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور اس کو ایک عابد و زاہد اور پارسا حکمران قرار دیا ہے۔ وہ پنجگانہ نماز باجماعت کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ مسندِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد کئی ماہ تک خود اپنی امامت میں لوگوں کو نماز پڑھاتا رہا لیکن ایک مرتبہ جب لوگوں نے اس کے انتظار میں نماز کے وقت کو مؤخر کر دیا تو وہ بہت ناراض ہوا اور اپنی جگہ دوسرا امام مقرر کر دیا۔ نماز پنجگانہ کے علاوہ وہ نوافل بھی بکثرت پڑھتا تھا اور رات کو دیر تک یادِ الٰہی میں مشغول رہتا تھا۔

قرآنِ حکیم کی تلاوت اور حدیث کے مطالعہ سے اس کو خاص شغف تھا۔ صوم و صلوٰۃ کو میدانِ جنگ میں بھی ترک نہ کرتا تھا۔ علماء و صلحاء کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا، ان سے بھی دعائیں کرواتا تھا اور خود بھی موقع بموقع دستِ دعا اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت میں احکامِ شریعت سختی سے نافذ کر رکھے تھے اور قاضیوں اور دوسرے حکام کو حکم دے رکھا تھا کہ تمام مقدمات کا فیصلہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کریں۔ وہ ہمیشہ ان کو اللہ سے ڈرنے اور آخرت کو یاد رکھنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔

علمی ذوق اور اربابِ علم و ہنر کی قدردانی

یعقوب المنصور خود بھی ایک جیّد عالم تھا اور اربابِ علم و ہنر کی قدردانی میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کو کئی علوم میں کمال حاصل تھا لیکن قرآن

اور حدیث سے اس کو خاص شغف تھا، قرآن مجید اگر اس کو سارا نہیں تو اس کی بہت سی سورتیں ضرور حفظ تھیں اور وہ اکثر ان کی تلاوت کرتا رہتا تھا، اسی طرح اس کو بے شمار احادیث حفظ تھیں — تاہم اس کے مزاج میں یبوست نہیں تھی اور وہ شعر و ادب پر بھی گہری نظر رکھتا تھا، بڑے بڑے کامل الفن شعراء اس کے سامنے عجیب غریب بحروں میں قصیدے اور نظمیں پڑھتے تھے اور وہ ان کی مناسب داد دیتا تھا۔ تاہم کوئی شاعر غلط قسم کے خیالات کا اظہار کرتا یا اس کے کسی شعر میں سُقم ہوتا تو وہ اس کو نرمی کے ساتھ ٹوک دیتا یا نہایت بلیغ انداز میں مناسب مشورہ دیتا۔ یہ بات اس کی شعر فہمی پر دال تھی۔

یعقوب المنصور ارباب علم و ہنر اور تحصیل علم کا شوق رکھنے والے لوگوں کا حد سے زیادہ قدردان تھا اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، خواہ وہ کوئی سرکاری خدمت انجام دیں یا نہ دیں، بادشاہ نے اپنے خزانوں کے منہ ان پر کھول رکھے تھے اور ان کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے دربار اور مملکت کے مختلف حصوں میں ایسے ایسے نادرۂ روزگار اربابِ علم و فن جمع ہو گئے تھے کہ گویا ابو جعفر منصور عباسی، مامون الرشید، محمود غزنوی اور ملک شاہ سلجوقی کا دور پلٹ کر المغرب اور اندلس میں آ گیا ہو۔ (اس عہد کے چند اربابِ کمال کے حالات ایک الگ باب میں بیان کیے گئے ہیں)

یعقوب المنصور نے علم و فن کی جس طرح سرپرستی کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے چپے چپے میں مدارس قائم ہو گئے اور مراکش، فاس، اشبیلیہ وغیرہ کئی شہروں میں ایسی عظیم الشان عمارتیں معرضِ وجود میں آئیں کہ انہیں دیکھ کر بے اختیار اس دور کے معماروں اور کاریگروں کے فن کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ یہ عظیم تعمیرات یعقوب المنصور کے ذوقِ تعمیر ہی کی مرہونِ منت نہیں بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ وہ اہلِ ہنر

کی سرپرستی اس انداز میں کرتا تھا کہ ایک طرف ان کے کمالِ فن کا اظہار ہو۔ اور دوسری طرف ان کو معقول روزگار مہیا ہو جائے۔ طلبۂ حدیث کے متعلق وہ برملا کہا کرتا تھا کہ یہ لوگ میرے اور صرف میرے ہیں اور میں ہی ان کی ضروریات کا کفیل ہوں۔

سید امیر علی نے "مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب" میں ایک قدیم مؤرخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"یعقوب المنصور خود عالم تھا اس لیے عالموں کی قدر کرتا تھا۔ خود عابد و پارسا تھا اس لیے عابدوں اور پارساؤں کی عزت کرتا تھا اور مذہب کا پابند تھا۔"

خلیفہ کے حکم سے طہارت کے موضوع پر احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا تھا۔ جو شخص اس مجموعہ کی حدیثوں کو یاد کر لیتا، خلیفہ اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیتا، اس کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کو علم کی طرف رغبت ہو اور وہ سُنّتِ نبوی کی پابندی کریں۔

معمولاتِ سفر

ابو یوسف یعقوب المنصور کو جب کبھی کوئی سفر پیش آتا تو اس کی سواری کے آگے آگے قاری قرآن مجید پڑھتے جاتے تھے۔ دورانِ سفر میں کہیں قیام ہوتا تو پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا اور اگلی منزل کے لیے سفر کا آغاز ہمیشہ نمازِ فجر کے بعد کرتا۔ اس سے پہلے ایک شخص باہر نکل کر استعانت باللہ وتوکل علی اللہ کی منادی کرتا، خلیفہ خیمے کے اندر ہی اپنی سواری پر بیٹھتا اور اس انداز سے باہر نکلتا کہ اس کے بڑے بڑے قرابت دار اور الموحدون کے شیوخ سواری کے آگے آگے چل رہے ہوتے۔ باہر آ کر خلیفہ ان کو بھی سوار ہونے کا حکم دیتا۔ جب وہ سوار ہو چکتے تو خلیفہ اپنی سواری کو کچھ دیر کے لیے روک لیتا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا دوسرے

لوگ بھی اس کی تقلید کرتے۔ دعا سے فارغ ہونے کے بعد سفر شروع ہو جاتا۔ اس کے پیچھے پیچھے طلبۃ الموحدین کی ایک جماعت آہستہ آہستہ چل رہی ہوتی۔ یہ طلبہ نہایت خوش الحانی سے قرآن کریم کی کوئی سورۃ پڑھتے جاتے۔ آگے جا کر وہ احادیث نبوی بیان کرنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد ابن تومرت کی عربی تالیفات میں سے کچھ عبارتیں پڑھتے جو عقائد سے متعلق ہوتیں ـــ جب وہ اس سے فارغ ہو جاتے تو خلیفہ پھر اپنی سواری کو روک لیتا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا۔ غرض اسی طرح قرآن اور حدیث پڑھتے پڑھاتے سارا سفر طے ہوتا۔ منزل پر پہنچنے اور قیام کے وقت بھی خلیفہ کے قرابتدار اور موحدین کے اکابر خلیفہ کے آگے آگے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے خیمے کے اندر داخل ہوتے۔ خلیفہ خیمہ کے اندر پہنچ کر دعا کرتا اور پھر وہ رخصت ہو کر اپنے اپنے خیموں میں چلے جاتے۔

مصحفِ عثمانی سے برکت اندوزی

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ جب کبھی سفر یا جنگ پر جاتا تو برکت کی خاطر مصحفِ عثمانی بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس مصحف کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اسے امیر المؤمنین خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے دستِ مبارک سے لکھا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس مصحف کو انہوں نے دوسرے علماء اور حفاظ سے لکھوایا تھا اور اس کی پشت پر یہ عبارت درج تھی:

"اس مصحف پر اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جماعت نے اتفاق کیا۔"

اس کے بعد ان صحابہ کرامؓ کے اسماء درج تھے جن سے حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے

قرآن جمع کرنے کے سلسلہ میں مشورہ یا کام لیا تھا۔ یہ نسخہ ہمیشہ حضرت عثمانؓ کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ باقاعدگی سے اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ جب ان کی شہادت کا واقعۂ ہائلہ پیش آیا تو وہ اسی مصحف کی تلاوت کر رہے تھے اور اس کا ایک صفحہ آپ کے خونِ مقدس سے رنگین ہو گیا تھا۔ یہ مصحفِ عثمانی بعد میں خلفائے بنوامیہ کے پاس دمشق منتقل ہو گیا۔ دمشق میں بنوامیہ کے زوال کے بعد جب عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں آزاد اُموی حکومت کی بنیاد رکھی تو یہ مصحف بھی کسی طرح اندلس پہنچ گیا، اہلِ اندلس نے اسے مدتوں تک حرزِ جان بنا کر رکھا۔ جب مُوَحِّدین نے اندلس پر قبضہ کیا تو ان کے پہلے خلیفہ عبدالمؤمن نے اس مصحفِ پاک کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کی حفاظت اور اعزاز و اکرام کا بے مثال اہتمام کیا۔

علامہ مقریؒ نے اپنی کتاب "نفح الطیب" میں لکھا ہے کہ عبدالمؤمن نے اس مصحفِ پاک کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور اپنی مملکت کے ہر حصے سے چوٹی کے خیاطوں، نقاشوں، نجاروں، مہندسوں، مرصع کاروں اور صحافوں کو بلا کر حکم دیا کہ اس نادرۂ روزگار مصحف کی بے مثال جلد بناؤ اور اس پر جواہرات سے مرصع کاری کرو، پھر اس کے لیے ایسا جُزدان تیار کرو کہ چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھا ہو۔ اس کے علاوہ ایک صندوق، ایک رحل اور ایک کرسی بھی تیار کرو جو کمالِ فن کا ایسا حسین نمونہ ہوں کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔

کاریگروں نے یہ چیزیں تیار کرنے میں دن رات ایک کر دیئے۔ اس کام میں ان کے پیشِ نظر صرف بادشاہ ہی کی نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی بھی تھی۔ انھوں نے سونے چاندی سے ایک مرصع کار جلد اس وضع کی بنائی کہ انسان اس کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔ اس پر نہایت دلکش نقش و نگار تھے اور رومی شیشے کی مینا کاری کی گئی تھی۔ جلد میں ایسے جوڑ لگائے گئے تھے جو بند کرتے وقت باہم اس طرح پیوست ہو جاتے تھے کہ ان کا پتہ تک نہ چلتا تھا لیکن مصحف کھولنے پر خود بخود الگ

ہو جاتے تھے۔ اس میں بیش قیمت ہیرے، یاقوت اور زمرّد اس طرح جڑے تھے کہ ان کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ جزدان دیبا و حریر سے تیار کیا گیا تھا اور اس میں ہیرے جواہرات ایسی چابکدستی سے جڑے گئے تھے کہ دور سے ایک گلدستہ معلوم ہوتا تھا۔

رحل آبنوس کی صیقل کی ہوئی لکڑی سے بنائی گئی تھی اور اس قدر خوب صورت تھی کہ اس کو دیکھ کر عقل چکرا جاتی تھی۔ اسی طرح جس کرسی پر رحل رکھی جاتی تھی وہ بھی نجاروں کے کمالِ فن کا عجیب و غریب نمونہ تھی۔ ان تمام اشیاء کو رکھنے کے لیے ایک شش پہلو بلند صندوق بنایا گیا تھا جس کی اطراف اور بالائی جانب نہایت دیدہ زیب نقش و نگار بنائے گئے تھے، باکمال کاریگروں نے اس صندوق میں ایسی کلیں لگائی تھیں کہ ایک چابی لگاتے ہی اس کے پٹ خود بخود کھل کر اندر ہو جاتے، ساتھ ہی کرسی اور رحل مصحف سمیت باہر آ جاتے۔ مصحف کی جلد از خود کھل جاتی اور لوگ چھوئے بغیر مصحف کی زیارت اور تلاوت کر لیتے۔ اس کے بعد جب چابی بائیں طرف پھیری جاتی تو مصحف کی جلد بند ہو جاتی، رحل و کرسی اندر چلے جاتے، پٹ اپنی جگہ آ جاتے اور چابی باہر نکالنے پر صندوق مقفل ہو جاتا۔ غرض اس مصحفِ پاک سے متعلق تمام چیزیں کمالِ فن اور حسنِ عقیدت کا مظہرِ اتم تھیں۔ خلیفہ عبدالمؤمن کو اس مصحفِ پاک سے بے پناہ عقیدت تھی اور اپنے پاس اس کی موجودگی کو وہ اپنی خوش بختی کی دلیل سمجھتا تھا۔ وہ سفر یا جنگ پر جاتے وقت اس مصحفِ پاک کو بڑے احترام اور اہتمام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جاتا تھا کیونکہ اس کی برکت پر اس کو یقینِ کامل تھا۔

ابو یعقوب یوسف، ابو یوسف یعقوب اور دوسرے خلفاءِ مؤحدین بھی اس مصحفِ مبارک سے کمال درجے کی عقیدت رکھتے تھے اور سفر یا جنگ میں اس کو اکثر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

انقلابات زمانہ نے بالآخر اس مصحفِ پاک کو سلاطینِ عثمانیہ کے خزانے میں پہنچا دیا اور آج کل بھی یہ ترکی حکومت کی تحویل میں ہے۔

نمازِ جمعہ

یعقوب المنصور ہر جمعہ کو باقاعدگی سے جامع مسجد میں جاکر عام لوگوں کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کرتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ جمعہ کے دن زوالِ آفتاب کے وقت ایک قبلہ رُخ دروازے سے اعیانِ سلطنت کے ہمراہ مسجد میں داخل ہوتا اور دو رکعت نماز ادا کرکے بیٹھ جاتا۔ پھر ایک قاری خوش الحانی کے ساتھ قرآنِ حکیم کی دس آیتوں کی تلاوت کرتا۔ اس کے بعد رئیس المؤذنین (جس کے پاس وہ عصا ہوتا تھا جس پر خطیب سہارا لے کر کھڑا ہوتا تھا) اٹھ کر کہتا:

"یا سیدنا امیر المؤمنین! والحمد للہ رب العلمین، زوالِ آفتاب کے بعد سایہ پھیل چکا ہے۔"

اس طرح کہہ کر وہ گویا خلیفہ سے اجازت طلب کرتا تھا کہ خطیب منبر پر کھڑا ہو کر خطبہ شروع کرے۔ خلیفہ ہاتھ کے اشارے سے یا سر ہلا کر اجازت دیتا تھا تو خطیب منبر پر کھڑا ہو جاتا تھا اور رئیس المؤذنین اس کے ہاتھ میں عصا پکڑا دیتا تھا جب خطیب منبر پر بیٹھ جاتا تھا تو تین مؤذن نہایت دلکش لہجے میں الگ الگ کھڑے ہو کر اذان دیتے تھے، یہ مؤذن اپنی اعلیٰ خوش الحانی (حسنِ قرأت) کی بنا پر ساری مملکت سے منتخب کیے جاتے تھے۔

پھر خطیب کھڑے ہو کر اس طرح خطبہ پڑھنا شروع کرتا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا

مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اَرْسَلَهٗ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ۔ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَلَا يَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهٗ وَلَا يَضُرُّ اللّٰهَ شَيْئًا۔ اَسْئَلُ اللّٰهَ رَبَّنَا اَنْ يَّجْعَلَنَا مِمَّنْ يُّطِيْعُهٗ وَيُطِيْعُ رَسُوْلَهٗ وَيَتَّبِعُ رِضْوَانَهٗ وَيَجْتَنِبُ سَخَطَهٗ فَاِنَّمَا نَحْنُ بِهٖ وَلَهٗ۔

مطالب: "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ہم اس کی تعریف بیان کرتے ہیں، اور اس سے استعانت طلب کرتے ہیں اور اپنی ذات کی برائیوں اور اعمال کی لغزشوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو اکیلا ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں۔ نیز ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمدؐ اس کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ بھیجا اُن کو حق کی خوشخبری دینے اور قیامت سے ڈرانے والا بنا کر۔ جو اللہ کی اطاعت کرے وہ ہدایت یافتہ ہُوا۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اس نے اپنے ہی آپ کو نقصان پہنچایا۔ اور اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ جو ہمارا ربّ ہے سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ایسے افراد میں شامل فرمائے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی رضا تلاش کرتے اور اس کے غصہ سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ ہم فقط اللہ کی بدولت اور اسی کے لیے ہیں۔"

پھر تعوذ کے بعد سورۂ قاف (ق) شروع سے آخر تک پڑھ کر بیٹھ جاتا۔ پھر کھڑے ہو کر خطبۂ ثانیہ یوں پڑھتا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِینُہٗ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَبْرَأُ مِنَ الْحَوْلِ وَالْقُوَّۃِ اِلَیْہِ، وَنَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا، فَمَا لَتَوْا لَا تَامٌ حَبْذًا وَعَزْمًا وَاَنْفَذُوْا وُسْعَہُمْ فِی نَصْرِہٖ وَالصَّبْرِ عَلٰی مَا اَصَابَہُمْ فِیْہِ وَفَاعُرُوْا صِدْقًا وَحَزْمًا، وَعَلَی الْاِمَامِ الْمَعْصُوْمِ، الْمَہْدِیِّ الْمَعْلُوْمِ، اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الْعَرَبِیِّ الْقُرَشِیِّ الْہَاشِمِیِّ الْحَسَنِیِّ الْفَاطِمِیِّ الْمُحَمَّدِیِّ الَّذِیْ اُیِّدَ بِالْعِصْمَۃِ فَکَانَ اَمْرُہٗ حَتْمًا، وَاکْتَنَفَ بِالنُّوْرِ اللَّائِحِ وَالْعَدْلِ الْوَاضِحِ، الَّذِیْ یَمْلَأُ الْبَسِیْطَۃَ حَتّٰی لَا یَدَعَ فِیْہَا ظَلَامًا وَلَا ظُلْمًا، وَعَلٰی وَارِثِ شَرَفِہِ الصَّمِیْمِ قَسِیْمِہٖ رِضَہٗ فِی النَّسَبِ الْکَرِیْمِ، الْمُجْتَبٰی لِوِرَاثَۃِ مَقَامِہِ الْعَلِیِّ، الْخَلِیْفَۃِ الْاِمَامِ اَبِیْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ بْنِ عَلِیٍّ، وَعَلٰی اَبِیْ یَعْقُوْبَ وَلِیِّ ذٰلِکَ الْاِسْتِخْلَاصِ وَمُسْتَوْجِبِ شَرَفِ الْاِجْتِبَاءِ وَالْاِخْتِصَاصِ اَللّٰہُمَّ وَارْضَ عَنِ الْمُجَاہِدِ فِیْ سَبِیْلِکَ، الْمُحْیِیْ سُنَّۃَ رَسُوْلِکَ الْخَلِیْفَۃِ الْاِمَامِ اَبِیْ یُوْسُفَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ابْنِ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ابْنِ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اَللّٰہُمَّ وَانْصُرْ وَلِیَّ عَہْدِہِمْ، الطَّالِعَ فِیْ اُفُقِ سَعْدِہِمْ الْقَائِمَ بِالْاَمْرِ مِنْ بَعْدِہِمْ،

اللهم كما شددت به عرى الاسلام وجمعت على طاعته قلوب الانام ونصرت به دين نبيك محمد عليه السلام، فاقض له بالنصر المقرون بالكمال والتمام، اللهم كما اجتبيته من الخلفاء الراشدين والائمة المهديين فاجعله من المقتفين لآثارهم، المهتدين بمنارهم، المقتبسين من انوارهم، اللهم وايد الطائفة المنصورة والجماعة اخوان نبيك، وطائفة مهديك، الذين اخبرت عنهم فی صریح وحيك انهم لا یزالون ظاهرين على امرك الى قيام الساعة وامدهم وكافة من انتظم فی سلکهم من انصار الدين وحزبك الموحدين بموا د النصر والتمكين والفتح المبين واجعل لهم من عصمتك وتاييدك اعز ظهير واكرم نصير۔"

مطالب : "سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ دریں حال کہ ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں، اس سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اور ہم شہادت دیتے ہیں اس بات کی کہ اللہ کے سوا، کوئی معبود برحق نہیں درحالیکہ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ بیشک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ تعالےٰ رحمتیں نازل فرمائے ان پر ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر جنہوں نے ان کی پیروی کی پس وہ سبقت لے گئے تمام لوگوں سے بزرگی اور عزم و استقلال میں اور پوری طاقت خرچ کی ان کی مدد و نصرت میں اور اس چیز پر صبر و تحمل کرنے میں جو انھیں ان کی مدد کرنے کے دوران میں پہنچی۔ وفاکیشی، اخلاص اور ثبات قدمی

کے مظاہرہ کی بنا پر

اسی طرح اللہ رحمتیں نازل فرمائے اس امام پر جو کہ معصوم، ہدایت یافتہ معروف و معلوم ہے جن کا نام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ ہے جو کہ (زبان و نسل کے اعتبار سے) عربی، قریشی ہاشمی الحسنی الفاطمی المحمدی ہیں جنہیں عصمتِ ربانی سے تقویت و تائید حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کا حکم حتمی اور ابدی ہوگا اور اس کے پہلو میں چمکدار روشنی اور واضح انصاف ہے جو زمین کو بھر دیتا ہے (انصاف سے) حتیٰ کہ نہیں چھوڑتا اس میں کوئی تاریکی اور ظلم۔

(اسی طرح) اللہ رحمتیں نازل فرمائے اس کے شرف کے اصل وارث پر جو اس کا عمدہ نسب میں شریک ہے، چنا ہوا عالی مقام خلیفہ اور امام ہے۔ جن کا اسم گرامی ابو محمد عبدالمومن بن علی ہے اور رحمتیں نازل فرمائے اللہ تعالےٰ ابو یعقوب پر جو کہ اس اختیار و انتخاب کا اہل اور پسندیدگی اور خصوصیت کا مستحق ہے اے اللہ! راضی ہو جاؤ اپنی راہ میں جہاد کرنے والے اور اپنے رسول کی سنت کے زندہ کرنے والے سے جو کہ خلیفہ اور امام ہے جن کی کنیت اور لقب ابو یوسف امیر المومنین ہے جو کہ امیر المؤمنین کا بیٹا اور پوتا ہے۔ اے اللہ ان کے ولیعہد کی نصرت و حمایت فرما جو ان کی نیک بختی کے افق پر نمودار ہے اور ان کے بعد امورِ حکومت کا نگران ہے۔ اے اللہ! جس طرح تو نے اس کے ذریعہ اسلام کی رسی کو مضبوط کیا اور اس کی اطاعت گزاری پر لوگوں کے دلوں کو جمع کیا اور اس کی بدولت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کی ہے (اس طرح) اس کے لیے ایسی مدد کا فیصلہ فرما جس کے کمال و تمام قرین ہوں (یعنی مدد کامل)

اے اللہ جس طرح تو نے اسے خلفاء راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ سے منتخب فرمالیا ہے اسی طرح اسے ان کے نقوشِ پا پر چلنے والوں، ان کی نور نگاہوں

سے راہ چلنے والوں اور ان کے انوار سے روشنی حاصل کرنے والوں میں سے
فرمادے۔ اے اللہ! طائفہ منصورہ کی حمایت فرما اور اس جماعت کی
مدد فرما جو تیرے نبی کے بھائی برادر ہیں اور تیرے مہدی کا گروہ ہیں جن کے
بارہ میں تو نے بطریق وحی جلی خبر دی ہے کہ وہ تا قیام قیامت تیرے امر
پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ اور مدد فرما ان کی اور ان تمام لوگوں کی جو تیرے
دین کے مددگار ہو کر ان کی لڑی میں پروئے گئے! اور مدد فرما اپنی جماعت
کی جو کہ اہل توحید ہیں نصرت و غلبہ اور واضح فتح کے ساتھ اور بنا دے
ان کے لیے اپنی تقویت و تائید سے قوی مددگار اور اچھے معاون۔"

یہاں پر خطبۂ ثانی ختم ہو جاتا اور خطیب دعا کر کے منبر سے اتر آتا اور نماز پڑھاتا۔
نماز سے فارغ ہو کر خلیفہ خود دعا کراتا اور وزیر سلطنت بلند آواز سے آمین کہتا جاتا۔

ان خطبوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ موحدین توحید اور رسالت
محمدی کے دل سے قائل تھے۔ کتاب اللہ اور سنت نبوی کو دین میں حجت سمجھتے تھے۔
صحابہ کرامؓ کا احترام کرتے تھے اور عقائد و اعمال میں بالعموم اہل سنت و جماعت کے
مسلک کی پیروی کرتے تھے لیکن ان میں ایک قسم کا امامیہ عقیدہ بھی رواج پا گیا تھا جو شیعی عقیدہ
امامت سے کسی حد تک مماثلت رکھتا تھا۔ وہ محمد بن تومرت کو امام معصوم اور
مہدی معلوم قرار دیتے تھے اور اپنے خلفاء کو بھی امام کا درجہ دیتے تھے اور ان کو
خلفاء راشدین کی مثل قرار دیتے تھے۔ (اگرچہ وہ خلفاء کو ابن تومرت کی طرح معصوم نہیں
سمجھتے تھے) خلیفہ یعقوب المنصور ذاتی طور پر نہ ابن تومرت کو معصوم سمجھتا تھا اور نہ امامیہ
عقیدے سے متفق تھا لیکن اس نے موحدین کے عام مذہب میں کبھی دخل اندازی نہیں کی
کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں وہ تمام طاقتور اور جنگجو قبائل اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے جو
موحدین میں شامل تھے اور دولت موحدین کے پشتیبان تھے۔

نظمِ مملکت

(۸) ہسکورہ کے بعض قبائل۔

ان کے علاوہ قبائل وکالہ، رجراجہ، حاحہ، جزولہ، لمطہ، ہزرجہ، ہزمیرا اور ہیلانہ وغیرہ بھی الموحدون میں شامل تھے۔ ان سب قبائل کو مجموعی طور پر المصامدہ کہا جاتا تھا۔ اسی لیے دولتِ موحدین کو دولت المصامدہ بھی کہا جاتا ہے۔ المصامدہ کے علاوہ لمتونہ، مسوفہ، ہسرطہ اور کئی دوسرے خالص بربری قبائل نے بھی موحدین کی دعوت قبول کر لی تھی، وہ اگرچہ المصامدہ میں سے نہیں تھے اور موحدین سے پہلے مرابطین کے دست و بازو تھے لیکن بعد میں موحدین کی اطاعت قبول کر کے انہی میں شامل ہو گئے۔ مختصر یہ کہ الموحدین بدوی لوگ تھے اور ان کی طرزِ معاشرت بہت سادہ اور تکلفات سے پاک تھی۔ ان کی سلطنت کیسے قائم ہوئی اور ان کا اندازِ جہانبانی کیسا تھا اس کے بارے میں علامہ شبلی نعمانیؒ یوں رقمطراز ہیں:

> "حقیقت یہ ہے کہ موحدین کی سلطنت کی بنیاد مذہب کی سطح پر قائم ہوئی تھی۔ اس سلسلہ کا بانی محمد بن تومرت امامت اور مہدویت کا مدعی تھا اور اسی حیثیت سے اس نے سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی۔ سلطنت کا صدر مقام مراکش تھا جو صحرانشین بدوؤں کا گویا کعبہ تھا[1] اور جہاں ہر طرف بدویت اور سادہ عربیت کے آثار نظر آتے تھے۔ فوجی اور ملکی ارکان ٹھیٹ مذہبی خیال کے لوگ تھے، سلطنت کی ملکی قوت محض اس

---

[1] مراکش صحرانشین بدوؤں (موحدین) کا مرکزِ حکومت تھا اور بلاشبہ ان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا لیکن یہ کہنا کہ "یہ گویا ان کا کعبہ تھا" سخت مبالغہ آمیز بات ہے۔ موحدین احکامِ شرع کے سخت پابند تھے اور کعبۃ اللہ (مکہ مکرمہ) کو اپنا مقدس ترین مقام سمجھتے تھے۔ کوئی دوسرا مقام ان کے نزدیک کعبہ کی مثل نہیں تھا۔

(۸) ہسکورہ کے بعض قبائل ۔

ان کے علاوہ قبائل وکالہ ، رجراجہ ، حاحہ ، جزدلہ ، لمطہ ، ہزرجہ ، ہزمیرا اور ہیلانہ وغیرہ بھی الموحدون میں شامل تھے ۔ ان سب قبائل کو مجموعی طور پر المصامدہ کہا جاتا تھا ۔ اسی لیے دولتِ موحدین کو دولت المصامدہ بھی کہا جاتا ہے ۔ المصامدہ کے علاوہ لمتونہ ، مسوفہ ، ہسرطہ اور کئی دوسرے خالص بربری قبائل نے بھی موحدین کی دعوت قبول کر لی تھی ، وہ اگرچہ المصامدہ میں سے نہیں تھے اور موحدین سے پہلے مرابطین کے دست و بازو تھے لیکن بعد میں موحدین کی اطاعت قبول کر کے انہی میں شامل ہو گئے ۔ مختصر یہ کہ الموحدین بدوی لوگ تھے اور ان کی طرزِ معاشرت بہت سادہ اور تکلفات سے پاک تھی ۔ ان کی سلطنت کیسے قائم ہوئی اور ان کا اندازِ جہانبانی کیسا تھا اس کے بارے میں علامہ شبلی نعمانیؒ یوں رقمطراز ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ موحدین کی سلطنت کی بنیاد مذہب کی سطح پر قائم ہوئی تھی ۔ اس سلسلہ کا بانی محمد بن تومرت امامت اور مہدویت کا مدعی تھا اور اسی حیثیت سے اس نے سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی ۔ سلطنت کا صدر مقام مراکش تھا جو صحرا نشین بدوؤں کا گویا کعبہ تھا[1] اور جہاں ہر طرف بدویت اور سادہ عربیت کے آثار نظر آتے تھے ۔ فوجی اور ملکی ارکان ٹھیٹ مذہبی خیال کے لوگ تھے ، سلطنت کی ملکی قوت محض اس

---

[1] مراکش صحرا نشین بدوؤں (موحدین) کا مرکزِ حکومت تھا اور بلاشبہ ان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا لیکن یہ کہنا کہ " یہ گویا ان کا کعبہ تھا " سخت مبالغہ آمیز بات ہے ۔ موحدین احکامِ شرع کے سخت پابند تھے اور کعبۃ اللہ (مکہ مکرمہ) کو اپنا مقدس ترین مقام سمجھتے تھے ۔ کوئی دوسرا مقام ان کے نزدیک کعبہ کی مثل نہیں تھا ۔

بات پر موقوف تھی کہ مذہبی جوش کا رنگ قائم رکھا جائے، عیسائیوں نے اسپین کے اکثر حصے دبا لیے تھے ان کے مقابلہ میں صرف مذہبی جوش کی قوت سے عہدہ برآئی ہوسکتی تھی اور منصور نے جو اس سلسلہ کا تیسرا تاجدار تھا اسی قوت سے کام لے کر عیسائیوں پر عظیم الشان فتوحات حاصل کی تھیں۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ دربار فقہاء اور محدثین کے ہاتھ میں تھا اور تمام ملک پر انہیں کے خیالات چھا گئے تھے۔" (مقالات شبلی ترجمہ ابن رشد)

المصامدہ (قبائل موحدین) کو ملکی امور میں نمایاں حیثیت حاصل تھی اور ان کے شیوخ و اکابر کا ملک کے نظم و نسق میں بڑا عمل دخل تھا وہ نہ صرف حکومت کے اہم عہدوں پر فائز تھے بلکہ فوج میں بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ سفیروں کا تقرر بھی المصامدہ ہی سے کیا جاتا تھا۔ اگرچہ تمام الموحدون میں رشتۂ اخوت قائم تھا لیکن پھر بھی ابن تومرت کی رفاقت اور قرب کے لحاظ سے ان کے مدارج مقرر تھے۔ چنانچہ خلیفہ کے جلوس عام کی ترتیب اس طرح ہوتی تھی: سب سے آگے عمر بن عبداللہ صنہاجی کی اولاد ہوتی تھی۔ (یہ عمر بن عبداللہ، ابن تومرت کے اولین رفقاء میں سے تھا) پھر بنو عبدالمومن میں سے جو خلیفۂ وقت ہو، اس کا گھوڑا ہوتا تھا۔ اس کے بعد "الجماعت"[1] کے اراکین اپنے طبقات کی ترتیب سے

---

[1] "الجماعت" ان لوگوں کو کہتے تھے جنہوں نے پہلے پہل ابن تومرت کی دعوت قبول کی اور اپنا مرنا جینا اس کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ شروع شروع میں الجماعت صرف دس آدمیوں پر مشتمل تھی اس کے بعد مختلف قبائل کے اور لوگ بھی ان میں آکر شامل ہو گئے۔ یہ گویا الموحدین کے سابقون اولون تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد کو بھی الجماعت میں شمار کیا جاتا تھا۔

ہوتے تھے۔

الجماعت کے لوگوں کے پیچھے باقاعدہ فوج ہوتی تھی۔ اس کے بعد قبائل ــــ سب سے آگے قبیلہ ہرغہ (ابن تومرت کا قبیلہ) پھر اہل تینملل، ان کے پیچھے اہل کومیہ اور سب کے پیچھے دوسرے الموحدین اس ترتیب سے ہوتے تھے، جس ترتیب سے انہوں نے شروع شروع میں گھر بار چھوڑ کر اپنے آپ کو تحریکِ توحید کے لیے وقف کیا تھا۔

ان لوگوں کو اتنی اہمیت دینے کا یہ سبب تھا کہ ابن تومرت سے قُرب کی بدولت (خواہ یہ قُرب خود انہیں نصیب ہوا ہو یا ان کے آباؤ اجداد کو) وہ عام لوگوں میں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ یعقوب المنصور کے عہد میں معدودے چند ایسے کبیر السن آدمی باقی تھے جنہوں نے ابن تومرت کا زمانہ پایا تھا ورنہ الجماعت وغیرہ کے بیشتر لوگ ابن تومرت کے رفقاء کی اولاد میں سے تھے۔ یہ لوگ محض بدوی نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر تعلیم یافتہ تھے اور بعض تو علم و فضل کے لحاظ سے نہایت اونچے درجے کے فقہاء و محدثین میں شمار ہوتے تھے۔ ان لوگوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے حکومت پر دینی رنگ غالب تھا اور خلیفہ بھی بے لگام نہیں ہونے پاتا تھا۔

نظامِ حکومت

اس میں کوئی شک نہیں کہ موحدین کے بعض عقائد عام اہل سنت و جماعت کے عقائد سے کسی قدر مختلف تھے لیکن بحیثیتِ مجموعی وہ اسلام (بلکہ "خالص" اسلام) کے داعی تھے اور ان کے حکمران، خلفائے راشدین کے نقشِ قدم پر چلنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے بڑی حد تک کوشش بھی

کی (بالخصوص پہلے تین خلفاء عبدالمؤمن، ابو یعقوب یوسف اور یعقوب المنصور نے) لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت نے عالمِ اسلام پر جو رنگ جمایا تھا وہ اس کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے اور حکومت کے بعض شعبوں میں انہیں عام دنیاوی بادشاہوں کے طریقے بھی اختیار کرنے پڑے اس لیے ان کی حکومت کو خلافتِ راشدہ سے تو تشبیہ نہیں دی جا سکتی تاہم یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ یکسر مطلق العنان نہیں تھے اور کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے حتی الوسع قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کرتے تھے گویا ان کی حکومت پر دینی رنگ غالب تھا۔ ان کی حکومت کے بڑے بڑے شعبے یہ تھے :۔

(۱) وزارت
(۲) حجابت
(۳) کتابت
(۴) قضاء (عدلیہ)
(۵) احتساب و امانت
(۶) مالیات
(۷) فوج (برّی و بحری)
(۸) تعلیم و تعلّم
(۹) رفاہِ عامہ اور تعمیرات

ان کی مختصر کیفیت یہ ہے : ——————

وزارت

خلیفہ کے بعد وزیر کو مملکت میں سب سے اعلیٰ حیثیت حاصل تھی۔ ملک کے تمام نظم و نسق کی ذمہ داری اسی کے کندھوں پر تھی۔ مُوَحّدین کا طرزِ حکومت بنیادی طور پر وحدانی قسم کا تھا اور خلیفہ کی ذات ہی اتحاد و تنظیم اور قوت کا مرکز یا سرچشمہ تھی تاہم ملک کے دونوں بازوؤں کو مختلف صوبوں اور ولایتوں میں تقسیم کر دیا گیا

تھا۔ ان کے امیروں یا والیوں (گورنروں) کو مقامی نظم ونسق چلانے اور امن قائم رکھنے کے لیے کافی اختیارات حاصل تھے حتیٰ کہ وہ ایک خاص حد تک فوج بھی رکھ سکتے تھے، صوبوں کے سربراہوں (ولاۃ) اور عمّال کا تقرر وعزل وزیر کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو اپنے اختیارات خلیفہ کی منظوری سے استعمال کرتا تھا حکومت کے دوسرے تمام شعبوں کے اہم عہدے داروں کے تقرر یا تنزل میں بھی وزیر کی مرضی یا مشورے کا بڑا عمل دخل تھا اور وہ ان شعبوں بلکہ تمام امورِ مملکت کی نگرانی کا ذمہ دار تھا۔

یعقوب المنصور کے عہد میں جو لوگ عہدۂ وزارت پر فائز ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) ابو حفص عمر بن زید ہنتاتی۔ چند سال وزارت کے بعد قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ اس کے بعد

(۲) ابو یحییٰ ابوبکر بن عبداللہ بن ابی حفص عمر اینتی وزیر مقرر ہوا۔ وہ بڑا لائق اور بہادر آدمی تھا۔ معرکۂ الارک (۵۹۱ھ ۱۱۹۵ء) میں مردانہ وار لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس کی شہادت کے بعد عہدۂ وزارت کچھ عرصہ خالی رہا پھر اس کا چچازاد بھائی

(۳) ابو عبداللہ محمد بن ابوبکر بن الشیخ ابو حفص وزیر مقرر ہوا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے "الفیل" کے لقب سے مشہور تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ عہدۂ وزارت سے دستکش ہو گیا اور لباسِ فقر پہن کر اشبیلیہ کے نواح میں عزلت گزین ہو گیا۔ خلیفہ کے حکم سے اس کو تلاش کر کے واپس مراکش لایا گیا لیکن پھر اس کو وزارت کی ذمہ داری نہ سونپی گئی۔ اس کی جگہ

(۴) ابو زید عبدالرحمان بن موسیٰ بن یُوجّان ہنتاتی کو وزیر بنایا گیا اور

وہ یعقوب المنصور کی وفات تک اس عہدہ پر کام کرتا رہا۔

حجابت

ارباب حاجت کے ہجوم کو روکنے، ان میں نظم وضبط قائم رکھنے اور تہذیب قاعدے سے انہیں خلیفہ کے حضور پیش کرنے کے لیے جو افسر مامور ہوتا تھا اس کو حاجب کہا جاتا تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو میرِ تشریفات (MASTER OF CEREMONIES) بھی کہا جاسکتا ہے۔ یعقوب المنصور کے عہد میں جو لوگ حاجب کے عہدے پر فائز رہے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) عنبر خصی۔ یہ خلیفہ کا غلام تھا۔

(۲) ریحان خصی۔ یہ بھی خلیفہ کا غلام تھا، اپنی ملازمت کے دوران میں ہی فوت ہوگیا۔

(۳) عبداللہ بن یعقوب۔ یہ خلیفہ کا فرزند تھا اور ریحان کی وفات کے بعد حاجب بنا۔ یہ ذمہ داری وہ باپ کی وفات تک نباہتا رہا۔

کتابت

گورنروں (ولاۃ وامراء) اور دوسرے عہدے داروں کو خلیفہ کے تحریری احکام بھیجنا اور دوسری حکومتوں سے خط وکتابت کے فرائض انجام دینا، یہ شعبۂ کتابت کی خاص ذمہ داریاں تھیں۔ اس شعبہ کے افسر کو کاتب کہا جاتا تھا اور وہ بڑا لائق اور عالم فاضل آدمی ہوتا تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو سیکرٹری (معتمد امورِ خارجہ (FOREIGN SECRETARY) کہا جاسکتا ہے۔ شعبۂ کتابت کے دو افسر ہوتے تھے ایک کاتبِ انشاء اور دوسرا کاتب الجیش۔ کاتبِ انشاء عام

خط وکتابت کا ذمہ دار تھا اور کاتب الجیش فوج سے متعلق امور کی کتابت کا ذمہ دار تھا۔ یعقوب المنصور کے کُتّاب کے نام یہ ہیں:

(۱) ابوالفضل جعفر المعروف بہ ابن محشوہ (کاتب انشاء)۔

نہایت ذہین وفطین، قوی الحافظہ اور عالم وفاضل شخص تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں ہی وفات پائی۔

(۲) ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمان بن عیاش۔

ابن محشوہ کی وفات کے بعد کاتب انشاء مقرر ہوا۔ یعقوب المنصور کی وفات (بلکہ اس کے بعد) تک کاتب کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔

وہ اندلس کے شہر برشالہ کا رہنے والا تھا۔

ابوعبداللہ نہایت قابل شخص تھا۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ "الموحدون" کے قیام امر کے زمانے سے اس وقت تک کوئی کاتب ایسا نہیں ہوا جو ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمان بن عیاش کی طرح اپنے بادشاہوں کے طریقوں سے واقف ہو اور جو کچھ ان کے دل میں ہو، وہی ادا کرے اور ان کے اصل روّیہ کے مطابق چلے کیونکہ ان بادشاہوں کے طریقے کچھ اس نوعیت کے ہوتے تھے کہ کاتبوں کے طریقوں کے خلاف پڑتے تھے۔ اس لیے ابوعبداللہ کے بعد جس قدر کاتب آئے انہوں نے بھی اس کی تقلید کی اور ہمیشہ بادشاہوں کی مرضی اور منشاء کو پیش نظر رکھا۔

(۳) ابوالحسن بن مُغن۔ یہ کاتب الجیش تھا اور بڑا ہوشیار آدمی تھا۔

(۴) الکباشی۔ یہ ابوالحسن بن مُغن کے بعد کاتب الجیش مقرر ہوا۔ بڑا ذہین اور عقلمند شخص تھا۔ اس نے اپنے حسنِ لیاقت سے یعقوب المنصور کے دل میں گھر کر لیا اور اس کی وفات تک کاتب الجیش کے عہدے پر فائز رہا۔ اور اپنے فرائض بہترین طور پر ادا کیے۔

قضاء

قضاء یا عدالت مُوحّدین کی حکومت کا نہایت اہم شعبہ تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے "عدلیہ" کہا جا سکتا ہے۔ اس محکمہ کا سربراہِ اعلیٰ خود خلیفہ ہوتا تھا لیکن اسی حد تک کہ وہ قاضی القضاۃ (CHIEF JUSTICE) اور بعض دوسرے قاضیوں کا تقرر کرتا تھا ورنہ خود اس کی اپنی ذات بھی احتساب و مواخذہ سے بالاتر نہ تھی۔ اگر کوئی معمولی شخص بھی خلیفہ کے خلاف مقدمہ دائر کرتا تو اس کو متعلقہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اگر قاضی اس کے خلاف فیصلہ صادر کرتا تو وہ اس کو تسلیم کرنے کا پابند تھا۔ البتہ یعقوب المنصور نے چند دن مقرر کر رکھے تھے جن میں وہ خود دربار عدل قائم کرتا تھا اور بعض خاص نوعیت کے مقدموں کا فیصلہ کرتا تھا جن میں اس کے سوا کسی اور حاکم کے احکام جاری نہیں ہو سکتے تھے۔

یعقوب المنصور نے تمام ملک (مغرب اور اندلس) میں عدالتوں کا جال بچھا دیا تھا جن میں نہایت دیانت دار، عالم فاضل اور قابلِ اعتماد قاضی مقرر کیے تھے۔ ان قاضیوں کے اختیارات بہت وسیع تھے اور وہ کسی بھی حاکم کو (خواہ وہ کسی صوبہ کا والی ہو یا خود خلیفہ ہو) اپنی عدالت میں طلب کر سکتے تھے تاہم ان کے فیصلے کتاب و سُنّت کے تابع ہوتے تھے۔

یعقوب المنصور کے عہد میں جو اصحاب قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے، ان کے نام یہ ہیں :-

(۱) ابوجعفر احمد بن مضاء۔

قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ قرآن و حدیث اور احکامِ شرع میں رتبۂ تبحر

رکھتے تھے ۔ ابو یعقوب یوسف بن عبدالمومن کے عہدِ حکومت کے اواخر میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور ابو یوسف یعقوب المنصورؒ کی خلافت کے شروع میں بھی اس عہدے پر رہے ۔

(۲) ابوالقاسم احمد بن محمد ۔ یہ ابوجعفر احمد بن مضاء کے بعد قاضی القضاۃ مقرر ہوئے ۔ نہایت متبحر عالم اور بے باک آدمی تھے ان کا سلسلۂ نسب مشہور محدث اور فقیہ بقی بن مخلد سے ملتا تھا جو امام احمد بن حنبلؒ سے روایت کرتے تھے ۔ ابوالقاسم احمد یعقوب المنصور کی وفات تک اپنے عہدے پر قائم رہے اور اس کے بعد محمد بن یعقوب المنصورؒ کے عہد میں بھی کچھ زمانے تک قاضی القضاۃ رہے لیکن محمد نے انہیں کسی وجہ سے معزول کر دیا ۔

یعقوب المنصورؒ نے انہیں قاضی القضاۃ مقرر کرتے وقت یہ شرط کرائی تھی کہ وہ اس طرح بیٹھا کریں گے کہ تمام قضیوں کے متعلق ان کے احکام خلیفہ کے کانوں تک اور خاص نوعیت کے مقدموں میں خلیفہ کے احکام ان کے کانوں تک پہنچ سکیں ۔ چنانچہ انکی عدالت اور خلیفہ کے درمیان صرف چند تختوں کی آڑ ہوتی تھی ۔

احتساب و امانت

مؤحدین کے عہد میں احتساب کا نظام بہت ترقی یافتہ حالت میں تھا ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ احکامِ شرع کی پابندی اور دیانت و امانت کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور ان میں بڑا مذہبی جوش تھا ۔ تمام شہروں میں افسرانِ احتساب یا محتسب مقرر تھے جنہیں " امین " کہا جاتا تھا ۔ امین کا فرض تھا کہ وہ ہر روز بازاروں اور منڈیوں میں چکر لگائے ۔ تمام اشیاء کے نرخوں پر کڑی نظر رکھے اور اس بات کی نگرانی بھی کرے کہ کوئی شخص کم تو نہیں تولتا یا مقررہ قیمت سے زیادہ تو وصول نہیں کرتا ۔ محتسب کے ذمہ اس بات کو بھی یقینی بنانا تھا کہ لوگ

اپنے جانوروں پر ظلم نہ کریں، نہ ان سے حد سے زیادہ کام لیں، نہ انہیں بھوکا پیاسا رکھیں اور نہ ان کو بے تحاشا ماریں پیٹیں۔ اسی طرح بچوں کو ان کے استاد اور سرپرست زیادہ نہ ماریں۔ محتسب کو سزا دینے کے بھی کچھ اختیارات حاصل تھے لیکن مؤرخین نے ان کی تفصیل نہیں دی۔ محتسب (امین) حکام (ولاۃ، قضاۃ، عمال) کے بارے میں مخبر یا پرچہ نویس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اگر ان میں سے کسی کی شہرت بری ہو یا اس نے کسی معاملہ میں صریح ناانصافی کی ہو تو محتسب (امین) کا فرض تھا کہ اس کی اطلاع خلیفہ کو پہنچائے۔ اس طرح تمام نظم مملکت میں ایک خوشگوار توازن قائم ہو گیا تھا۔

مالیات

دولتِ موحدین مالی لحاظ سے نہایت مستحکم اور خوشحال سلطنت تھی۔ حکومت کے بڑے بڑے ذرائعِ آمدنی حسبِ ذیل تھے۔

(۱) زراعتی پیداوار کا لگان۔

(۲) باغات کے پھلوں کا لگان۔

(۳) خراج (اس میں عشر اور جزیہ بھی شامل تھا)

(۴) زکوٰۃ و صدقات۔

(۵) فئے (محارب قوموں کا جو مال بغیر کسی قسم کی جنگ و جدال کے ہاتھ آئے وہ فئے کہلاتا ہے)

(۶) معدنیات۔

(۷) سامانِ تجارت پر محصول۔

(۸) صنعت و حرفت۔

شعبۂ مالیات کی نگرانی بالعموم وزیر مملکت کرتا تھا، اس کی مختلف شاخوں میں ایسے افسروں اور کارکنوں کا تقرر کیا جاتا تھا جن کی دیانت وامانت شک و شبہ سے بالا ہوتی تھی۔

مغرب (مراکش، تونس، الجزائر) اور اندلس میں بے شمار قطعات زمین ایسے تھے جو سونا اگلتے تھے اور پھر پانی کی بہم رسانی کے عمدہ انتظامات کی بدولت بھی زراعت نے زبردست ترقی کی تھی۔ بہت سی زمینیں باغات کے لیے بھی موزوں تھیں چنانچہ مملکت کے دونوں بازوؤں میں جدھر دیکھیں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز وشاداب باغات نظر آتے تھے جن میں انواع واقسام کے پھل پیدا ہوتے تھے۔ اس طرح صرف زراعت اور باغات کی آمدنی لاکھوں دینار تک پہنچتی تھی۔ لوگ خوشحال تھے اور ان پر دینی رنگ غالب تھا اس لیے زکوٰۃ وصدقات سے بھی کثیر آمدنی ہوتی تھی جو بیت المال میں داخل کی جاتی تھی اور غریبوں مسکینوں کی اعانت اور رفاہِ عامہ کے کاموں پر صرف کی جاتی تھی۔ ملک میں چاندی، لوہے، گندھک، رانگ اور پارہ وغیرہ کی بہت سی کانیں تھیں جن سے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی[1]۔ مختلف اشیاء کی تجارت اور صنعت وحرفت بھی بڑے عروج پر تھی بالخصوص اندلس میں تو صنعت وحرفت درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ قرطبہ اور اشبیلیہ میں چاقو

---

[1] چند مشہور کانوں کی تفصیل یہ ہے:۔

(المغرب) تمسامان، اینستار میں لوہے کی کانیں تھیں۔ ورکناس اور زجندر میں چاندی کی کانیں تھیں۔ طلمیشہ کے قریب گندھک کی کان تھی، سوس میں تانبے اور توتیا کی کانیں تھیں۔

(اندلس) شنتترہ میں چاندی کی کانیں، شلون میں پارے کی کان، ولایہ میں رانگے کی کان، البکارش اور رادربہ میں لوہے کی کانیں تھیں۔ ملاغہ اور بیجا میں ہیرے کی کانیں تھیں۔

چھریاں اور تلواریں وغیرہ نہایت اعلیٰ بنتی تھیں، قرطبہ کا چمڑا، ریشم، ہاتھی دانت کا کام اور سوتی کپڑا نہایت عمدہ ہوتا تھا، اشبیلیہ کے ریشم کے کارخانوں میں لاکھوں جولاہے کام کرتے تھے۔ بلنسیہ میں روغنی مٹی کے اور ملاغہ میں چینی اور شیشہ کے نہایت نفیس برتن بنتے تھے۔ غرناطہ کا حریرا اور فولادی تلواریں ساری دنیا میں مشہور تھیں۔ شاطبہ کاغذسازی کا مرکز تھا۔

المغرب میں بھی مراکش، فاس، مکناسہ، تارودانت، زجندر، تلمسان وغیرہ تجارت اور صنعت وحرفت کے مرکز تھے۔ روئی، زعفران، کاغذ، ریشمی و سوتی کپڑے، مختلف اقسام کے پھل، چمڑا، تلواریں اور روغن زیتون وغیرہ خاص اشیائے تجارت تھیں [1] اور شمالی افریقہ اور اندلس کے ساحلوں پر لاتعداد جہاز اشیائے

---

[1] مسلمانانِ اندلس نے صنعت وحرفت کے ہر شعبے میں کمال کر دکھایا تھا۔ سید امیر علی "مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب" میں لکھتے ہیں۔ "عربوں نے ہسپانیہ میں ریشم کتان اور اونی کپڑے کے کارخانے جاری کیے۔ رنگسازی میں بھی کمال دکھایا۔ نیل ان ہی کی ایجاد ہے، امٹی ظروف سازی (وغیرہ) میں انہوں نے اپنے کمال کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا تھا۔ چمڑے کے کمانے اور رنگنے کے وہ استاد تھے۔ لوہا اور فولاد بڑی مقدار میں تیار کرتے تھے۔ وہ سونا چاندی، خام پیتل، ریشم، ریشمی پارچات، کھانڈ، پارہ، سجی، پکا لوہا، زیتون، اونی کپڑے، عنبر، جونا، مومیائی، بلور، ابرق، ادرک، سونٹھ اور کئی دیگر مسالے ہیرے یاقوت وغیرہ بیرونی دنیا کو بھیجتے تھے۔"

اکثر مؤرخین نے مختلف فنون میں اہلِ اندلس کی مہارت کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ معدنی چیزوں (سونا چاندی لوہا پیتل وغیرہ) کے ڈھالنے میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے شیشہ سازی، پچی کاری، کوزہ گری، مہر کنی، روشنائیاں بنانے اور جلد سازی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ المغرب کے کئی شہروں کے لوگ بھی مختلف فنون میں ماہر تھے۔

تجارت کی نقل و حمل میں مصروف رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی نے بھی ملک کی خوشحالی میں زبردست اضافہ کیا تھا۔

اشاعتِ تعلیم

یعقوب المنصور کے علمی ذوق، معارف پروری اور اہلِ علم و ہنر کی قدردانی کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اشاعتِ تعلیم پر سب سے پہلے اس کے دادا عبدالمومن بن علی نے ذاتی توجہ دی تھی اور اپنی مملکت کے طول و عرض میں بے شمار مدارس و مکاتب قائم کر دیئے تھے۔ ابو یعقوب یوسف بھی علم و ہنر کی اشاعت میں اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلا، اس کے بعد یعقوب المنصور کا دور آیا تو وہ بھی اس معاملے میں اپنے باپ اور دادا سے پیچھے نہ رہا۔ قدیم مدرسوں کے علاوہ اس نے کئی نئے مدرسے بھی قائم کیے اور ان کے لیے شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں۔ مُوَحِّدین سے پہلے شمالی افریقہ میں قیروان بہت بڑا دارالعلم تھا اور باشندگانِ مغرب تحصیلِ علم کے لیے دور دراز کا سفر طے کر کے وہاں جایا کرتے تھے۔ لیکن مُوَحِّدین کے زمانے میں یہ شہر بے رونق ہو گیا اور اس کے علماء و فضلاء دوسرے شہروں اور ملکوں میں جاکر آباد ہو گئے۔ یعقوب المنصور کے زمانے میں عام مدرسوں کے علاوہ متعدد بڑی بڑی درس گاہیں بھی قائم تھیں۔ موجودہ زمانے کے معیار کے مطابق انہیں کالج یا یونیورسٹیاں (دانش گاہیں) بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایسی بڑی درس گاہوں کا سراغ شہر مراکش، فاس، تلمسان، سجلماسہ، اشبیلیہ اور قرطبہ میں ملتا ہے جہاں لوگ دُور دُور سے آکر اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ ان مدرسوں اور بڑی درس گاہوں میں قرآن اور حدیث کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا تھا اور (ایک مختصر عرصے کے سوا) دوسرے علوم بھی ثانوی حیثیت سے پڑھائے جاتے تھے۔ یعقوب المنصور طلبۂ حدیث پر بہت مہربان تھا، ان کی ذاتی طور پر خاص

سرپرستی کرتا تھا اور علم حدیث میں امتیاز حاصل کرنے والے طلبہ کو دل کھول کر انعام دیا کرتا تھا۔

علامہ عبدالواحد مراکشی کے بیان کے مطابق وہ خط لکھ کر مختلف بلاد سے مختلف فنون اور بالخصوص علوم نظری کے علماء کو اپنے دربار میں بلایا کرتا تھا، یہ علماء "طلبۃ الحضر" کہلاتے تھے ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، علماء کی ایک اور جماعت "طلبۃ الموحدین" کے نام سے موسوم تھی اس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ المصامدہ (قبائل موحدین) کے بارے میں ہر قسم کی معلومات جمع کرتے رہیں۔ خلیفہ کا حکم تھا کہ جس مجلس میں وہ موجود ہو ان طلبہ کے شیوخ میں سے بھی کوئی نہ کوئی وہاں ضرور حاضر ہو۔ سب سے پہلے خلیفہ کسی علمی مسئلے پر گفتگو کا آغاز کرتا تھا اور اس کے بعد دوسرے لوگ گفتگو میں حصہ لیتے تھے۔ آخر میں خلیفہ دعا کرتا تھا اس کے جواب میں وزیر بلند آواز سے آمین کہتا تھا۔ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے کہ یعقوب المنصور نے طلبہ کے امتحان اور نگہداشت کے لیے ممتحن اور افسران معائنہ بھی مقرر کر رکھے تھے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یعقوب المنصور نے سرقسطہ (SARAGOSA) اندلس میں جہاں اسلامی تعلیم کے لیے بہت سے مدارس قائم کیے وہاں عیسائیوں کے لیے بھی ایک الگ مدرسہ قائم کیا، جہاں وہ آزادی سے اپنی مذہبی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ اس روایت سے قیاس کیا جاتا ہے کہ بعض دوسرے شہروں میں بھی عیسائیوں کے لیے مدارس قائم کیے گئے ہونگے۔

بری اور بحری فوج

یعقوب المنصور ایک عظیم الشان سلطنت کا فرمانروا تھا جو لاکھوں مربع میل پر محیط تھی۔ اس کے دو بازو تھے، ایک براعظم یورپ میں واقع تھا اور دوسرا براعظم افریقہ میں۔ ان کے درمیان بحیرہ روم کا نیلگوں پانی موجیں مارتا تھا۔ اس وسیع

سلطنت کو سنبھالنے کے لیے یعقوب المنصور کو ایک زبردست بری اور بحری فوج کی ضرورت تھی۔ مختلف مؤرخین نے اس کی عسکری قوت کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں لکھا لیکن ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بری فوج دو حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو باقاعدہ تنخواہیں پاتے تھے اور دوسرے وہ جو ضرورت پڑنے پر رضا کارانہ فوج میں شامل ہو جاتے تھے اول الذکر لوگوں پر "باقاعدہ فوج" کا اطلاق ہوتا تھا۔ خاص مراکش میں جو باقاعدہ (تنخواہ دار) فوج مستقل طور پر موجود رہتی تھی وہ دس ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی اور "الجموع" کہلاتی تھی، اس کے علاوہ تمام بڑے شہروں اور اہم مقامات پر بھی باقاعدہ فوج کی ایک معقول تعداد مستقل طور پر موجود رہتی تھی۔ خاص مراکش کی فوج براہِ راست خلیفہ کے ماتحت تھی اور دوسرے مقامات کی فوجیں وہاں کے ولاۃ کے ماتحت ہوتی تھیں جن کو وہ خلیفہ کے حکم کے مطابق (یا مقامی شورشوں کو رفع کرنے کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق) حرکت میں لاتے تھے۔ رضا کار فوج "العموم" (یعنی عام لوگ) کے نام سے موسوم تھی تنخواہ دار مستقل فوج کو تو مختلف فنونِ حرب و ضرب میں باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی اور وہ خوب قواعد دان اور ضابطہ کی پابند ہوتی تھی ۔۔۔ البتہ رضا کار مجاہدوں کو سرکاری سطح پر تربیت نہیں دی جاتی تھی، لیکن وہ فطری طور پر جنگ آزما لوگ ہوتے تھے اور قبائلی روایات کے مطابق شہسواری، شمشیر زنی اور نیزہ بازی وغیرہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ یہ لوگ جذبۂ جہاد سے سرشار ہوتے تھے اور مذہبی جوش اور جذبے کے زیرِ اثر میدانِ کارزار میں باقاعدہ فوج کے ہم پلّہ ثابت ہوتے تھے۔

یعقوب المنصور نے اپنی فوج کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس کر رکھا تھا اور اس کے اسلحہ خانوں میں ہر قسم کے عمدہ ہتھیار کثیر تعداد میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ان میں تلواریں، نیزے، برچھے، اگرزہ، زرہیں، ڈھالیں، تیر، کمانیں وغیرہ ہر قسم کے ہتھیار

شامل تھے۔ ان کے علاوہ فوج کے پاس منجنیقوں اور دوسرے قلعہ شکن آلات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا جنہیں قلعوں پر حملہ کرتے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ یعقوب المنصور نے گھوڑوں کی پرورش اور غور و پرداخت پر بھی خاص توجہ دی چنانچہ اعلیٰ النسل کے ہزاروں گھوڑے فوج کے پاس ہر وقت موجود رہتے تھے اور اس کے سوار دستے (رسالے) بہت مضبوط تھے۔

رسد اور جنگی سامان کی نقل و حمل کے لیے گھوڑوں کے علاوہ خچر، گدھے اور اونٹ بھی کام میں لائے جاتے تھے۔

یعقوب المنصور کی بحری فوج بھی بڑی طاقتور تھی اور اس کے پاس سینکڑوں جہازوں پر مشتمل نہایت مضبوط بحری بیڑا تھا۔ مؤرخین نے اس کے بحری جہازوں کی تعداد کی تصریح نہیں کی لیکن قیاس یہ ہے کہ جنگی جہازوں اور کشتیوں کی مجموعی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ یہ جہاز بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس میں ہر وقت گشت کرتے رہتے تھے اور اسلامی اندلس اور شمالی افریقہ کے ساحلوں کو یورپی غارت گروں کے حملوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ اندلس اور مغرب کی کئی بندرگاہوں میں بحری جہاز اور کشتیاں مسلسل تیار ہوتی رہتی تھیں [1]۔

یعقوب المنصور کی بری اور بحری فوج میں مختلف بربری قبائل کے علاوہ عرب، غز، اندلسی اور رومی ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔

---

[1] موحدین کے مشہور بحری سلاح خانے یہ تھے:

(اندلس) شلب، جبل الطارق، طرطوشہ، دانیہ، شنتمریہ، القصر، شلتیش، المریہ، مالقہ

(مغرب) تونس، المہدیہ، بجایہ، سلا، انفا (کاسابلانکا یا دار البیضاء) اوران، الجزائر، بادس، ہنین۔

امورِ رفاہِ عامہ
اور
تعمیرات
(Public Works)

○

خلیفہ یعقوب المنصور نے رفاہِ عامہ اور تعمیرات کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، تمام مشرقی اور مغربی مؤرخین اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ دُکھی انسانیت کو آرام پہنچانا ایک اچھے حکمران کا فرض اوّلین ہوتا ہے۔ المنصور ایک دیندار خداترس اور دردمند انسان تھا۔ چنانچہ اس نے لوگوں کے دُکھ درد دور کرنے کو سب کاموں پر ترجیح دی اور اس سلسلے میں اس کی گرانقدر مساعی نے تاریخ اسلام میں ایک شاندار باب کا اضافہ کیا۔ اس نے اپنی سلطنت کے ہر شہر میں شفاخانے قائم کیے جہاں نہایت اچھے اطباء کام کرتے تھے اور انہیں حکومت کی طرف سے معقول مشاہرہ اور کئی دوسری سہولتیں دی جاتی تھیں۔ ہر شفاخانے سے بیماروں کو کھانا اور دوائیں مفت ملتی تھیں اور ان کی اقامت کے لیے عمدہ انتظام کیا گیا تھا۔ ان سب شفاخانوں کا سرتاج وہ عظیم الشان بیمارستان (شفاخانہ یا ہسپتال) تھا جو المنصور نے خاص شہر مراکش میں قائم کیا تھا۔ گو المنصور سے پہلے اور بعد میں بھی کئی مسلمان حکمرانوں نے متعدد عظیم الشان اور مثالی بیمارستان قائم کیے[1] لیکن مراکش کا مذکورہ بیمارستان اپنی بعض

---

[1] اس قسم کے چند مشہور بیمارستانوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) جذامیوں کا بیمارستان۔ یہ بیمارستان خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ۸۸ھ میں دمشق میں بنوایا تھا۔ یہ جذامیوں کے لیے مخصوص تھا اور اس میں ماہر اطباء کام کرتے تھے۔

(۲) ہارون الرشید کا بیمارستان۔ یہ شاندار شفاخانہ خلیفہ ہارون الرشید نے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خصوصیات کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ مختلف مؤرخین نے اس کے جو حالات لکھے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

بیمارستانِ کبیر مراکش

اس کی تعمیر کے لیے شہر کے ایک معتدل مقام میں ایک نہایت وسیع میدان منتخب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بغداد میں بنوایا تھا۔ اس کی نگرانی جبریل بن بختیشوع، ماسویہ اور یوحنا جیسے یکتائے روزگار اطباء کرتے تھے۔

(۳) بیمارستان عضدی۔ یہ شفاخانہ عضدالدولہ بن بویہ نے ۳۷۱ھ میں بغداد میں بنوایا تھا۔ اس میں طبیبوں، جراحوں، کحالوں (امراضِ چشم کے ماہروں) مرہم پٹی کرنے والوں اور فصد لینے والے ماہروں کی ایک کثیر تعداد کام کرتی تھی۔ عضدالدولہ نے ساڑھے سات لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر اس کے لیے وقف کردی تھی۔ ہر مریض کو دوا اور غذا بلا قیمت دی جاتی تھی۔

(۴) بیمارستانِ کبیر دمشق۔ یہ بیمارستان مجاہدِ اعظم سلطان نورالدین محمود زنگیؒ نے دمشق میں بنوایا تھا: اس میں بیماروں کے آرام و راحت کے تمام سامان مہیا کردیئے گئے تھے اور ان کو نہایت قیمتی دوائیں اور عمدہ غذائیں مفت دی جاتی تھیں۔

(۵) دارالمرضیٰ صلاح الدین غازیؒ۔ مجاہد کبیر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے (جو خلیفہ یعقوب المنصور کا ہمعصر تھا) قاہرہ اور سکندریہ میں دو شاندار دارالمرضیٰ بنوائے جن میں ہر قسم کے مریضوں کے علاج معالجہ کا نہایت اعلیٰ انتظام تھا۔

(۶) بیمارستانِ کبیر قاہرہ۔ یہ بیمارستان مملوک حکمران ملک منصور قلاؤن نے ۶۸۳ھ میں قاہرہ میں بنوایا۔ اس نے دس لاکھ درہم سالانہ کی جائداد اس کے لیے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا گیا اور خلیفہ کی ذاتی نگرانی میں بیمارستان کی تعمیر شروع کی گئی، معماروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ نہ صرف عمارت کے استحکام اور پائداری کو پیش نظر رکھیں بلکہ اس کی اندرونی و بیرونی تزئین و آرائش اور حُسن پر بھی خاص توجہ دیں۔ جب یہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو جہاں اپنی وسعت، شکوہ اور استحکام کے لحاظ سے کسی اہم اور مضبوط قلعے سے کم نہ تھی وہاں اس کی داخلی اور خارجی زیب و زینت اسے حُسنِ تعمیر کا ایک عظیم شاہکار کہلائے جانے کا مستحق ٹھہراتی تھی۔ اس میں بیشمار کمرے بنائے گئے تھے جن کی دیواروں پر دلکش اور پائدار رنگوں میں ایسے عجیب غریب نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے گئے تھے کہ انہیں دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں اور طبیعت میں بے اختیار فرحت پیدا ہوتی تھی۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ آرائشیں ایسی تھیں کہ ان سے بہتر ایجاد و اختراع ہونا مشکل ہے۔ عمارت کی تکمیل کے بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ اس

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)۔ وقف کر دی تھی۔ اور اس کے وقف نامہ میں لکھا تھا کہ بادشاہ سے لے کر غلام تک کے لیے یہ شفاخانہ عام ہے۔ یہ شفاخانہ اپنی وسعت اور شان و شوکت میں کسی شاہی محل سے کم نہیں تھا اس میں ہر قسم کے مریضوں کے لیے الگ الگ ایوان بنائے گئے تھے اور ہر ایوان یا صیغے کے اطبا اور ان کے مددگار بھی الگ الگ تھے۔ دواؤں اور کھانے وغیرہ کی کوئی قیمت مریضوں سے نہیں لی جاتی تھی۔ مؤرخین نے اس شفاخانے کی بیحد تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ روزانہ کئی ہزار مریض شفاخانے میں آتے تھے اور معمولی دواؤں کو چھوڑ کر جو روزانہ خرچ ہوتی تھیں خاص دواؤں میں صرف شربت انار کے پانچ سو رطل خرچ ہوتے تھے۔

مذکورہ شفاخانوں کے علاوہ اسلامی دنیا میں بیسیوں عظیم الشان شفاخانے قائم ہوئے اور بیشمار مصیبت زدہ لوگ ان سے سالہا سال تک فیض یاب ہوتے رہے۔

کے اردگرد ایک جنت نظیر باغ لگایا جائے۔ چنانچہ قسم قسم کے پھلدار درختوں کے علاوہ اس میں رنگا رنگ پھولوں کے ہزارہا پودے لگائے گئے اور مخملی گھاس اور عطر بیز پھولوں کے ایسے تختے اور قطعے بنائے گئے کہ انسان اس عمارت کے احاطے میں داخل ہو کر اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا تھا۔ بیمارستان میں صاف و شفاف پانی کی نہریں اس کثرت سے جاری کی گئیں کہ ہر حصے میں پانی پہنچتا تھا۔ ہر نہر کے کنارے سنگِ مرمر کے تھے، ان کی تہہ پختہ تھی اور اس پر قیمتی سنگریزے ڈالے گئے تھے۔ خواہ کیسا ہی موسم ہو نہروں کا پانی گدلا نہیں ہوتا تھا۔ عمارت کے وسط میں چار حوض بنائے گئے جن میں سے ایک سفید سنگِ خام کا تھا، علامہ عبدالواحد مراکشی نے "المعجب" میں لکھا ہے کہ:

"عمارت میں صدف، کتان، حریر اور چمڑے کے ایسے ایسے نفیس فرش بچھائے گئے جو حدِ وصف سے بالا اور تعریف سے مستغنی ہیں۔"

فی الحقیقت یہ عمارت رشکِ خُلد تھی اور مریض کی آدھی بیماری تو اس میں قدم رکھتے ہی دُور ہو جاتی تھی۔ خلیفہ کے حکم سے اس بیمارستان میں قابل ترین اطبا کا تقرر کیا گیا۔ ان کے علاوہ دوائیں تیار کرنے والے، مرہم پٹی کرنے والے ماہرین اور متفرق اقسام کے شربت روغن اور سرمے وغیرہ تیار کرنے والے بےشمار عطار بھی مقرر کیے گئے۔ مریضوں کی خبرگیری اور خدمت کرنے والے خدام ان پر مستزاد تھے۔ ان سب کو معقول مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ بیمارستان میں مریضوں کے قیام اور طعام کا بہترین انتظام تھا، مطبخ بیمارستان سے ملحق ایک شاندار عمارت میں تھا۔ اس میں بہت سے باورچی ملازم تھے جو انواع و اقسام کے کھانے پکانے میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ ہر مریض کو اس کے مرض کی نوعیت کے مطابق غذائیں دی جاتی تھیں اگر کسی مریض کو مقوی اور قیمتی خوراک کی ضرورت ہوتی تھی تو اس کے مہیا کرنے کا بھی

معقول انتظام تھا۔ اس میں قسم قسم کے لذیذ کھانے، گوشت، مرغ، مٹھائیاں اور بہترین پھل شامل تھے۔ صرف مطبخ کا روزانہ خرچ تیس دینار طلائی تھا جو آج کل کے حساب سے مطابق ساٹھ ہزار روپے کے قریب بنتا ہے[1] دواؤں کی خرید، تیاری اور تقسیم پر جو خرچ اٹھتا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔ بیمارستان کا ایک شعبہ مریضوں کے لیے خاص لباس تیار کرنے کے لیے وقف تھا۔ اس میں موسم کے مطابق مریضوں کے لیے دن اور رات کے استعمال کے الگ الگ لباس تیار کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے لیے نہایت آرام دہ بستر بھی تیار کیے جاتے تھے۔ ہر قسم کے کپڑوں کی دھلائی کا بھی بہترین انتظام تھا۔ مریضوں سے قیام طعام لباس اور دواؤں کی مطلق کوئی قیمت نہیں لی جاتی تھی، اس کے برعکس اگر مریض مفلس ہوتا تو جب وہ بیمارستان سے شفایاب ہو کر رخصت ہونے لگتا تو اسے اسقدر مال وزر دیا جاتا کہ ساری عمر آسودگی سے بسر کر سکے، اس بیمارستان کی یہ خصوصیت ایسی تھی کہ اس سے پہلے یا بعد قائم ہونے والا کوئی بیمارستان اس کی مثال نہ پیش کر سکا۔ اگر بیمار غنی اور تونگر ہوتا تو رخصت ہوتے وقت اس کا تمام مال واسباب پوری احتیاط اور چھان بین کے ساتھ اس کے حوالے کر دیا جاتا۔ اس بیمارستان کے دروازے شاہ سے لے کر گدا تک کے لیے ہر وقت کھلے تھے۔ اگر مراکش میں کوئی پردیسی مسافر بھی بیمار ہو جاتا تو اسے فوراً اس بیمارستان میں پہنچا دیتے اور جب تک وہ شفایاب نہ ہو جاتا اس کے علاج معالجہ اور دیکھ بھال پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اگر قضائے الٰہی سے وہ انتقال کر جاتا تو اس کی تجہیز وتکفین کا

---

[1] سونے کی قیمت میں کمی بیشی کے مطابق اس تخمینے میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

بندوبست حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

ہر جمعہ کو نماز سے فارغ ہو کر امیر المومنین یعقوب المنصور خود بیمارستان میں جاتا اور ہر مریض کی فرداً فرداً عیادت کرتا، اس کا اپنا اور اس کے گھر والوں کا حال پوچھتا پھر اس سے دریافت کرتا کہ بیمارستان میں اس کی دیکھ بھال کیسے ہو رہی ہے؟ کیا وہ اس سے مطمئن ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر مریض اپنے علاج معالجہ اور نگہداشت کی طرف سے اطمینان کا اظہار کرتا تو خلیفہ خوش ہو جاتا، مریض کو حوصلہ تسلی دیتا اور اس کی جلد صحت یابی کے لیے دعا کر کے بیمارستان سے رخصت ہوتا۔ اس کی یہ عادت وفات کے دن تک برابر جاری رہی۔

شفاخانوں کے علاوہ خلیفہ یعقوب المنصورؒ نے اپنی سلطنت میں جابجا غریب خانے (یا محتاج خانے) بنوائے۔ ان میں ایسے بوڑھے اور ضعیف لوگ رکھے جاتے تھے جن کا کوئی کفیل نہیں ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی تمام ضروریات حکومت کی طرف سے پوری کی جاتی تھیں اور موت کے بعد ان کے کفن دفن کا انتظام بھی سرکاری خرچ پر کیا جاتا تھا۔

اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ عباسی خلفاء ہارون الرشید، مامون الرشید اور اندلس کے اموی بادشاہوں کی طرح خلیفہ یعقوب المنصورؒ نے زراعت کی ترقی پر بڑی توجہ دی اور اپنے مقبوضات میں نہروں کا جال بچھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سلطنت میں ہر طرف سرسبز و شاداب باغ اور ہرے بھرے کھیت لہلہاتے نظر آتے تھے اور انواع و اقسام کے غلے سبزیاں اور پھل بڑی افراط سے پیدا ہوتے تھے۔ المنصورؒ نے نہروں اور دریاؤں پر کئی مضبوط پل بھی تعمیر کرائے۔

المنصورؒ نے تجارت کے فروغ کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے۔ اس نے تمام ناجائز محاصل موقوف کر دیئے اور تاجروں اور مسافروں کی حفاظت اور

آسائش کے لیے جا بجا سرائیں مسافر خانے اور پولیس کی چوکیاں قائم کیں۔ ملک میں ایسا امن و امان تھا کہ کوئی شخص کھلے بندوں سونا اچھالتا جائے، کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ اس طرح برآمدات اور درآمدات میں زبردست اضافہ ہوا اور لوگ آسودہ حال ہو گئے۔

یعقوب المنصور کے ذاتی اوصاف میں ذکر آچکا ہے کہ وہ علم و ہنر کا بڑا سرگرم سرپرست تھا لیکن علوم اسلامی کے بارے میں وہ چند مخصوص نظریات کا حامل تھا۔ وہ علوم قرآن و حدیث اور ان سے قرابت قریبہ رکھنے والے علوم کا قائل تھا اور دوسرے علوم کی اشاعت اس کو پسند نہ تھی۔ علامہ عبدالواحد مراکشی کا بیان ہے کہ اس کے عہد میں علم الفروع بالکل منقطع ہو گیا تاہم تفسیر و حدیث کو زبردست فروغ ہوا کیونکہ خلیفہ ان علوم کے حاصل کرنے والوں کی حد سے زیادہ حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرتا تھا۔ اس کی سلطنت میں بے شمار مکاتب و مدارس تھے اور ان میں قرآن اور حدیث کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا تھا۔

خلیفہ یعقوب المنصور کو عمارات تعمیر کروانے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ اس نے مغرب اور اندلس کے کئی شہروں میں کئی شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں جو آج بھی بڑی اچھی حالت میں موجود ہیں اور اس نامور فرمانروا کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ ان میں سے چند عمارتوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) جامع کتبیہ (یا الکتبیین) یہ جامع مسجد شہر مراکش کے مغربی حصہ میں واقع ہے اور نہایت وسیع اور شاندار ہے۔ اس کی بناء ابو یعقوب یوسف نے ڈالی تھی اور تکمیل یعقوب المنصور نے ۵۹۲ھ / ۱۱۹۶ء میں کی۔ اس کے نیچے کئی سو کتب فروشوں کی دکانیں ہیں، اسی لیے اس کا نام جامع کتبیہ پڑ گیا۔ اس کا منارہ بلندی اور استحکام کے لحاظ سے ساری دنیا کے میناروں میں امتیازی حیثیت رکھتا

ہے۔ اس کی سات منزلیں ہیں۔ بنیاد سے چوٹی تک بلندی ۲۷۰ فٹ ہے اور چوڑائی ۵۰ فٹ ہے۔ دہلی کا قطب مینار (تعمیر ۱۲۳۰ء) دنیا کے بلند ترین میناروں میں شمار ہوتا ہے، اس کی بلندی ۲۳۸ فٹ اور چوڑائی ½ ۴۷ فٹ ہے گویا ارتفاع اور دَور میں وہ جامع کتبیہ کے مینار سے دوسرے درجے پر ہے۔

مشہور سیاح ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس مسجد اور مینار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"کتبیوں کی مسجد بہت بڑی ہے۔ اس کا ایک مینار نہایت عجیب اور بلند ہے۔ اس کی چوٹی سے تمام شہر نیچے نظر آتا ہے۔"

(۲) **رباط الفتح** ۔ اس شہر کی داغ بیل ابو لعقوب یوسف نے ڈالی اور یعقوب المنصور نے اسے بڑی حد تک پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ شروع شروع میں اس شہر کی حیثیت ایک رباط یا لشکر گاہ کی تھی۔ یعقوب المنصور نے الارک کی فتح کی یادگار میں اس کو رباط الفتح کا نام دے دیا۔ اس کی شہر پناہ نہایت بلند اور مضبوط تھی جس کے پہلوؤں میں چوکور برجیاں تھیں ۔ یہ شہر سمندر اور دریا کے کنارے ۴۵۰ ہیکٹر (HECTARES) کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ (علامہ عبدالواحد مراکشی نے اس کا طول ایک فرسنگ لکھا ہے) فصیل کا بہت سا حصہ ابھی تک موجود ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً چار میل ہے اس کے دو عظیم الشان دروازے بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ شہر کے اندر مسجدیں، مدرسے، بیمارستان، محتاج خانے اور رہائشی مکان سبھی اپنی مثال آپ تھے۔ آج کل دورِ جدید کی عمارتوں نے اس کی ہیئت بالکل تبدیل کر دی ہے پھر بھی یعقوب المنصور اور اس کے جانشینوں کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں ابھی تک باقی ہیں۔

(۳) **جامع رباط الفتح اور اس کا ماذنہ** ۔ یہ عظیم الشان مسجد یعقوب المنصور نے ۵۹۱ھ / ۱۱۹۵ء میں تعمیر کروائی۔ اس کی شکل مستطیل تھی۔ طول ۶۱۰ فٹ اور عرض

۷۰×۴۰ فٹ تھا۔ اس میں داخل ہونے کے سولہ دروازے تھے اور تین صحن تھے۔ ان کے علاوہ ایک دیوان صلوٰۃ تھا جس کی چھت کو دو سو مضبوط اور خوبصورت ستون تھامے ہوئے تھے۔ اس کا ماذنہ اسکندریہ کے مینار کی طرح ہے جس پر بغیر درجوں کے چڑھ سکتے ہیں۔ اس ماذنہ کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ یعقوب المنصور وفات پا گیا۔ یہ نامکمل ماذنہ بھی ۱۶۵ فٹ بلند ہے جو ایک پچپن فٹ بلند کرسی پر بنایا گیا ہے۔ اس کی دیواریں آٹھ فٹ چوڑی ہیں اور اس کی بالائی منزل تک ایک دو گز چوڑا خمدار زینہ جاتا ہے۔ یہ ماذنہ "برج حسن" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی زیبائش، حسنِ تعمیر اور غیر معمولی العباد کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

(۴) قلعہ حصن الفرج (AZNALFARACHE)

یہ قلعہ یعقوب المنصور نے ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں اشبیلیہ کے قریب اشرف (AJCARFE) کے سب سے تنگ اور بلند مقام پر تعمیر کروایا۔ یہ نہایت مضبوط اور شاندار قلعہ دریا کے کنارے پر تھا۔ اور بڑا خوش منظر تھا۔ خلیفہ کے حکم سے اس کے اندر کئی خوبصورت محل اور برج بھی بنوائے گئے۔ اس دور کے بہت سے شعراء نے اس قلعہ کی مدح میں نظمیں لکھیں اور خلیفہ سے بیش بہا انعام پایا۔

(۵) جیرالڈا کا مینار (GIRALDA)

یہ عظیم الشان مینار یعقوب المنصور نے ۵۹۱ھ / ۱۱۹۵ء میں شہر اشبیلیہ (SEVILLE) میں بنوایا تھا۔ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ اس عظیم الشان مسجد کا مینار ہے جسے یعقوب المنصور نے ۵۹۱ھ / ۱۱۹۵ء میں تعمیر کروایا تھا اور جس کو بعد میں عیسائیوں نے گرجا کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یعقوب المنصور نے اس کو ایک رصدگاہ (OBSERVATORY) کے طور پر تعمیر کروایا تھا۔ (واللہ اعلم) یہ سرخ اینٹوں کی ایک نہایت خوبصورت

مکعب عمارت ہے۔اس کی بنیاد پچاس فٹ مربع ہے۔ اصلی بلندی ۳۰۰ فٹ تھی۔ ۸۷ فٹ تک پتھر کی عمارت ہے اس سے اوپر کی تعمیر سرخ اینٹوں سے کی گئی ہے۔ اینٹ کی دیواروں کی موٹائی نیچے نو فٹ ہے اور اوپر ۴½ فٹ۔ یہ مینار صقلیہ (سسلی) کے ایک ماہر تعمیرات الولیث کی نگرانی میں بہت سے باکمال کاریگروں نے تعمیر کیا۔

اس مینار کے باہر کی جانب پتھر کی ترشی ہوئی جالیاں اور جابجا کھڑکیاں ہیں جن میں سے بعض کی محرابیں پھیلی ہوئی ہیں اور بعض پھول دار اور نکیلی ہیں۔اس کے نچلے حصہ میں نہایت دلکش اقلیدسی نقش و نگار ہیں۔

پروفیسر ارنسٹ کوہنل کا بیان ہے کہ "اس مینار کے اوپر کا حصہ ۱۳۵۵ء کے زلزلہ میں تباہ ہو گیا تھا جس کو ۱۵۶۰ء میں برناں رئز نے دوسرے طور پر بنوایا۔ اس کے اوپر ایک مجسمہ تھا جو ہوا کے ساتھ رُخ بدلتا تھا اسی لیے مینار کا نام جیرالڈ پڑ گیا۔"

ایک دوسرے مستشرق ڈاکٹر گستاؤلی بان نے لکھا ہے کہ:

"پہلے اس مینار کے اوپر ایک مطلا فلزی کرہ تھا۔ اب اس کی جگہ ایک گھنٹہ نصب کیا گیا ہے جس پر ایک مورت دینِ عیسوی کی علامت کے طور پر نصب کی گئی ہے۔"

ہمیں ڈاکٹر گستاؤلی بان کا بیان درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اصل عمارت کے اوپر مسلمان (بالخصوص مُوحّدین) کوئی مجسمہ نصب نہیں کر سکتے تھے۔ مجسمہ بعد میں عیسائیوں نے نصب کیا۔ اب اس مینار اور اس کی عمارت سے گھنٹہ گھر اور گرجا کا کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ **الصالحہ کی عمارات**:۔ یعقوب المنصور مسندِ خلافت پر بیٹھا تو اس

نے محسوس کیا کہ اس کے باپ اور دادا کی اقامت گاہ "دار الحجر" بہت تنگ اور گنجان ہے (یہ عمارت مرابطین نے اپنے دور میں تعمیر کروائی تھی) چنانچہ اس نے حکم دیا کہ مراکش سے متصل ایک اور بستی "الصالحہ" کے نام سے تعمیر کی جائے۔ یہ کام شروع ہوا ہی تھا کہ خلیفہ کو بنو غانیہ کی مہم پر جانا پڑا۔ اس کے بعد الصالحہ کی تعمیر آہستہ آہستہ کئی سال میں مکمل ہوئی۔ اس میں نہایت خوبصورت اور کشادہ عمارتیں تھیں جو خلیفہ کے ذوقِ تعمیر کی آئینہ دار تھیں۔

یہ یعقوب المنصور کی تعمیرات کی ایک معمولی سی جھلک ہے ورنہ اس کی تعمیر کرائی ہوئی تمام عمارتوں کی تفصیل لکھی جائے تو اس کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے۔

علامہ عبدالواحد مراکشی نے "المعجب" میں لکھا ہے کہ:۔

"امیر المؤمنین ابو یوسف یعقوب تعمیرِ عمارات کے بہت شائق تھے۔ نہایت محنت اور اہتمام سے عمارتیں بنواتے تھے۔ وہ اپنے تمام زمانے میں کبھی اس کام سے غافل نہ ہوئے۔ یا تو کسی نہ کسی قصر میں نئی نئی ترمیمیں کرتے رہتے تھے یا کوئی نیا شہر آباد کرتے تھے۔ ان کے عہد میں شہر مراکش میں بہت کچھ اضافے ہوئیں جن کی تفصیل بہت طولانی ہے۔"

اب رہا مُوحّدین کا فنِ تعمیر، تو اس کے بارے میں پروفیسر ارنسٹ کنہل (EARNST KUNHAL) نے اپنی کتاب اسلامی آرٹ اور فنِ تعمیر (DIE KUNST DES ISLAM/ISLAMIC ART AND CULTURE) میں لکھا ہے:

"الموحدین کا سب سے بڑا سردار عبدالمؤمن ایک نئے طرز کا موجد تھا جو بارھویں صدی کی بنی ہوئی مراکش اور تینمل (تینملل) کی مسجدوں میں نظر آتی ہے۔ ان میں اینٹوں پر گچی کا کام ہے لیکن تعمیری

قاعدے کے مطابق۔ مسجد میں گول دندانہ دار اندرونی طاقچوں سے بغل نما محرابیں نکالی گئی ہیں اور سطح پر اقلیدسی جوڑ بندی کی گئی ہے باقی حصہ بالکل سادہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اینٹوں کی نوکدار محرابوں پر ایک جھالردار پردہ ڈال دیا گیا ہے اور محرابی چھت میں آویزی طرز پیدا کی گئی ہے جو مُوری فن کی امتیازی خوبی ہے۔ سیول (اشبیلیہ) کے المُوحّد محل (القصر) اور طلیطلہ کے سابق کنیسہ سے، جو بعد میں گرجا بنا دیا گیا، پتہ چلتا ہے کہ مُوری طرزِ تعمیر مراکش سے ہسپانیہ تک رائج ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت مراکش اور رباط کے بلند دروازوں سے بھی ملتا ہے جو بارھویں صدی میں اینٹ کی بجائے پتھر کی جوڑ بندی سے بنائے گئے تھے۔ ان میں محراب کے شانوں پر سپاٹ نقوش ہیں اور باقی جگہ پر مرغولیں بنی ہیں ان کا طرز بالکل نیا ہے۔ یہاں پہلی بار ڈھلے ہوئے نقش ونگار نظر آتے ہیں جن سے آویزی جھالروں میں ایک خاص نفاست پیدا ہو گئی تھی۔

تینمل (تینملل) میں المُوحّد محراب پوری طرح نمایاں تھی اس کے بغل نما آلہ کے آرائشی چوکھٹے میں ایک امتیازی شان تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مینار کی آرائش پر بھی توجہ کی گئی تھی، چھتے کی جگہ اینٹوں کی جھلملی بنائی گئی تھی جیسی کہ مغربی ایشیا کے سلجوقی میناروں میں نظر آتی ہے۔ سیول کا جیرالڈا محل اس کا بہترین نمونہ ہے جس میں آرائش کو روشن کرنے کے لیے رنگوں سے بھی کام لیا گیا تھا جو قطبیہ (کتبیہ ؟) میں نظر آتا ہے۔ خطاطی میں وہی خطِ کوفی استعمال ہوتا تھا اور ظروف کی نقاشی میں بھی کفایت سے کام لیا جاتا تھا۔

آخر میں پروفیسر ارنسٹ کنہل نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ " الموحدین کے دور میں آرائش صرف تعمیری ضروریات کی تابع تھی۔"

اندلس اور مغرب میں موحدین کے دور میں تعمیر ہونے والی عمارات کے معماروں کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قدیم مؤرخ ابن سعید نے لکھا ہے کہ:

" امرائے بنی مُوحدین میں سے یوسف اور یعقوب المنصور نے اندلس ہی سے جو ان کی سلطنتِ مغربیہ میں شامل ہو گیا تھا، عمارت بنانے والے بلائے تھے اور ان ہی سے مراکش، رباط، فاس اور منصوریہ کی عمارات بنوائی تھیں۔"

اس کے برعکس اہلِ مراکش کا دعویٰ ہے کہ "ان کے معمار، نجار اور صناع زمانہ قدیم سے اپنے فن میں ایسے ماہر تھے کہ دوسرے ملکوں کے فرمانروا انہیں اپنے ہاں بلا کر عمارتیں بنواتے تھے چنانچہ جامع منصور (شہر مراکش) کی محرابیں، جامع قرویین (فاس) کا روکار اور مسجدِ دکار (سینیگال) اپنے نقش و نگار رعنائی و زیبائی اور فنی نزاکت میں جامع قرطبہ اور اشبیلیہ کو بھی شرماتے ہیں۔ بغداد کی عجوبۂ روزگار مسجدِ امام اعظمؒ کی تزئین و آرائش بھی مراکشی حسنِ ذوق ہی کا نتیجہ ہے۔"

ان روایتوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موحدین کے دور میں اندلس اور مغرب دونوں جگہ باکمال کاریگر اور صناع موجود تھے اور تمام عمارات ان باکمالوں نے مل جل کر تعمیر کی تھیں۔ چونکہ وہ ایک ہی مملکت کے باشندے تھے اس لیے ان میں اشتراکِ عمل کا ہونا کوئی ایسی بات نہیں جسے مستبعد کہا جا سکے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں مُوحدین کے فنِ تعمیر پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔

" اپنے پیشروؤں کی طرح المُوحدون کے ہاں بھی کوئی ثقافتی روایت

موجود نہ تھی۔ ان کے اعمال و افعال پر زہد و اتقا کا غلبہ تھا، جس کی رو سے ہر قسم کا تعیش اور افراط ممنوع تھا، یہ بات ایک ایسی تحریک کے شایانِ شان بھی تھی جو آغازِ اسلام کی سادگی از سرِ نو قائم کرنا چاہتی تھی لہٰذا فن کے ارتقا پر ان کا یہ اثر ہوا کہ بے سود آرائش و زیبائش پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں اور اسے کم کر کے بنیادی لوازم کا پابند بنا دیا گیا جس میں وسیع اور سادہ زمینوں پر معیّن اور واضح خطوط استعمال کیے جاتے تھے۔ چونکہ الموحدون کی بنائی ہوئی کوئی عبادت گاہ اب اسپین میں موجود نہیں اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان خصوصیات کا اثر اسپین کی عمارتوں پر بھی ہوا تھا یا نہیں۔ اشبیلیہ کی بڑی مسجد کے آثار سے، جسے یعقوب المنصور نے مکمل کیا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ اسپین کی عمارتوں میں بمقابلہ ان عمارتوں کے جو المغرب میں محفوظ رہ گئی ہیں، زیادہ تزئین و آرائش سے کام لیا جاتا تھا۔

الموحدون بعض اور پہلوؤں سے بھی ارتقائے فن پر اثر انداز ہوئے۔ خلافتِ قرطبہ کی گزشتہ عظمت کی یاد سے متاثر ہو کر جس کا اظہار اس کی تعمیرات سے ہوتا تھا، انہوں نے بڑی بڑی متوازن اور عمدہ نقشوں کی مسجدیں، ٹھوس اونچے مینار اور عظیم الشان شہری دروازے تعمیر کیے، گویا یہ ایسے " ابوابِ فتح" ہیں جو ان کے خاندان کے اعزاز میں بنائے گئے تھے۔ ــــــــ

اندلس میں الموحدون کی فوجی عمارتوں کی ترتیب بوزنطی عمارتوں سے ماخوذ تھی جو اس وقت تک مغرب میں غیر معروف تھی، مثلاً خمیدہ دروازے، متعدد پہلوؤں کے برج اور البرانہ یعنی دیوارِ دل

سے باہر نکلے ہوئے برج، آویزوں (STALACTITES) کے ساتھ
کتبات میں رواں خط کا استعمال اور عمارتوں کی بیرونی آرائش کے
لیے روغنی مٹی کے ٹکڑوں کا استعمال ۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد سوم صفحہ ۳۵۶)

یعقوب المنصور کے جانشین

الموحدین کے پہلے تین فرمانروا عبدالمومن، ابو یعقوب یوسف اور ابو یوسف یعقوب المنصور رعب جلال اور قوت وشوکت کے لحاظ سے تمام موحد حکمرانوں سے بڑھ کر تھے۔ موحدین کی تاریخ میں ان کے صحیح مرتبہ کا تعیین کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی مؤرخ نے عبدالمومن کو خاندانِ موحدین کا سب سے بڑا بادشاہ قرار دیا ہے، کسی نے ابو یعقوب یوسف کو اور کسی نے یعقوب المنصور کو۔ صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یعقوب المنصور کے عہد میں الموحدون کی سلطنت منتہائے عروج پر پہنچ گئی تھی اسی لیے بعض مؤرخین نے اس کو فرمانروایانِ موحدین کی لڑی میں وسط کا گوہرِ تابدار قرار دیا ہے۔ یعقوب المنصور کی وفات کے بعد اس کے جانشین ۸۰ برس تک حکومت کرتے رہے لیکن یعقوب کے دور جیسی قوت وشوکت انہیں کبھی نصیب نہ ہوئی۔ فی الحقیقت یعقوب المنصور کے آنکھیں مُوندتے ہی دولتِ موحدین میں زوال وانحطاط کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس کے جانشینوں میں اکثر بچے اور ناتجربہ کار تھے اور ان میں اس قابلیت اور صلاحیت کا فقدان تھا جو ایک عظیم الشان سلطنت کو سنبھالنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

یعقوب المنصور کے فرزند محمد الناصر الدین اللہ نے ۶۰۹ھ (۱۲۱۲ء) میں العقاب کی لڑائی میں اندلسی عیسائیوں سے شکست کھائی اور اسی وقت سے دولتِ موحدین تیزی سے زوال پذیر ہو گئی، حتیٰ کہ ۶۷۴ھ (۱۲۷۵ء) میں بنو مرین نے ان کے آخری

حکمران اسحٰق بن ابراہیم کو قتل کر کے مؤحدین کی حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔
یعقوب المنصور کے جانشینوں کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) محمد الناصر لدین اللہ بن یعقوب۔ ۵۹۵ھ / ۱۱۹۹ء تا ۶۱۱ھ / ۱۲۱۴ء
مسندِ حکومت پر بیٹھتے وقت صرف سترہ برس کا نوجوان تھا۔ وہ اپنے نامور باپ کی خوبیوں سے یکسر عاری تھا۔ مؤحدین نے اس کو بزدل اور بخیل لکھا ہے۔ اس نے میورقہ پر حملہ کر کے بنو غانیہ کو ختم کر دیا لیکن اپنی حکومت کے اواخر میں العقاب کی لڑائی میں اندلسی عیسائیوں سے شرمناک شکست کھائی اور دولتِ مؤحدین کو زوال کی راہ پر ڈال دیا۔

(۲) ابو یعقوب یوسف ثانی المستنصر۔ ۶۱۱ھ / ۱۲۱۴ء تا ۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء
نوعمر اور امرائے مؤحدین کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔

(۳) عبدالواحد المخلوع (بن یوسف بن عبدالمؤمن) ۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء تا ۶۲۱ھ / ۱۲۲۴ء
سن رسیدہ آدمی تھا۔ امرائے مؤحدین نے پہلے اسے معزول کیا اور پھر قتل کر ڈالا۔

(۴) ابو محمد عبداللہ العادل بن یعقوب المنصور۔ ۶۲۱ھ / ۱۲۲۴ء تا ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء
بڑا نیک نفس شخص تھا لیکن اعیانِ سلطنت نے اس کو معزول کر دیا۔

(۵) یحییٰ المعتصم بن محمد الناصر بن یعقوب المنصور ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء تا ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء
ناتجربہ کار اور بھولا بھالا نوجوان تھا۔ اس کے زمانے میں مغرب اور اندلس میں

ہر طرف ہنگاموں کا زور رہا

(۶) ابو العلاء ادریس المامون بن یعقوب المنصور ۶۲۶ھ تا ۶۳۰ھ
۱۲۲۹ء ۱۲۳۲ء

یہ شخص بڑا خوش بیان اور اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز تھا لیکن پہلے درجے کا بے غیرت اور دنیا پرست تھا۔ اس نے قشتالیہ کے عیسائی فرمانروا الفانسو نہم کو یحییٰ المعتصم کے خلاف مغرب میں بلا بھیجا اور اس کی مدد سے یحییٰ کو شکست دے کر بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے مؤحدین کے بڑے بڑے شیوخ کو چن چن کر قتل کر ڈالا۔ لیکن اس غدارِ ملت کو بھی کوئی دن چین کا نصیب نہ ہوا اور بغاوتیں فرو کرتا کرتا مر گیا۔

(۷) عبد الواحد الرشید — ۶۳۰ھ تا ۶۴۰ھ
۱۲۳۲ء ۱۲۴۲ء

ادریس المامون کا بیٹا تھا اس نے یحییٰ المعتصم کو متعدد معرکوں میں شکست دے کر بالآخر قتل کر ڈالا۔ اس کے زمانے میں بدامنی اور بدنظمی کا بازار گرم رہا اور بنو مرین بتدریج زور پکڑتے گئے۔

(۸) ابو الحسن علی السعید — ۶۴۰ھ تا ۶۴۶ھ
۱۲۴۲ء ۱۲۴۸ء

عبد الواحد الرشید کا اخیافی بھائی تھا۔ اس کے عہد میں بھی ملک کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ ۶۴۶ھ میں کسی نے اسے قتل کر ڈالا۔

(۹) ابو حفص عمر المرتضیٰ۔ ۶۴۶ھ تا ۶۶۵ھ
۱۲۴۸ء ۱۲۶۶ء

یہ ایک صوفی مشرب، صاحبِ علم اور عابد و زاہد شخص تھا لیکن سلطنت کو نہ

سنبھال سکا۔ الوالعلا ابو دبوس نامی ایک شخص نے بغاوت کر کے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور مراکش پر قابض ہو کر ابو حفص کو قتل کرا دیا۔

(۱۰) ابوالعلیٰ ابو دبوس واثق باللہ ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء تا ۶۶۸ھ / ۱۲۶۹ء

وہ ایک فیاض اور قابل آدمی تھا۔ پہلے اس نے کاروبارِ حکومت درست کیا اور پھر بنو مرین کے مقابلے کے لیے بڑھا۔ فریقین میں خونریز لڑائی ہوئی جس میں بنو مرین غالب آئے اور ابو دبوس کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح دولت مُوحّدین کا خاتمہ ہو گیا، تاہم بہت سے مُوحّدین مراکش سے بھاگ کر تینملل کے کوہستانی علاقے میں چلے گئے اور عمر المرتضیٰ کے بھائی اسحٰق بن ابراہیم کو اپنا امیر بنا لیا لیکن بنو مرین نے ۶۷۴ھ / ۱۲۷۵ء میں اسے اور اس کے اعزّہ واقارب کو مغلوب کر لیا اور پھر سب کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح اپنے آغاز سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد دولتِ مُوحّدین کا آخری نشان بھی مٹ گیا۔

المُوحِّدُون کے جانشین بنو مرین ہوئے۔ انہوں نے دو سو چھہتر برس تک دادِ حکمرانی دی۔ اس خاندان میں بھی کئی نامور فرمانروا ہوئے جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

یعقوب المنصور
کے
عہد کے
چند اربابِ کمال

(۱) ابن العربی

(۲) ابنِ رُشد

(۳) ابنِ زُہر

(۴) ابو مدین شعیب رح

(۵) ابن طفیل

(۶) ابنِ جُبیر

(۷) عبدالواحد مراکشی

(۸) ابو موسیٰ عیسیٰ بن عبدالعزیز الجزولی

(۹) ابوالعباس احمد رح
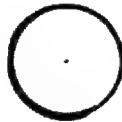
الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی (ابن العربی)

پورا نام ابوبکر محمد بن علی محی الدین الحاتمی الطائی ہے۔ اپنے تبحرِ علمی کی بناء پر الشیخ الاکبر کے لقب سے شہرت پائی۔ ۵۶۰ھ (۱۱۶۵ء) میں اندلس کے (جنوب مشرقی شہر) مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں اشبیلیہ چلے گئے جو اس زمانے میں ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ ابن عربی پورے تیس سال اس شہر میں مقیم رہے اور اس دوران میں وہاں کے مشہور علماء اور صوفیہ سے علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد (۵۹۸ھ (۱۲۰۱ء) میں) وہ مشرقی ممالک کی سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور مصر، بغداد، مکہ معظمہ، حلب، بیت المقدس وغیرہ گئے، جہاں کہیں بھی جاتے تھے، شہرت ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ لوگ ان کی خدمت میں ازراہِ عقیدت بڑے بڑے نذرانے پیش کرتے تھے لیکن وہ سب حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے، اخیر میں وہ مستقل طور پر دمشق میں مقیم ہو گئے اور وہیں ۶۳۸ھ (۱۲۴۰ء) میں وفات پائی، ان کا مدفن جبل قاسیون میں ہے۔

یعقوب المنصور کے زمانے میں شیخ الاکبر زیادہ تر تحصیلِ علم میں مصروف رہے۔ اس دوران میں انہوں نے چند کتابیں بھی لکھیں لیکن ان کو ہمہ گیر شہرت یعقوب المنصور کے بعد نصیب ہوئی اور وہ بھی بلادِ مشرق میں جا کر۔ یعقوب المنصور کی وفات (۵۹۵ھ (۱۱۹۹ء)) کے وقت ابن عربی پینتیس برس کے پیٹے میں تھے اور بڑی حد تک تحصیلِ علم سے فارغ ہو چکے تھے لیکن اندلس میں انہوں نے اپنی زندگی بالعموم خاموشی ہی

میں گزاری۔ اس دور میں انہوں نے بعض موضوعات پر جو کتابیں لکھیں ان میں اور بلادِ مشرق میں لکھی گئی کتابوں میں پختگیٔ فکر کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق ہے۔

شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی تصوف اور بعض دوسرے موضوعات پر اپنی تصنیفات کے عظیم ذخیرے کی بناء پر تاریخ اسلام میں بڑی اہم شخصیت کے مالک ہیں تاہم ان کے مقام اور مرتبہ کے بارے میں اربابِ علم میں خاصا اختلافِ رائے ہے۔ اس اختلافِ رائے کو "اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ" میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"بعض لوگوں کی رائے میں وہ ولی کامل تھے، قطبِ زماں تھے اور علمِ باطنی میں ایسی سند تھے جس میں کلام ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف ایک ایسا گروہ تھا جس کے نزدیک وہ بدترین قسم کے ملحد تھے۔ آپ کے بہت سے مداح جلیل القدر علماء بھی تھے جنہوں نے آپ کے عقائد کی حمایت میں کتابیں لکھیں، مثال کے طور پر مجد الدین الفیروز آبادی، سراج الدین المخزومی، الفخر الرازی، الجلال السیوطی اور عبدالرزاق الکاسانی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ متاخرین میں سے عبدالوہاب الشعرانی کے نام کا اضافہ کر لینا کافی ہے۔ آپ کے بعض مشہور و ممتاز مخالفین میں رضی الدین بن الخیاط، الذہبی، ابن تیمیہ، ابن ایاس، علی القاری اور جمال الدین محمد بن نور الدین صاحب "کشف الغمۃ عن ہذہ الامۃ" شامل تھے۔ آج بھی ابن العربی کی تصنیفات کے بارے میں اس قسم کا متضاد رویہ اختیار کیا جاتا ہے یعنی بعض مسلمان انہیں بڑی قدر و وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور طریقِ تصوف میں قدم رکھنے والے ہر شخص کو ان کے مطالعے کی

تلقین کرتے ہیں لیکن بعض ان کی مذمت کرتے ہیں اور اپنے پیرودں کو ان کی تصنیفات پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔"

مشہور مصنف مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم، "علمائے سلف و نابینا علماء" (مصنفہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم) کی توضیحات و تعلیقات میں شیخ الاکبر ابن العربی کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"محی الدین ابن عربی کی تمام تر شہرت ان کے نظریۂ وحدت الوجود کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے اس نظریہ کو نہایت آب و تاب سے پیش کیا لیکن اپنی غیر معمولی قوّتِ بیان سے اس کو اتنا پھیلا دیا کہ اس کے غوامض کو عوام ہی نہیں خواص کے لیے بھی سمجھنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے ان کے اس نظریہ کو قبول کر کے اس کی تبلیغ کی وہ بھی اس کے کنہ و حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور اُن میں سے بعض حضرات سچ مچ زندقہ کی حدود میں جا پڑے۔ ان مقلدین میں سب سے زیادہ بے اعتدالی تلمسانی سے ہوئی جس نے اس ئے کو بڑھا کر افلاطونی نظریہ اور فلسفہ ویدانت سے بھی آگے پہنچا دیا، اسی کی وجہ سے امام ابن تیمیہ نے اس کو گمراہ اور زندیق کہا۔ اس قدر پیچیدگی کے باوصف نظریۂ وحدت الوجود یا توحیدِ وجودی صوفیہ اور شعراء میں بے حد مقبول ہوا اور صدیوں تک اسلامی دنیا پر چھایا رہا یہاں تک کہ حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے دوسرا نظریہ وحدت الشہود پیش کر کے اس کی شدت کو کسی قدر کم کیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس نظریہ کو ترک کرنا گوارا نہ کیا وہ بھی کم از کم دونوں میں تطابق پیدا کرنے کی طرف مائل ہو گئے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں میں بعض مخصوص بزرگ یہ ہیں:

احمدالدین کرمانی، فخرالدین عراقی، صدرالدین قونوی، جلال الدین رومی، تلمسانی، محب اللہ الہٰ آبادی۔"

"نظریۂ وحدت الوجود" یا "ہمہ اوست" کی تعبیر کے بارے میں بھی علماء و صوفیہ میں سخت اختلاف رائے ہے۔ بعض تو اس کو من وعن قبول کرتے ہیں اور بعض اس کو سراسر گمراہی قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو یوں تو اس نظریہ کی ظاہری صورت کے مخالف ہیں لیکن اس کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ یہ "وحدتِ شہود" یا "ہمہ از دست" کی صورت اختیار کر کے قابلِ قبول بن جاتا ہے۔

خود شیخ الاکبر نے اپنی تصنیف "فتوحاتِ مکیہ" میں اس نظریہ کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے :-

"بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس نے سب اشیاء کو پیدا کیا اور جو خود ان کا جوہرِ اصلی (اعیانہا) ہے۔"

"فصوص الحکم" میں وہ یہ نظریہ اس طرح پیش کرتے ہیں :

یا خالق الاشیاء فی نفسہ انت لما تخلقہ جامع تخلق مالا ینتھی کونہ فیک فأنت الضیق الواسع ۔

"اے کہ تو نے تمام اشیاء کو اپنی ذات میں خلق کیا، تو جمع کرتا ہے ہر اس چیز کو جسے تو پیدا کرتا ہے۔ تو وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کا وجود تیری ذات میں (مل کر) کبھی فنا نہیں ہوتا اور اس طرح تو ہی تنگ ہے اور تو ہی وسیع بھی ہے۔"

شیخ الاکبر ابن العربی کی چند مشہور اور معلوم تصانیف کے نام یہ ہیں :

(۱) الاربعون صحیفۃ من الاحادیث القدسیۃ ۔

(۲) تاج الرسائل ومنہاج الوسائل ۔

(۳) ذخائر الاعلاق ـــــ (۴) روح القدس - (۵) شجرۃ الکون

(۶) الصلوٰۃ الاکبریہ -

(۷) الامر المحکم المربوط فی ما یلزم اھل الطریق من المشروط

(۸) الانوار فیما یفتح علی صاحب الخلوۃ من الاسرار

(۹) تجلیات عرائس النصوص فی مضات حکم الفصوص -

(۱۰) تحفۃ السفرہ الی حضرۃ البررۃ

(۱۱) تفسیر ـــــ (۱۲) دیوان

(۱۳) الفتوحات المکیہ
(۱۴) فصوص الحکم
} یہ دونوں سب سے اہم کتابیں ہیں -

(۱۵) مفاتیح الغیب ـــــ (۱۶) قصیدہ المعشرات -

(۱۷) مواقع النجوم ومطالع اھلتہ الاسرار والعلوم -

(۱۸) القرعتہ المبارکتہ المیمونتہ والدرۃ الثمینیہ المصونتہ -

(۱۹) کنہ مالا بد للمرید منہ

(۲۰) مجموع الرسائل الالٰہیتہ -

(۲۱) مختصر فی مصطلحات الصوفیہ -

(۲۲) محاضرۃ الابرار ومسامرۃ الاخیار فی الادبیات والنوادر والاخبار -

(۲۳) قرعتہ الطیور لاستخراج الفال والضمیر -

(۲۴) رد المعانی الآیات المتشابہات الی معانی الآیات المحکمات -

(۲۵) انشاء الدوائر

ابنِ رُشد

نام محمد بن احمد بن محمد بن رشد ۔ کنیت، ابوالولید اور لقب حفید ہے مستشرقین یورپ اس کو ایویروز (AVERROES) کہتے ہیں —— وہ اپنے پردادا کے نام کی نسبت سے "ابنِ رُشد" مشہور ہوا۔

ابنِ رُشد کا شمار دنیا کے بہت بڑے فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ مسلمان مؤرخین نے اس کو اندلس کا سب سے بڑا عرب فلسفی قرار دیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت وہ صرف ایک بہت بڑا فلسفی ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا طبیب، فقیہ، متکلم، مہندس اور ہیئت دان بھی تھا اور تمام علوم متداولہ میں اس کو مشاقانہ دسترس حاصل تھی۔

ابنِ رُشد کی جائے ولادت قرطبہ ہے جہاں وہ قاضیوں کے ایک نہایت معزز خاندان میں سنہ ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کے دادا محمد بن رُشد (ولادت ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء وفات سنہ ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء) کا شمار اندلس کے سربرآوردہ فقہاء میں ہوتا تھا اور انہیں مالکی فقہ کا امام تسلیم کیا جاتا تھا۔ اندلس میں پہلے وہی ابنِ رُشد کے نام سے مشہور ہوئے۔ لیکن بعد میں ان کے پوتے نے ان کی شہرت کے آفتاب کو گہنا دیا تاہم ارباب علم میں اب بھی فقیہ ابن رشد کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد محمد بن رُشد ہی ہوتے ہیں۔ اور جب فلسفی ابنِ رُشد کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رُشد ہوتا ہے۔

محمد بن رُشد نے ابوجعفر بن رزق سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور ابن ابوالعیا جوہری،

جیانی، ابومروان بن سراج اور ابوعبداللہ بن فرج اور غدری سے حدیث کی تحصیل و تکمیل کی۔ سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے خود درس دینا شروع کیا اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے دو کتابیں "کتاب البیان والتفصیل" اور "کتاب المقدمات" مالکی فقہ کی عظیم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے طحاوی کی مشکل الآثار کی تہذیب کی جلد ہی ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر چمکنے لگا اور وہ اندلس اور المغرب میں سب سے بڑے فقیہ تسلیم کیے گئے۔ لوگ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور وہ ان کے اشکالات کو آن واحد میں حل کر دیتے تھے۔ مالکی فقہ کے مشہور عالم شیخ خلیل الجندی نے اپنی کتاب "المختصر المبین" میں محمد بن رُشد کو ان چار بڑے فقہاء میں شمار کیا ہے جن کی آراء پر فقہ مالکی میں اعتماد کیا جاتا ہے۔ دوسرے تین فقہاء اللخمی، ابن یونس اور المازری ہیں۔ محمد بن رُشد کے تبحرِ علمی کی بناء پر ۵۱۱ھ میں انہیں قرطبہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جامع مسجد کی امامت کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔ مرابطی فرمانروا امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشفین کے دربار میں انہیں بڑا تقرب حاصل تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے "ابنِ رُشد" پر اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ:

"اس زمانے میں مسلمانوں کا حریف مقابل الفونس تھا جو اکثر اندلس پر حملہ آور ہوتا تھا اور چونکہ اندلس کے عیسائی اس کی اعانت کرتے تھے، اکثر کامیاب ہوتا تھا۔ محمد بن رُشد نے خاص اس غرض سے ۵۱۲ھ میں مراکش (مراکو) کا سفر کیا اور سلطانِ مراکش سے درخواست کی کہ عیسائیوں کو اندلس سے جلاوطن کر کے افریقہ میں آباد کرایا جائے۔ سلطان نے اس صلاح کو نہایت پسند کیا اور اس کے حکم سے ہزاروں عیسائی اندلس سے نکل کر طرابلس الغرب میں جا کر آباد ہو گئے۔"

مراکش کے سفر سے واپس آکر محمد بن رُشد نے اسی سال (سنہ ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء میں) وفات پائی اور قرطبہ کے مقبرۂ عباس میں دفن ہوئے۔

اخلاق و محاسن کے اعتبار سے محمد بن رُشد بڑی برگزیدہ شخصیت تھے احکام شرع کے سختی سے پابند، نہایت کم سخن، غیور، باحیا اور پاکباز تھے۔ رمضان کے روزوں کے علاوہ بھی سفر و حضر میں ہمیشہ جمعہ کا روزہ رکھتے تھے۔

مولانا عبد السلام ندوی نے اپنی کتاب حکمائے اسلام میں لکھا ہے کہ اس وقت محمد بن رُشد کی کوئی مطبوعہ تصنیف موجود نہیں ہے۔ البتہ قرطبہ کی جامع مسجد کے امام ابن القران نے ان کے فتووں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جس کا ایک نسخہ اسپین کی ایک خانقاہ سنٹ وکٹر (سان فیکتور) میں تھا اور اب پیرس کے شاہی کتبخانے میں ہے۔

محمد بن رُشد کے فرزند احمد (ابو الولید ابن رُشد کے باپ) بھی ایک بلند پایہ عالم تھے۔ وہ اپنے باپ کی جگہ قرطبہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے [۱] انہوں نے سنہ ۵۶۳ھ / ۱۱۶۸ء میں وفات پائی۔

ابو الولید ابن رُشد نے تحصیل علم کی ابتدا اپنے والد سے کی چنانچہ اکثر تذکروں میں آیا ہے کہ اس نے مؤطا امام مالک (جس کو اس زمانے میں قرآن کے بعد اصح الکتب سمجھا جاتا تھا) اپنے والد سے پڑھی اور اس کو حفظ بھی کیا۔ حدیث میں اس کے دوسرے اساتذہ ابو عبد اللہ مازری، حافظ ابو القاسم بن بشکوال، ابو جعفر بن عبد العزیز،

---

[۱] ایک روایت کے مطابق محمد بن رُشد نے اپنی وفات سے پانچ سال پہلے سنہ ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء میں ایک شورش کے سلسلہ میں عہدۂ قضا سے استعفا دے دیا تھا، اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ احمد اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر اس عہدہ پر فائز ہوئے باپ کے جانشین کے طور پر نہیں۔

ابوبکر بن سحون اور ابو مروان بن میسرہ تھے ۔ لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ ان بزرگوں سے ابن رُشد نے فقہ کی تعلیم حاصل کی ۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے فقہ میں اس کو حافظ محمد بن رزق کا شاگرد تبلایا ہے ۔ طب اور علوم حکمیہ کی تحصیل اس نے ابوجعفر بن ہارون ترجالی سے کی ۔ ابو مروان بن حزبول کو بھی طب میں اس کا استاد بتایا گیا ہے ۔

حدیث، فقہ اور طب کے علاوہ ابن رُشد نے دوسرے بیشتر علوم مثلاً اصول فلسفہ، ہیئت، کلام، ادب وغیرہ بھی بڑی محنت اور شوق سے حاصل کیے اور ان میں درجۂ کمال پر پہنچا ۔ علامہ شبلی نعمانی نے ابوالقاسم بن طلیسان کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابنِ رُشد کو (ادب سے ایسا شغف تھا کہ) ابو تمام اور متنبی کا کلام اس کو ازبر یاد تھا اور اکثر صحبتوں میں ان کے اشعار وہ ضرب المثل کے طور پر برجستہ پڑھا کرتا تھا ۔

مشہور محدث و مؤرخ ابن الآبار کا بیان ہے کہ :

"ابنِ رُشد نے فقہ، اصول فقہ اور علم الکلام پڑھا اور قدما کے علوم کی طرف اس نے خاص توجہ کی اور اس میں وہ اپنے تمام معاصرین سے آگے بڑھ گیا چنانچہ جس طرح طب میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا اسی طرح فتووں کے لیے بھی لوگ اس کے پاس آتے تھے ۔ اس کے علاوہ اسے ادب میں بھی بہرۂ وافر ملا تھا ۔"

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ ابن رُشد نے اس دور کے شہرۂ آفاق فلسفی ابنِ باجہ کی شاگردی بھی کی ہے [۱] بعض مؤرخین (بالخصوص مستشرقین) نے

---

[۱] ابوبکر محمد بن یحییٰ بن صائغ جو ابنِ باجہ کے نام سے مشہور ہے اندلس کا بہت بڑا فلسفی، طبیب، ہیئت دان، مہندس اور ادیب تھا ۔ اہلِ یورپ اس کو (AVENPACE) کہتے ہیں ۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابنِ رُشد کے ابنِ باجہ کا شاگرد ہونے سے انکار کیا ہے لیکن اس بارے میں ان کے دلائل کچھ زیادہ قوی نہیں۔ یہ درست ہے کہ ابنِ باجہ کی وفات کے وقت ابنِ رُشد کی عمر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ وہ پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں اندلس کے شہر سرقسطہ ساراغوسا (SARAGOSA) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں لیکن اتنا ثابت ہے کہ اس نے لڑکپن میں ہی قرآن حفظ کر لیا اور فلسفہ، طب، ہیئت، ریاضی، شعر و ادب، طبیعیات، منطق غرض تمام علومِ عقلیہ میں درجۂ کمال حاصل کر لیا۔ اسی بناء پر اس کو اندلس کا ارسطو کہا جاتا ہے۔ اس نے فلسفہ، منطق، طب اور ہیئت و ہندسہ میں بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔ ان میں ارسطو کی متعدد کتابوں کی شرحیں بھی تھیں۔ مشہور مؤرخ القفطی نے اپنی کتاب "اخبار العلماء باخبار الحکماء" میں ابنِ باجہ کا تعارف یوں کرایا ہے:-

> "وہ قدماء کے علوم کا عالم اور ادب و عربیت میں فاضل تھا۔ اس کے شہر میں اس کے ہم عصروں میں سے کوئی شخص اس کے درجہ کو نہیں پہنچا۔ اس نے ریاضی، منطق اور ہندسہ میں کتابیں لکھی ہیں اور ان کتابوں میں وہ قدماء سے آگے بڑھ گیا ہے۔"

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں لکھا ہے کہ ابنِ باجہ علومِ حکمیہ میں علامۂ وقت اور یگانۂ روزگار تھا۔

ابنِ باجہ فنِ موسیقی میں بھی کمال رکھتا تھا اور عود بجانے میں تو اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کے کمالاتِ علمی و فنی کی بناء پر سرقسطہ کے امیر ابوبکر بن ابراہیم صحراوی نے اس کو اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ ۵۱۲ھ میں ابوبکر کی موت کے بعد وہ بلنسیہ سے ہوتا ہوا اشبیلیہ چلا گیا۔ چند سال وہاں قیام کے بعد مراکش چلا گیا اور وہیں ۵۳۳ھ میں شہر فاس میں وفات

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صرف تیرہ برس کی تھی لیکن اس عمر تک اس کا ابنِ باجہ سے تعلیم حاصل کرنا بعید از قیاس نہیں البتہ کسی مؤرخ نے اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اس نے ابنِ باجہ سے کون کون سے علوم حاصل کیے۔ بہرحال ابنِ رُشد، سنِ رشد کو پہنچنے تک جملہ علومِ دینی و فروعی میں درجۂ کمال تک پہنچ گیا اور پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گیا۔ جلد ہی اس

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) پائی۔ قفطی کا بیان ہے کہ اطباء نے حسد کی وجہ سے اس کو زہر دے کر مار ڈالا۔ واللہ اعلم۔

ابنِ باجہ کو مختلف علوم و فنون میں کمال کی بدولت زبردست شہرت نصیب ہوئی لیکن دینی عقائد و اعمال کی بناء پر وہ عوام میں سخت مبغوض و بدنام تھا۔ لوگ اس کو بے دین اور قرآن اور اصولِ اسلام کا منکر کہتے تھے۔ اس کے ایک ہمعصر فتح بن خاقان نے اپنی کتاب "قلائد العقیان" میں اس کی شخصیت اور کردار کی نہایت بھیانک تصویر کھینچی ہے، اس کا بیان ہے کہ:

"ابنِ باجہ فرائض و سُنّت کا تارک تھا، غسلِ جنابت اور استنجا نہیں کرتا تھا خدا کا منکر تھا، قرآن مجید کو چھوڑ کر ہیئت اور نجوم کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔ آخرت اور حشر و نشر کا قائل نہ تھا اور انسان کو ایک گھاس سمجھتا تھا۔ ہمیشہ گانے بجانے میں مشغول رہتا تھا۔ بدنسل اور بدصورت تھا۔"

علامہ ابنِ خلکان، قفطی اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے ابنِ خاقان کے بیان کو مبالغہ آمیز قرار دیا ہے کیونکہ اس کو ابنِ باجہ سے ذاتی عناد تھا تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام اس کے عقائد و اعمال کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس کو عوام کے ہاتھوں کئی بار سخت مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ ابنِ باجہ کے عقائد اور کردار سے قطع نظر اس نے اپنی کتابوں میں جو نظریات پیش کیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان عقلی کمال صرف اخلاقی پاکیزگی اور خلوت گزینی سے حاصل کر سکتا ہے۔

کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ چند سال بعد وہ مراکش گیا جہاں ابنِ طفیل نے جو اب ضعیف العمر ہو چکا تھا، اس کو خلیفہ ابو یعقوب بن عبدالمؤمن سے متعارف کرایا، علامہ عبدالواحد مراکشی نے ابو یعقوب یوسف کے دربار میں پہلی مرتبہ حاضر ہونے کا ذکر خود ابنِ رُشد کی زبانی اس طرح کیا ہے:

"جب میں امیر المؤمنین کے ہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ اور ابو بکر (ابنِ طفیل) آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور ان کے سوا وہاں اور کوئی نہیں ہے۔ ابو بکر میری تعریفیں کرتے تھے اور میرے خاندان اور اسلاف کا ذکر کرتے ہوئے ایسی خوبیوں کو میری طرف منسوب کر رہے تھے جن تک میں ہرگز نہیں پہنچتا۔ امیر المؤمنین نے میرا اور میرے والد کا نام اور میرا نسب دریافت کرنے کے بعد سب سے پہلی بات جو مجھ سے کہی وہ یہ تھی کہ مجھ سے یہ سوال کیا کہ آسمان کے بارے میں فلاسفہ کی کیا رائے ہے، وہ اسے قدیم بتاتے ہیں یا حادث؟ اس سوال سے مجھے شرم بھی آئی اور خوف بھی ہوا، اسی بناء پر میں نے علمِ فلسفہ سے عدم واقفیت اور اس میں اپنے عدمِ اشتغال کا بہانہ کیا۔ اتنے میں نہ معلوم ابنِ طفیل نے امیر المؤمنین سے کیا کہہ دیا کہ وہ میری شرم وحیا اور خوف کو تاڑ گئے اور ابنِ طفیل کی طرف متوجہ ہو کر اس مسئلے پر ان سے گفتگو کرنے لگے جس کے متعلق مجھ سے سوال کیا تھا۔ وہ اس مسئلے کے بارے میں پہلے ارسطا طالیس، افلاطون اور دیگر فلاسفہ کے اقوال نقل کرتے تھے اور پھر اہلِ اسلام نے ان پر جو اعتراض واحتجاج کیا ہے اس کو بیان کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا حافظہ اتنا عمدہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ویسا فلسفے کے کسی اور مشتغل اور متفرغ شخص کا ہوگا۔ غرض کہ وہ اسی طرح اس مضمون پر

بحث کرتے رہے تا آنکہ آخر کار مجھے بھی بولنے کی ہمت ہوئی اور جہاں تک مجھے اس مسئلے کے متعلق علم تھا، ان پر واضح ہو گیا۔ جب میں واپس آنے لگا تو مجھے مال واسباب، ایک خلعتِ فاخرہ اور ایک گھوڑا عطا کیا۔"

بعض تذکروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۵۴۸ھ ۱۱۵۳ء میں پیش آیا لیکن یہ صحیح نہیں۔ ابو یعقوب یوسف کا دورِ حکومت ۵۵۸ھ ۱۱۶۳ء میں شروع ہوا اس لیے وہ ۵۵۸ھ ۱۱۶۳ء کے بعد ہی اس کے دربار میں حاضر ہوا ہوگا، وہ ۵۴۸ھ ۱۱۵۳ء میں بھی مراکش ضرور گیا لیکن اس وقت عبد المؤمن کا عہدِ حکومت تھا اور اس کے دربار میں ابنِ رُشد کی شخصیت نمایاں نظر نہیں آتی [1]

ابو یعقوب یوسف کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے بعد ابنِ رُشد نے

---

[1] علامہ شبلی نعمانیؒ کا بیان ہے کہ سب سے پہلے عبد المؤمن نے ابنِ رُشد کو عنایاتِ شاہانہ سے نوازا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ابنِ رُشد کی دیانت اور کمالاتِ علمی کا حال جب عبد المؤمن کو معلوم ہوا تو دربار میں بُلا کر اپنے خاص ندیموں میں شامل کر لیا اور قضاء کی خدمت بھی بحال رہنے دی۔ ۵۴۷ھ میں جب کہ اس کی عمر ۲۷ برس کی تھی وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا یعنی اندلس سے لے کر مراکو تک کے کل علاقے اس کے قضا کی حد میں آ گئے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "ابنِ رُشد کو آغازِ شباب ہی میں قضا کی خدمت مل گئی وہ اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا اور پھر قرطبہ کا۔ اس خدمت کو جس خوبی سے اس نے انجام دیا، اس کی شہرت نے اس کو دربارِ شاہی میں پہنچا دیا۔"

لیکن دوسرے مؤرخین نے ان واقعات کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ یہ ابو یعقوب یوسف تھا جس نے ۵۶۵ھ ۱۱۶۹ء میں پہلی بار ابنِ رُشد کو قاضی مقرر کیا۔

ابنِ طفیل کی تحریک پر ارسطو کی کتابوں کی شرح و تلخیص کی۔

ابو یعقوب یوسف نے ۵۶۵ھ / ۱۱۶۹ء میں ابن رُشد کو اشبیلیہ کا قاضی مقرر کیا اور اس کے دو سال بعد قرطبہ کا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنی اہم ترین تصانیف مرتب کیں ۵۷۸ھ / ۱۱۸۲ء میں خلیفہ نے اسے مراکش بلا بھیجا اور ابنِ طفیل کی جگہ اپنا طبیب مقرر کیا لیکن جلد ہی اس کو قاضی القضاۃ کا عہدہ دے کر قرطبہ واپس بھیج دیا۔

۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں ابو یوسف یعقوب المنصور مسندِ خلافت پر بیٹھا تو اس نے بھی ابنِ رُشد کی قدر و منزلت اور اعزاز و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ؒ نے اپنی کتاب "علمائے سلف اور نابینا علماء" میں لکھا ہے کہ یعقوب المنصور کے نزدیک ابن رُشد کا یہ مرتبہ تھا کہ:

"جب وہ امیر منصور کے حضور میں کوئی علمی مسئلہ بیان کرتے تھے تو نشۂ کمال ان کے دل سے خلیفہ کی عظمت مٹا دیتا اور ان معمولی الفاظ سے خطاب کرتے اسمع یا اخی یعنی سن اے بھائی۔"

۵۹۱ھ / ۱۱۹۵ء میں جب یعقوب المنصور الفانسو کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا تو اس نے الوداعی ملاقات کے لیے ابنِ رُشد کو دربار میں طلب کیا اور حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کی، اعیانِ سلطنت میں خلیفہ کے داماد ابو محمد عبد الواحد بن الشیخ ابی حفص الهنتانی کو بہت بڑا مقام حاصل تھا اور دربارِ شاہی میں اس کو تیسری یا چوتھی نشست ملتی تھی لیکن خلیفہ نے اس موقع پر ابنِ رُشد کو اپنے پہلو میں جگہ دی اور دیر تک اس سے ملاطفت آمیز باتیں کرتا رہا۔ وہ دربار سے نکلا تو احباب اور شاگردوں نے اس اعزاز پر مبارکباد دی لیکن اس نے کہا کہ یہ خوشی کا موقع نہیں کیونکہ دفعتہً اس رجبہ کا تقرب بُرے نتائج بھی پیدا کر سکتا ہے۔

ابنِ رُشد کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا، اگلے ہی سال (۵۹۲ھ / ۱۱۹۶ء) کے

آغاز یا ۵۹۱ھ کے آخر میں (۱۱۹۵ء) اس پر عتاب شاہی نازل ہوا جس نے اس کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مؤرخین نے اس عتاب کے کئی اسباب بیان کیے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں :-

(۱) ابن رُشد نے ارسطو کی "کتاب الحیوان" کی شرح لکھی تو اس میں ایک جگہ زرافہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھ دیا کہ میں نے اس جانور کو " بادشاہِ بربر " (یعنی منصور) کے ہاں دیکھا ہے۔ اپنے بارے میں اس معمولی طریقۂ خطاب کو خلیفہ نے اپنی توہین سمجھا۔

(۲) علماء نے اس پر الحاد اور زندقہ کا الزام لگایا اور اس کے ثبوت میں انہوں نے ابن رُشد کی تلخیص شدہ کتابوں میں سے بعض ایسی عبارتوں کی نشاندہی کی جو عقائدِ اسلامی کے خلاف تھیں۔ یہ فقرے فی الحقیقت فلاسفۂ قدما کی عبارتوں سے نقل کیے گئے تھے لیکن انہیں ابنِ رُشد سے منسوب کیا گیا۔ ان میں سے ایک فقرہ یہ تھا کہ زہرہ بھی مختلف خداؤں میں ایک خدا ہے۔

یعقوب المنصور نے یہ عبارتیں دیکھیں تو سخت غضبناک ہوا اور بھرے دربار میں کہا کہ جس شخص کی یہ تحریر ہے اس پر خدا کی لعنت ہو۔

(۳) ابن رُشد اور گورنر قرطبہ ابو یحییٰ میں گہرے دوستانہ مراسم تھے یعقوب المنصور کو یہ تعلقات ناپسند تھے۔

(۴) ایک مرتبہ نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ فلاں دن ہوا کا سخت طوفان آئے گا جس سے سب لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔

اندلس کے بہت سے ضعیف العقیدہ لوگ اس پیشگوئی سے سخت پریشان ہوئے۔ چنانچہ گورنر قرطبہ کے دربار میں اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لیے بہت سے علماء جمع ہوئے، دورانِ گفتگو میں شیخ ابو محمد عبدالکبیر نے کہا کہ اگر یہ طوفانِ باد آیا تو اسی قسم کا ہوگا جس نے قوم عاد کو تباہ کیا تھا۔ اس پر ابنِ رُشد نے خشمناک لہجے میں

کہا۔" خدا کی قسم قوم عاد کا کوئی وجود ہی نہ تھا اس کی تباہی کا کیا ذکر ہے۔"
چونکہ یہ کلمات کفریہ تھے اس لیے لوگوں نے ان پر سخت اعتراض کیا۔
(ابنِ رُشد نے یہ الفاظ کہے یا نہیں لیکن اس کے دشمنوں نے ان الفاظ کو اس سے ضرور منسوب کیا)۔

(۵) ابنِ رُشد نے امام غزالیؒ کی کتاب "تہافتہ الفلاسفتہ" کے ردّ میں کتاب "تہافت التہافت" لکھی جس میں امام غزالیؒ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ چونکہ خلیفہ امام غزالیؒ کا معتقد تھا اس کو ابنِ رُشد کا یہ فعل ناگوار گزرا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابنِ رُشد چار سال تک معتوب رہا اس دوران میں اس نے کچھ عرصہ جلاوطنی اور کچھ عرصہ قید میں گزارا۔ چار سال بعد ابنِ رُشد کی قسمت نے یاوری کی اور اشبیلیہ کے بعض معزز لوگوں اور علماء نے مراکش آ کر یعقوب المنصور کے دربار میں شہادت دی کہ ابنِ رُشد پر جو الزامات لگائے گئے تھے وہ غلط اور بے بنیاد تھے۔ چنانچہ خلیفہ نے ابنِ رُشد کو معاف کر کے اپنے پاس مراکش بُلا لیا اور اس کا اعزاز و اکرام بحال کر دیا۔ لیکن مراکش پہنچ کر ابنِ رُشد بیمار ہو گیا اور چند دن بعد فوت ہو گیا۔ اس کی تاریخِ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مطابق وہ ۹ صفر ۵۹۵ھ (۱۰ دسمبر ۱۱۹۸ء) کو فوت ہوا اور یہی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کو شہر کے قریب بابِ تغزوت کے باہر جبانیہ میں سپردِ خاک کیا گیا لیکن چند دن بعد لوگوں نے اس کی لاش کو قبر سے نکال لیا اور قرطبہ لے جا کر اس کے خاندانی قبرستان مقبرہ ابنِ عباس میں دفن کر دیا۔ ابنِ رُشد کی وفات کے ایک ماہ بعد یعقوب المنصور نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔

ابنِ رُشد نے اپنے پیچھے کئی اولادیں چھوڑیں، ان میں سے بعض لڑکوں نے علمِ فقہ اور طِب میں کمال حاصل کیا اور مختلف اضلاع میں قضاءت کی خدمت

انجام دی۔ مؤرخین نے اس کے دو صاحب کمال لڑکوں کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ ایک کا نام ابومحمد عبداللہ تھا۔ وہ خلیفہ محمد الناصر بن یعقوب المنصور کے دربار میں طبیب تھا۔ دوسرے کا نام ابوالقاسم احمد تھا۔ وہ ایک متبحر عالم تھا اور نہایت فیاض اور عالی حوصلہ تھا۔

ابن رشد نے اپنی زندگی میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں اور قدیم فلاسفہ کی کتابوں کی تلخیص و توضیح بھی کی لیکن ان میں سے زیادہ کتابیں دستبردِ زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں جو باقی بچی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں :۔

تہافت التہافت، فصل المقال (مذہب و فلسفہ کے متعلق)
کتاب الجوامع (رسائلِ ارسطو کی شرح)۔ مبادی الفلسفہ،
رسالہ فی العقل والمعقول، کتاب الکلیات (طب)
شرح الارجوزہ لابن سینا (طب) مقالہ فی التریاق (طب)
مقالہ فی المزاج (طب) ہدایۃ المجتہد ونہایۃ المقصد (فقہ واصولِ فقہ)
کشف الادلہ (علمِ کلام)، ما یحتاج الیہ من کتاب اقلیدس
فی المجسطی (علمِ ہیئت)، کتاب الضروری فی النحو (علمِ نحو)
مقالۃ فی الکلمۃ والاسم المشتق (علمِ نحو)،
شرح عقیدہ ابنِ تومرت الامام المہدی (فقہ واصولِ فقہ)
فرائض السلاطین والخلفا، (فقہ واصولِ فقہ)
الدروس الکاملۃ فی الفقہ (فقہ واصولِ فقہ)
خلاصۃ المستصفی للغزالی فی اصول الفقہ،
تلخیص کتاب التعرف لجالینوس (طب)، تلخیص کتاب القوی۔
الطبیعۃ لجالینوس (طب)، تلخیص کتاب العلل والاعراض لجالینوس (طب)

تلخیص کتاب الادویۃ المفردہ لجالینوس (طب)، مقالہ فی المزاج المعتدل (طب)، تلخیص کتاب الحمیات لجالینوس (طب)، شرح کتاب الجمہوریہ لافلاطون (فلسفہ)، تلخیص مقالات ابونصر فارابی (فلسفہ)، شرح کتاب العقل لاسکندر افرودیسی (فلسفہ)، تلخیص کتاب حیلۃ البرء لجالینوس (طب)

کشف المناہج (مذہب و فلسفہ کے باہمی روابط کے متعلق)

ارسطو کی بوطیقا اور ریطوریقا کی شرحیں وغیرہ۔

علامہ شبلیؒ نے ابن الابار کے حوالے سے لکھا ہے کہ "تمام علوم و فنون میں ابن رشد کی تصنیفات کے صفحے بیس ہزار ہیں۔" علامہ شبلیؒ ابن رشد کی تصنیفات کی کثرت، تنوع، جدت مضامین اور تحقیق و تنقید پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ امر اور بھی تعجب انگیز ہے کہ تمام تصنیفات نہایت کثیر الاشغالی اور پریشانی کی حالت کی ہیں۔ وہ قاضی القضاہ اور افسر صیغۂ عدالت تھا اس تعلق سے وہ مراکو اور اسپین کے تمام بڑے بڑے اضلاع کا دورہ کرتا رہتا تھا ان ہی دوروں میں تصنیف و تالیف کا شغل رہتا تھا۔

مؤرخین نے ابن رشد کے اخلاق و عادات کی بڑی تعریف کی ہے ابن الابار کا بیان ہے کہ اس کو مطالعہ اور کتب بینی کا از بس شوق تھا۔ سفر ہو یا حضر، فارغ اوقات میں اس کا مطالعہ ہمیشہ جاری رہتا تھا اس کی ساری عمر میں صرف دو راتیں ایسی گزریں کہ وہ مطالعہ نہ کر سکا۔ ایک شادی کی رات اور دوسری وہ رات جس میں اس کے باپ نے وفات پائی۔ طبیعت میں حد درجہ کا حلم اور رحم تھا، طویل مدت تک قاضی القضاہ رہا لیکن کبھی کسی کو موت کی سزا نہیں دی۔ اگر کسی مقدمہ میں سزائے موت ناگزیر ہوتی تو مسند عدالت سے علیحدہ ہو جاتا اور کسی دوسرے قاضی کو اپنا قائم مقام بنا دیتا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے اس کو مجمع عام میں گالیاں دیں لیکن

اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ دشنام طراز کو کچھ روپے نذر کیے اور کہا کہ تم نے مجھے اپنا حلم جانچنے کا موقع دیا لیکن کسی اور کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا۔ جُود وسخا کی کی یہ کیفیت تھی کہ جو تنخواہ ملتی تھی اس کو حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتا تھا اور اس میں دوست اور دشمن میں فرق نہیں کرتا تھا کہتا تھا کہ احسان تو یہی ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا جائے، دوستوں کے ساتھ تو ہر کوئی حسنِ سلوک سے ہی پیش آتا ہے۔ دربارِ شاہی میں اپنے تقرّب کو بھی اس نے ہمیشہ مخلوقِ خدا کی نفع رسانی اور خدمت کے لیے استعمال کیا، طبیعت میں حد درجہ انکسار تھا اور غرور کا شائبہ تک اس کو چھُو کر نہیں گیا تھا۔

ابنِ رُشد کے بعض عقائد اور نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور جمہور علماء اہلِ سُنّت نے ایسا کیا بھی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تاریخ کی ایک نہایت قد آور شخصیّت ہے۔ اس کے افکار اور نظریات نے صدیوں تک یورپ میں غلغلہ ڈالے رکھا، اس کے مخالف اور موافق سبھی اس کی عالمگیر شہرت کا باعث ہوئے اور دنیا کی تمام زبانوں میں اس کی تصانیف کے تراجم شائع کیے گئے۔ آج بھی اہلِ یورپ کے نزدیک ابنِ رُشد کی شخصیت اور اس کی تصنیفات کی بڑی اہمیت ہے۔

ابنِ رُشد کے تحریری کام اور اس کے افکار و نظریات کا جائزہ لینا ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔ البتہ جن معتقدات کی بناء پر اسے مُلحد ٹھیرایا گیا۔ ان کے بارے میں مختصر طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کائنات کی قدامت یا ابدیت، بقاءِ روح، حشر و نشر، اللہ تعالیٰ کے علم کی ماہیت، اس کے علمِ غیب، نفس اور عقل کی کلیت جیسے مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ابنِ رُشد مسلمانوں کے مسلّمہ اور مروّجہ عقائد کا بالکل منکر تو نہیں لیکن وہ انہیں اس طرح پیش کرتا تھا کہ فلسفہ کے مطابق

ہو جائیں۔ وہ کہتا تھا کہ قرآن میں اگر کوئی بیان ایسا نظر آتا ہے جو بظاہر عقل کے خلاف ہے تو ظاہری معنوں کی بجائے اس کا وہ مفہوم مراد لینا چاہیے جو عقل کے مطابق ہے۔ مثلاً حشرِ اجساد کو وہ تسلیم تو کرتا ہے لیکن اس صورت میں کہ ہمارا جو جسم اس دنیا میں ہے وہ آخرت میں تبدیل ہو جائے گا کیونکہ جو چیز فنا ہو گئی پھر جوں کی توں پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی اور مماثل صورت میں دوبارہ ظہور کر سکتی ہے۔ اسی طرح وہ کائنات کی قدامت سے صاف انکار تو نہیں کرتا لیکن یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ کوئی چیز عدم سے ایک ہی بار ہمیشہ کے لیے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ہر آن اس کی تجدید ہوتی رہتی ہے جس کی بدولت دنیا برقرار رہے اور ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اللہ کے علمِ غیب کے بارے میں وہ فلاسفۂ قدیم کے اس اصول کی تردید تو نہیں کرتا کہ "اصلِ اول کو محض اپنی ہستی کا ادراک ہوتا ہے کیونکہ اگر اسے کثرتِ وجود کا علم ہو تو وہ خود بھی کثیر ہو جائے گا"، لیکن اپنی طرف سے وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اللہ خود اپنی ذات میں تمام اشیائے عالم کا علم رکھتا ہے لیکن اس کا علم ایک برتر نوعیت کا علم ہے جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس کو انسانی علم سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ اللہ کا علم نہ کلی ہے نہ جزئی۔

ابنِ رشد کی ایسی ہی فلسفیانہ موشگافیوں کی وجہ سے جمہور علماء اس کے مخالف ہو گئے تھے۔

ابنِ زُہر

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی)[1] کے آغاز میں عربوں کا ایک خاندان اپنے وطن سے ہجرت کر کے اندلس میں جا بسا۔ یہ خاندان ایاد بن معد بن عدنان کی نسل سے تھا۔ پہلے پہل یہ لوگ جنوب مشرقی اندلس کے مقام جفن شاطبہ (XATIVE) میں آباد ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان کی اولاد وہاں سے تمام جزیرہ نمائے آئبیریا (IBERIA) میں پھیل گئی۔

اندلس میں اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ زُہر نامی ایک شخص تھا۔ اسی زُہر کی نسل سے یکے بعد دیگرے کئی ایسے نامور علماء و اطباء پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے علم و فضل اور مہارتِ فن سے ایک دنیا میں غلغلہ ڈال دیا، یہ سب ابنِ زُہر کے نام سے مشہور ہوئے۔ چونکہ اس خاندان کے متاخرین نے مرابطین اور موحدین کا زمانہ پایا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے اجمالی حالات بیان کر دیئے جائیں۔

(۱) علامہ ابوبکر محمد بن مروان بن زُہر۔

ان کا شمار اپنے دور کے اکابر علماء میں ہوتا تھا اور تمام اندلس میں ان

---

[1] دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) کے مطابق اس خاندان نے نویں صدی میلادی کے آغاز میں عربستان سے اندلس کو ہجرت کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دسویں صدی میلادی کے آغاز میں اندلس کا رُخ کیا۔

کے علم وفضل، زہد وتقویٰ، فصاحت وبلاغت اور جود وسخا کی شہرت تھی انہوں نے ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں شہر طلبیرہ (TALAVERA) میں بعمر ۸۶ برس وفات پائی۔

(۲) ابومروان عبدالملک بن ابوبکر محمد۔

وہ ایک باکمال طبیب اور فقیہ تھے اور تمام اندلس میں مشہور تھے۔ مدت تک قیروان اور قاہرہ میں طبابت کرتے رہے اور پھر اندلس واپس جاکر دانیہ (DENIA) میں ساری عمر گزار دی۔ حکامِ وقت بھی ان کے بے حد قدردان تھے۔ اس لیے زندگی نہایت آسودہ حالی سے بسر کی۔ انہوں نے باختلافِ روایت دانیہ یا اشبیلیہ میں وفات پائی۔

(۳) ابوالعلاء زہر بن ابومروان عبدالملک۔

وہ عام طور پر اپنی کنیت ابوالعلاء سے مشہور رہیں۔ مستشرقین یورپ بالعموم ان کو (ALGUAZIR ALBULEIZOR) یا (ABULELIZOR) لکھتے ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے طبیب تھے۔ اور تشخیصِ امراض میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ حدیث اور ادب کی تحصیل کے لیے وہ قرطبہ گئے اور وہاں کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کرکے مشاہیر علماء کی صف میں بھی آگئے۔

مدت تک اشبیلیہ کے آخری عبادی حکمران ابوالقاسم محمد ثانی بن عباد الملقب بہ المعتمد علی اللہ (۴۶۱ھ / ۱۰۶۸ء تا ۴۸۴ھ / ۱۰۹۱ء) کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس کے زوال کے کچھ عرصہ بعد امیر المسلمین یوسف بن تاشفینؒ کے پاس چلے گئے۔ اس نے ان کی قدردانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور انہیں عہدۂ وزارت پر فائز کردیا۔ انہوں نے ۵۲۵ھ / ۱۱۳۰-۱۱۳۱ء میں باختلافِ روایت قرطبہ یا اشبیلیہ میں وفات پائی! اور متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) الادویۃ المفردۃ (۲) الطرر (۳) التذکرہ (۴) مجربات الخواص (۵) کتاب الایضاح۔

(۴) ابو مروان عبدالملک بن ابی العلاء زُہر۔

۴۸۴ھ / ۱۰۹۱ء اور ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء کے درمیان کسی وقت پیدا ہوئے۔ انہیں عام طور پر ابو مروان بن زُہر کہا جاتا ہے۔ اپنے خاندان میں انہوں نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی اور مشرق و مغرب ہر جگہ ان کے کمالِ فن کا اعتراف کیا گیا۔ فی الحقیقت مؤرخین جب کسی تخصیص کے بغیر "ابنِ زُہر" کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی مراد "ابو مروان عبدالملک بن ابی العلاء زُہر" ہی سے ہوتی ہے۔

مستشرقین نے ان کو (ABHOMERON AVENZOAR) ... یا محض (AVENZOAR) کا نام دیا ہے۔ انہوں نے ادبیات فقہ و الٰہیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد سے علمِ طب پڑھا اور جلد ہی اندلس کے سربرآوردہ علماء و اطبا میں شمار ہونے لگے۔ علامہ ابنِ رُشد سے ان کے گہرے مراسم تھے اور وہ انہیں جالینوس (یا غیلان) کے بعد سب سے بڑا طبیب جانتے تھے۔

مرابطین کے دورِ حکومت میں وہ اندلس سے مراکش چلے گئے۔ گورنر مراکش علی بن یوسف بن تاشفین ایک دفعہ کسی بات پر ان سے ناراض ہو گیا اور کچھ عرصہ کے لیے انہیں مقید کر دیا۔ مرابطین کے زوال کے بعد مُوحدین برسرِ اقتدار آئے تو وہ عبدالمؤمن کے پاس چلے گئے۔ اس نے ان کا حد سے زیادہ اعزاز و اکرام کیا اور انہیں عہدۂ وزارت پر فائز کر دیا۔ ابو مروان بن زُہر نے علمِ طب میں نہ صرف کئی جدید نظریے پیش کیے بلکہ اپنے ذاتی تجربات اور تحقیقات سے کئی ایسے امراض کا علاج بھی دریافت کیا جن کا نام بھی پہلے کسی کو معلوم نہ تھا، وہ پہلے عرب طبیب ہیں جنہوں نے سانس کی نالی پر عملِ جراحی (TRACHEOTOMY) کیا اور حلقوم اور حقنہ کے ذریعے پیٹ کے اندر مصنوعی طریقے سے غذا پہنچانے کا تجربہ کیا۔

انہوں نے ۵۵۷ھ / ۶۲-۱۱۶۱ء میں اشبیلیہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

ابومروان عبدالملک بن ابی العلاء نے کئی بلند پایہ طبی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ان کا ترجمہ عبرانی اور لاطینی زبانوں میں ہو چکا ہے اور اہل یورپ نے ان سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ "کتاب الاقتصاد فی اصلاح الانفس والاجساد" اور "کتاب التیسیر فی المداواۃ والتدبیر" ان کی نہایت اہم اور مشہور طبی کتابیں ہیں۔

(۵) ابوبکر محمد بن عبدالملک بن ابی العلاء زہر

انہوں نے "الحفید" (پوتے) کے لقب سے شہرت پائی۔ ۵۰۴ھ ۱۱۱۰-۱۱۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ علم طب اور عربی ادب پر گہرا عبور رکھتے تھے۔ جب اندلس اور شمالی افریقہ میں ان کے کمالِ فن اور تبحرِ علمی کا چرچا پھیلا تو خلیفہ یعقوب المنصور نے انہیں مراکش بلا بھیجا اور اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا۔ وہ ان پر اس قدر مہربان تھا کہ اکثر انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی بھتیجی (یا بروایت دیگر ہمشیرزادی) بھی علم طب (بالخصوص امراضِ نسواں) میں بڑی ماہر تھی، خلیفہ کے حرم میں وہی علاج کرتی تھی، اس کے علاوہ خلیفہ اپنے گھر میں کسی اور کا معالجہ پسند نہ کرتا تھا۔[1]

بدقسمتی سے خلیفہ یعقوب المنصور کے وزیر ابوزید عبدالرحمٰن بن موسیٰ بن یوجان ہنتانی کو "الحفید" سے حسد پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے "الحفید" اور ان کی بھتیجی کو زہر دلوا دیا جس کے اثر سے دونوں فوت ہو گئے۔ خلیفہ کو ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ اس نے الحفید کی نمازِ جنازہ خود پڑھائی اور انہیں ایک شاندار باغ میں دفن کیا۔ ان کی تصنیفات میں "طب العیون" اور "ذکر التریاق الخمسین" نے

---

[1] ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ "الحفید" کی ہمشیرہ بھی صناعتِ طب اور معالجاتِ نسواں میں بڑی مہارت رکھتی تھی اور خلیفہ کے گھر کی عورتوں کا علاج کیا کرتی تھی۔

بڑی شہرت پائی۔

(۶) ابو محمد عبداللہ بن الحفید۔

۵۷۷ھ (۸۲-۱۱۸۱ء) میں اشبیلیہ میں پیدا ہوئے۔ والد نے ان کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی اور عالمِ شباب تک پہنچتے پہنچتے وہ اندلس کے سر برآوردہ اطباء میں شمار ہونے لگے۔ خلیفہ یعقوب المنصور اور اس کے فرزند ابو عبداللہ محمد الناصر نے انہیں یکے بعد دیگرے اپنے دربار میں بلا بھیجا اور ان کی حد سے زیادہ قدردانی کی۔ اسی وجہ سے وہ محسودِ خلائق بن گئے، ۶۰۲ھ (۰۵-۱۲۰۶ء) میں مراکش جا رہے تھے کہ کسی بدبخت نے زہر دے دیا اور "رباط الفتح" کے مقام پر انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پچیس برس کی تھی۔ میت پہلے مقامِ وفات پر دفن کی گئی پھر اسے وہاں سے نکال کر اشبیلیہ لے گئے اور ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کیا۔ انہوں نے اپنی یادگار دو بیٹے چھوڑے، ابو مروان عبدالملک اور ابوالعلاء محمد — مؤخر الذکر بھی ایک ممتاز طبیب تھا اور جالینوس کی تصانیف پر کامل عبور رکھتا تھا۔ اس نے مدت تک اندلس میں اپنے خاندان کا نام روشن رکھا، اس کے بعد یہ باکمال خاندان گمنامی کے پردوں میں مستور ہو گیا ع رہے نام اللہ کا۔

شیخ الشیوخ ابو مدین شعیبؒ

شیخ الشیوخ ابو مدین شعیب بن الحسین الاندلسیؒ کا شمار اسلامی اندلس اور مراکش کے اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے۔ وہ ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء میں اندلس کے ایک گاؤں قنتلانہ میں پیدا ہوئے جو اشبیلیہ کے شمال مشرق میں بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ تعلیم کی ابتدا اپنے وطن میں قرآنِ پاک سے کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے شمالی افریقیہ کے شہر فاس (FEZ) چلے گئے جو اس زمانے میں علوم و معارف کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ابو مدین شعیبؒ نے علی بن حرزہم، ابو یعزیٰ الہزمیری اور الدقاقؒ جیسے نامور علماء سے کسبِ فیض کیا جو علومِ شریعت و طریقت کا جامع تھے۔ چند سال کے اندر اندر انہوں نے نہ صرف مختلف علوم میں درجۂ تبحر حاصل کر لیا بلکہ شیخ الدقاقؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر راہِ سلوک کی کئی منزلیں بھی طے کر لیں۔ اس کے بعد وہ اپنے شیخ کی اجازت سے سیر و سیاحت میں مشغول ہو گئے اور اس دوران میں اس دور کے کئی نامور شیوخ سے کسبِ فیض کیا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ میں ان کی ملاقات سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (المشہور بہ غوثِ اعظم) سے بھی ہوئی۔ سیر و سیاحت سے فارغ ہو کر انہوں نے مغرب اقصیٰ کے شہر بجایہ میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے آپ کو رشد و ہدایت کے لیے وقف کر دیا۔ اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی بدولت، وہ جلد ہی محبوبِ خلائق بن گئے اور دور و نزدیک ہر طرف سے لوگ ان سے کسبِ فیض کے

لیے ٹوٹ پڑے۔ امیر المومنین ابو یوسف یعقوب المنصور نے ان کے کمالات اور مقبولیت عامہ کا حال سنا تو انہیں اپنے پاس بلا بھیجا، شیخ ؒ ۵۹۴ھ / ۱۱۹۷ء میں خلیفہ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے۔ جب تلمسان کے قریب پہنچے تو سخت علیل ہو گئے، ساتھیوں نے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن وقتِ آخر آچکا تھا کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور وہ چند دن بعد واصل بحق ہو گئے۔ ابدی آرامگاہ تلمسان کے ایک نواحی گاؤں "العُبّاد" میں ہے اس پر مرینی حکمرانوں نے شاندار روضہ تعمیر کرایا جو آج تک زیارت گاہِ خواص و عوام ہے۔

شیخ ابو مدین شعیب ؒ کی تصنیفی یادگاروں میں صرف چند صوفیانہ نظمیں، ایک "وصیۃ" اور ایک "عقیدۃ" باقی ہے۔ شیخ موصوف اس معتدل تصوف کے علمبردار ہیں جس کی تاسیس اور تشریح حجۃ الاسلام امام غزالی ؒ نے کی تھی۔ وہ اپنے ملفوظات میں اللہ پر کامل توکل، انکسار و تواضع، عبادت و ریاضت اور زہد و تقوی پر بڑا زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

> "عمل میں ذرا سا غرور بھی نقصان دہ ہے، اس لیے ہر حال میں عجز اختیار کرنا چاہیئے۔"

کہا جاتا ہے کہ شیخ ابو مدین شعیب ؒ نہ صرف صاحب عمل تھے بلکہ صاحب اجتہاد بھی تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیمات میں تصوف کی مشکل اصطلاحیں استعمال کرنے سے گریز کیا اور مسائل تصوف کو ایسے عام فہم انداز میں پیش کیا کہ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکے اور ان پر عمل کر سکے۔ عوام کے علاوہ اس دور کے کئی اکابر علماء نے بھی ان سے خوب استفاضہ کیا، شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی نے ان کے کمالات کی بڑی تعریف کی ہے اور انہیں "شیخ الشیوخ" کا خطاب دیا ہے۔ ان کی عارفانہ شاعری کا نمونہ یہ ہے:

یا من علا فرآی ما فی الغیوب وما
تحت الثریٰ وظلام اللیل منسدل
انت الغیاث لمن ضاقت مذاھبہ
انت الدلیل لمن حارت بہ الحیل
انا قصدناک و الآمال واثقہ
والکل یدعوک ملھوف ومبتھل
فان عفوت فذو فضل وذو کرم
وان سطوت فانت الحاکم العدل

اہلِ مراکش میں شیخ ابومدین شعیبؒ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ ایک کرامت جو سب سے مشہور ہے یہ ہے کہ ایک دفعہ وہ بحری سفر کر رہے تھے راستے میں اہلِ فرنگ نے ان کی کشتی کو پکڑ لیا اور سارے مسافروں کو اپنے جہاز پر لے گئے جب جہاز چلانے لگے تو وہ نہ چلا حالانکہ ہوا موافق تھی اور موسم سازگار تھا۔ اہلِ فرنگ نے بہت زور مارا لیکن جہاز کو نہ چلنا تھا نہ چلا۔ اہلِ فرنگ نے شیخ کو درویش صورت دیکھ کر سمجھا کہ ان کے سبب سے جہاز نہیں چلتا۔ چنانچہ انہوں نے شیخ کو چلے جانے کی اجازت دے دی، لیکن شیخ نے فرمایا کہ جب تک میرے ساتھی رہا نہ ہوں گے میں نہ جاؤں گا۔ آخر الامر جب سب کو رہا کر دیا گیا تو جہاز خودبخود چل پڑا۔

شیخ ابومدینؒ شیخ المغرب کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔

ابنِ طفیل

ابوبکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد بن طفیل القیسی کا شمار اسلامی اندلس کے سرآمدِ روزگار فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ مستشرقینِ یورپ نے اسے (ABABACER) کا نام دیا ہے۔ وہ ۴۹۴ھ (۱۱۰۰-۱۱۰۱ء) کے لگ بھگ وادی آش میں قادیس کے مقام پر پیدا ہوا جو غرناطہ کے شمال مشرق میں چالیس میل کی مسافت پر واقع ہے۔

ابنِ طفیل کی زندگی کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اسے ابنِ باجہ کا شاگرد بتایا ہے لیکن یہ محض قیاس ہے۔ وہ نہ صرف علم طِب، ہیئت، فلسفہ اور ادب میں درجۂ کمال پر فائز تھا بلکہ دوسرے اسلامی علوم میں بھی درجۂ تبحر رکھتا تھا۔ علامہ عبدالواحد مراکشی نے "المعجب" میں لکھا ہے کہ:

"ابنِ طفیل حسناتِ دہر میں سے تھے اور فلسفہ کے تمام اجزاء کے محقق تھے، انہیں شریعت اور حکمت کی تطبیق سے بڑی دلچسپی تھی، تمام انبیاء علیہم السلام کی ظاہر و باطن طور پر بہت تعظیم کرتے تھے اور علومِ اسلامیہ میں نہایت وسیع معلومات رکھتے تھے۔"

ابنِ طفیل نے اوّل اوّل غرناطہ میں طبابت شروع کی، پھر صوبہ کے والی (گورنر) کا کاتب (سیکریٹری) مقرر ہوا۔ بعدازاں وہ طنجہ اور سبتہ کے والی کے ہاں بھی یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ اسی حیثیت میں ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں اس کا سراغ طنجہ میں ملتا ہے۔ خلیفہ ابویعقوب یوسف بن عبدالمؤمن نے اس کے علمی اور

ابنِ طفیل

ابوبکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن طفیل القیسی کا شمار اسلامی اندلس کے سرآمدِ روزگار فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ مستشرقین یورپ نے اسے (ABABACER) کا نام دیا ہے۔ وہ ۴۹۴ھ (۱۱۰۰-۱۱۰۱ء) کے لگ بھگ وادی آش میں قادیس کے مقام پر پیدا ہوا جو غرناطہ کے شمال مشرق میں چالیس میل کی مسافت پر واقع ہے۔

ابنِ طفیل کی زندگی کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اسے ابنِ باجہ کا شاگرد بتایا ہے لیکن یہ محض قیاس ہے۔ وہ نہ صرف علم طب، ہیئت، فلسفہ اور ادب میں درجۂ کمال پر فائز تھا بلکہ دوسرے اسلامی علوم میں بھی درجۂ تبحر رکھتا تھا۔ علامہ عبدالواحد مراکشی نے "المعجب" میں لکھا ہے کہ:

"ابنِ طفیل حسناتِ دہر میں سے تھے اور فلسفہ کے تمام اجزاء کے محقق تھے، انہیں شریعت اور حکمت کی تطبیق سے بڑی دلچسپی تھی، تمام انبیاء علیہم السلام کی ظاہر و باطن طور پر بہت تعظیم کرتے تھے اور علوم اسلامیہ میں نہایت وسیع معلومات رکھتے تھے۔"

ابنِ طفیل نے اوّل اوّل غرناطہ میں طبابت شروع کی، پھر صوبہ کے والی (گورنر) کا کاتب (سیکریٹری) مقرر ہوا۔ بعدازاں وہ طنجہ اور سبتہ کے والی کے ہاں بھی یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ اسی حیثیت میں ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں اس کا سراغ طنجہ میں ملتا ہے۔ خلیفہ ابویعقوب یوسف بن عبدالمؤمن نے اس کے علمی اور

فنی کمالات کا چرچا سنا تو اپنے ہاں بُلا بھیجا، جب وہ خلیفہ کے دربار میں پہنچا تو اس نے ابنِ طفیل کی بے حد تعظیم و تکریم کی اور اسے اپنا طبیب خاص مقرر کر دیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ نہ صرف شاہی طبیب تھا بلکہ عہدۂ وزارت اور قضاء پر بھی فائز تھا۔ اگرچہ اس کے وزیر ہونے کی روایت مشکوک ہے لیکن اتنا ضرور ثابت ہے کہ اسے خلیفہ مذکور کا قربِ خصوصی حاصل تھا اور وہ مسلسل کئی کئی دن اور راتیں خلیفہ کے محل میں گزارا کرتا تھا۔ خلیفہ خود ایک صاحب علم آدمی تھا اور علماء و فضلاء کی صحبت کا بے حد شائق تھا۔ ابنِ طفیل کی وسعتِ معلومات، تبحرِ علمی اور کمالِ فن نے اسے اتنا متاثر کیا کہ وہ اس سے علمی گفتگو کرتے کرتے نہ تھکتا تھا اور اس سے تھوڑی مدت کی جدائی بھی اس پر شاق گزرتی تھی۔ ابنِ طفیل کے مشورہ پر اس نے کئی اور علماء کو بھی اپنے دربار میں بُلا لیا تھا۔ ان میں سرآمدِ روزگار فلسفی عالم ابنِ رُشد بھی تھا۔

۵۷۸ھ / ۱۱۸۲ء میں جب ابنِ طفیل ضعیف ہو گیا تو اس نے اپنی جگہ ابنِ رُشد کو خلیفہ کا طبیب مقرر کرا دیا، تاہم ابو یعقوب یوسف بدستور اس کی سرپرستی کرتا رہا۔ خلیفہ یوسف نے ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں وفات پائی تو خلیفہ ابو یوسف یعقوب المنصور نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا لیکن وہ طبعی عمر کو پہنچ چکا تھا، تھوڑے سے ہی عرصہ بعد ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء میں وفات پائی۔ امیر المؤمنین یعقوب المنصور نے بنفسِ نفیس اس کے جنازے میں شرکت کی۔ مدفن شہر مراکش میں ہے۔

ابنِ طفیل کی تصانیف کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے، البتہ اب تک اُس کی صرف تین کتابوں کا پتہ چلا ہے جن کے نام یہ ہیں:

(۱) اَسرار الحکمۃ الشرقیہ یا حیّ بن یقظان

(۲) رسالۃٌ فی النفس

(۳) کتاب فی البقع المسکونۃ والغیر المسکونۃ۔

ان میں سے "اسرار الحکمۃ الشرقیہ" نے عالمگیر شہرت حاصل کی اس کو بالعموم "حی بن یقظان" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے[1] یہ ایک دلچسپ کہانی کی صورت میں ہے جس سے ہر زمانے میں ہر خیال کے لوگ لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ اس کہانی میں ابن طفیل نے اپنے فلسفیانہ نظریات کو نہایت حسن و خوبی سے سمو دیا ہے۔

"حی بن یقظان" کے مقدمہ میں ابن طفیل نے اسلامی فلاسفی کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے ابن سینا، ابن باجہ اور حجۃ الاسلام امام غزالی کی بے حد تعریف کی ہے اور پھر یہ ثابت کیا ہے کہ خیر و شر کی تمیز انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اسلام ایک فطری مذہب ہے اور فلسفے کی غرض و غایت ادراک حق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انسان کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ کسی بیرونی سہارے کے بغیر اپنی خداداد بصیرت اور عقل و شعور کی بدولت حق کو اس طرح پہچان لے کہ کسی استدلال اور قیاس کی گنجائش ہی نہ رہے۔

"حی بن یقظان" کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے:۔

"ایک شہزادی اپنے بچے کو جس کا کوئی باپ نہ تھا ایک تابوت میں رکھ کر سمندر میں ڈال دیتی ہے۔ یہ تابوت بہتا بہتا ایک جزیرے سے جا لگتا ہے جہاں کسی آدم زاد کا گزر نہیں، ابن طفیل نے اس بچے کا نام "حیّ" (زندہ) قرار دیا ہے۔ ایک ہرنی جس کا بچہ عقاب لے گیا تھا، اس بچے کو اپنا دودھ پلاتی ہے اور اس کی

---

[1] چند سال ہوئے اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی "جیتا جاگتا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، مترجم ڈاکٹر محمد یوسف ہیں۔ ترجمہ اتنا شگفتہ اور عام فہم ہے کہ اس پر کہیں بھی ترجمہ کا گمان نہیں گزرتا۔

پرورش کرتی ہے۔ یہاں درندوں کا گزر نہیں ہے۔ بچہ دو برس بعد چلنے پھرنے لگتا ہے اور تدریج ہرنی کی سی باتیں کرنا، دوسرے جانوروں سے مقابلہ کرنا، اپنی مدافعت کرنا اور ان پر حملہ کرنا، درختوں کے پتوں سے ستر پوشی کرنا اور جانوروں کی کھال سے اپنے بدن کو ڈھانکنا وغیرہ سیکھتا ہے۔ اسی دوران میں ہرنی بوڑھی اور بیمار ہو جاتی ہے اس سے وہ بہت مضطرب ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ بیماری کیا چیز ہے اور اس کا کیا سبب ہے۔ اس کا شعور اسے یہ سمجھاتا ہے کہ بیماری کا تعلق سینے سے ہے چنانچہ وہ ایک تیز نوکدار پتھر سے ہرنی کے پہلو کو چیرتا ہے۔ اس طرح اسے دل پھیپھڑوں اور اندرونی اعضا کا علم ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہرنی کے جسم کے اندر کوئی ایسی چیز تھی جو نکل گئی ہے۔ گویا اس کے دماغ میں روح کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ جب ہرنی کی لاش سڑنے لگتی ہے تو وہ کوّوں سے اسے دفن کرنے کا طریقہ سیکھتا ہے (جو اپنے مردہ ساتھیوں کو چونچ سے زمین کھود کر دبا دیتے ہیں) ایک دفعہ وہ اتفاقاً خشک ٹہنیوں کی باہمی رگڑ سے آگ پیدا ہوتے دیکھتا ہے۔ اس طرح وہ خود بھی آگ پیدا کرنے کا طریقہ سیکھ لیتا ہے اور اس میں مرئی آتش اور جسمانی حرارت پر غور کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور وہ کھالوں کے لباس بناتا ہے، روئی اور سن کاتنا اور سوئیاں بنانا سیکھ لیتا ہے۔ چڑیوں کے گھونسلے دیکھ کر جھونپڑا تیار کرتا ہے۔ چڑیوں کے انڈے کھاتا ہے اور جانوروں کے سینگوں سے کام لیتا ہے۔ شکاری پرندوں کو سدھا کر ان سے شکار کراتا ہے۔

حی بن یقظان کا علم اسی طرح بڑھتے بڑھتے فلسفہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ نباتات و معدنیات کا مطالعہ کرتا ہے، اعضاء، وزن اور دوسری طبیعی خصوصیات کی بنا پر حیوانات کی قسمیں مقرر کرتا ہے۔ پھر وہ روح کے بارے میں غور کر کے اس کی دو قسمیں قرار دیتا ہے۔ روحِ حیوانی اور روحِ نباتی،

پانی کو بخارات بنتے دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ایک مادہ دوسرے مادے میں تبدیل ہوسکتا ہے، آہستہ آہستہ اسے عناصر اربعہ کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے۔ پھر اس کا خیال علتِ تخلیق کی طرف منتقل ہوکر خالق تک پہنچتا ہے۔ اب وہ آسمان کے بارے میں غور و فکر کرنے لگتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا یہ لامتناہی ہے لیکن اس کا ذہن اس نظریے کو قبول نہیں کرتا اور وہ آسمان سیاروں وغیرہ پر کروی ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ آخر کار اس کے ذہن میں خدائے واحد کا تصور پیدا ہوتا ہے جو ہر شئے کا خالق ہے، مختارِ مطلق ہے اور علم و ادراک کا مالک ہے۔ پھر وہ روحِ انسانی کو بھی غیر فانی قرار دیتا ہے اور ذاتِ خداوندی سے اس کے تعلق پر غور کرتا ہے۔ ایک مدت اسی غور و فکر اور مراقبہ میں گزر جاتی ہے یہاں تک کہ حیّ کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوجاتی ہے۔

اسی زمانے میں قریب کے ایک جزیرے سے "اسال" نامی ایک شخص حیّ کے جزیرے میں وارد ہوتا ہے جو ایک سچے الہامی مذہب کا پیرو ہے، وہ حیّ کو انسانی بولی سکھاتا ہے، اس کو نہلاتا دھلاتا ہے۔ بال مونڈتا ہے اور نک سک سے درست کرکے اس کو تمدن کے آداب سکھاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ "اسال" کا "الہامی مذہب" ان نظریات سے مختلف نہیں جو حیّ نے قائم کیے ہیں۔ پھر اسال اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ قریب کے جزیرے میں جائے اور وہاں کے بادشاہ سلامان کے سامنے اپنا فلسفہ پیش کرے۔ دونوں وہاں جاتے ہیں لیکن حیّ کا فلسفہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا، تھک ہار کر دونوں اسی غیر آباد جزیرے میں واپس آجاتے ہیں اور باقی زندگی فکر و مراقبہ میں گزار دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ابنِ طفیل دنیا میں پہلا شخص ہے جس نے فلسفیانہ نظریات

کو ایک دلچسپ کہانی (یا ناول) کی صورت میں پیش کیا اور فلسفہ کے رموز و اسرار نہایت آسان اور عام فہم انداز میں بیان کیے۔

ابن طفیل کی دوسری کتابیں ناپید ہیں، وہ ایک نہایت اچھا شاعر بھی تھا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کے کئی اشعار نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام میں بڑی فصاحت و بلاغت تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

یا باکیاً فرقۃ الاحباب عن شحط
ھلا بکیت فراق الروح للبدن

(اے دوری کی وجہ سے احباب کی جدائی پر رونے والے، کیا تو بدن کے لیے روح کے فراق پر نہ روئے گا۔)

لنور تردد فی طین الی اجل
فانحاز علواً وخلی الطین للکفن

(یہ (روح) کا ایک نور تھا جس نے ایک مقررہ وقت تک مٹی میں آمد و رفت رکھی۔ پھر وہ بلندی کی طرف مائل ہوگیا اور اس مٹی کو کفن کے لیے چھوڑ گیا)

یا شد ما افترقا من بعد ما اعتنقا
اظنھا ھدنۃ کانت علی دخن

(ان دونوں (روح اور بدن) کے ملاپ کے بعد یہ جدائی کس قدر شدید ہے! میں تو ایسا خیال کرتا ہوں کہ ان کی یہ مصالحت مکر و فساد پر مبنی تھی)

ان لم یکن فی رضاء اللہ اجتماعھما
فیالھا صفقۃ تمت علی غبن

(اگر دونوں کا اجتماع اللہ کی رضامندی میں نہ ہو تو ایسے سودے پر کتنا افسوس ہے جو نقصان پر طے ہوا ہو۔)

ابوالحسین محمد بن احمد بن احمد بن سعید بن جُبَیر الکنانی (المعروف بہ ابنِ جُبَیر) کا شمار دنیا کے نامور سیاحوں میں ہوتا ہے۔ وہ ۵۴۰ھ/۱۱۴۵ء میں اندلس کے شہر بلنسیہ (اور ایک دوسری روایت کے مطابق شاطبہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کا وطن شاطبہ تھا اور اسی جگہ انہوں نے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ (فرانسیسی مستشرق کارادوو کے بیان کے مطابق انہوں نے سبتہ (سیوتا) اور غرناطہ میں تعلیم پائی) چند ہی سال میں وہ ایک محدّث، ادیب اور فقیہ کی حیثیت سے سارے ملک میں مشہور ہو گئے۔ چنانچہ غرناطہ کے گورنر ابوسعید بن عبدالمؤمن نے انہیں اپنا دبیرِ خاص (پرائیویٹ سیکرٹری) یا کاتب بنا لیا۔

ابنِ جُبَیر کا بیان ہے کہ "ایک دن میں اپنے آقائے ولی نعمت کے پاس بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ اس نے مستی کی حالت میں مجھے جامِ شراب پیش کیا، چونکہ میں نے آج تک شراب نہ پی تھی اس لیے میں نے اس کے پینے سے معذرت کردی لیکن میرے آقا نے قسم کھا کر کہا کہ تجھے سات بار پینا ہوگا۔ اپنے آقا کو غضبناک دیکھ کر مجھے انکار کی مجال نہ رہی۔ جب سات دَور ختم ہو چکے تو ایک اور جام میرے سامنے پیش کیا گیا لیکن یہ شراب کی بجائے اشرفیوں سے پُر تھا۔ میں نے یہ رقم لے لی۔ گھر لوٹا تو سخت شرمسار تھا کہ یہ میں نے کیا حرکت کی۔ سوچتے سوچتے میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اس رقم کو خرچ کر کے حج پر جاؤں گا اور اس طرح اپنے غیر ارادی

ارتکابِ گناہ کا کفارہ ادا کروں گا۔"

چنانچہ اس واقعہ کے بعد ابنِ جُبیر حج کے ارادے سے ۵۷۸ھ / ۱۱۸۳ء میں غرناطہ سے روانہ ہوئے۔ پہلے طریفہ اور پھر سبتہ پہنچے۔ وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے اسکندریہ میں وارد ہوئے۔ چونکہ اس زمانے میں عیسائیوں نے مکے کا عام رستہ بند کر رکھا تھا، اس لیے انہیں قاہرہ، قوص، عیذاب اور جدے کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ کوفہ، بغداد، موصل، حلب اور دمشق سے ہوتے ہوئے عکہ پہنچے اور وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے صقلیہ (سسلی) گئے۔ پھر قرطاجنہ کے راستے ۵۸۰ھ / ۱۱۸۵ء میں واپس غرناطہ پہنچے۔ اس کے بعد انہوں نے ۵۸۵ھ / ۱۱۸۹ء میں پھر مشرقی ممالک کی سیاحت کی اور ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء تک اس میں مصروف رہے۔ آخری بار انہوں نے ۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء میں مشرق کا سفر کیا۔ ابھی اسکندریہ (مصر) پہنچے تھے کہ آخری وقت آ پہنچا اور انہوں نے ۹ شعبان ۶۱۴ھ (مطابق ۱۳ نومبر ۱۲۱۷ء) کو اسکندریہ میں وفات پائی۔

ابنِ جُبیر نے اپنے تمام سفروں کے حالات ایک کتاب کی صورت میں قلمبند کیے جس نے "رحلۃ ابن جبیر" (سفرنامۂ ابنِ جُبیر) کے نام سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ اس کتاب کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ سفرنامہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں ابنِ جُبیر نے اپنے مشاہدات ایسی عمدگی سے پیش کیے ہیں کہ جن ممالک کی انہوں نے سیاحت کی ان کے سیاسی اور معاشرتی حالات کا ہو بہو نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ جس زمانے میں وہ صقلیہ (سسلی) گئے، مسلمانوں کے آفتابِ اقبال کو اس جزیرہ پر (تین سو سال چمکنے کے بعد) غروب ہوئے تقریباً ایک صدی گزر چکی تھی اور وہاں پر نارمن بادشاہ ولیم دوم "نیک نفس" (THE GOOD) کی حکومت تھی (۵۶۱ھ / ۱۱۶۶ء تا ۵۸۵ھ / ۱۱۸۹ء)۔

یہ سفرنامہ اس دور کے صقلیہ کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔

شروع شروع میں بعض لوگوں نے "سفرنامۂ ابنِ جُبَیر" پر کئی اعتراضات کیے اور لکھا کہ اس کا اندازِ بیان ناقص ہے اور مصنّف کی تنگ مزاجی اور کسالتِ طبع کی غمّازی کرتا ہے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس سفرنامے کی خوبیاں لوگوں پر آشکار ہوتی گئیں۔ اس میں انہوں نے ایسی مفید تفصیلات درج کی ہیں جو تاریخ کے طلبہ کے لیے نعمت غیر مترقّبہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ابنِ جُبَیر کے شاگردوں میں سے ابوتمام بن اسماعیل، ابن الواعظ ابوالحسن البجائی اور ابن ابی الغمر نے بڑی شہرت پائی۔

ابنِ جُبَیر فقہ و حدیث کے متبحر عالم تھے اور شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ضخیم دیوان اپنی یادگار چھوڑا۔

ابنِ جُبَیر اپنے نامور معاصر ابنِ رُشد کے سخت مخالف تھے، جب ابنِ رُشد پر خلیفہ یعقوب المنصور کا عتاب نازل ہوا تو انہوں نے اس پر یہ اشعار کہے:

لم تلزم الرشد یا ابن رشد
لما علا فی الزمان جدک
وکنت فی الدین ذا ریاء
ما ھکذا کان فیہ جدک

یعنی اے ابنِ رُشد جب تیرا زمانہ تھا تو تو نے رُشد و ہدایت کی پابندی نہیں کی، تو نے دین کے معاملہ میں ریاکاری اختیار کی تیرے دادا کا طریقہ یہ نہ تھا۔

الآن قد ایقن ابن رشد
ان تو الیفہ تو الف

یا ظالماً لنفسه تامل
هل تجد الیوم من تؤالف

یعنی اب تو ابن رشد کو یقین آگیا کہ اس کی تالیفات تلف ہوگئیں۔
اے وہ شخص جس نے اپنے اوپر ظلم کیا غور تو کر کہ اب تو کسی کو اپنا دوست پاتا ہے۔

لقد القضاء باخذ کل ممود
متفلسف فی دینه متزندق
بالمنطق اشتغلوا فقید حقیقة
ان البلاء موکل بالمنطق

یعنی تقدیر نے ہر ملمع ساز فلسفی کو جو فلسفہ کو مذہب سے ملانے والا زندیق ہے گرفتار کرا دیا۔ وہ منطق میں مشغول ہوئے اور یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ مصیبت کی جڑ منطق ہے۔

(حکمائے اسلام جلد دوم از مولانا عبدالسلام ندویؒ
بحوالہ رینان و فرح انطون)

علامہ عبدالواحد مراکشیؒ

علامہ الشیخ الفقیہ الحافظ المتقن الواعظ المفنن محی الدین ابو محمد عبدالواحد بن علی التمیمی المراکشی کا شمار عہدِ موحّدین کے نامور علماء و مؤرخین میں ہوتا ہے۔ وہ ابو یوسف یعقوب المنصور کے آغازِ حکومت میں (۷ ربیع الآخر ۵۸۱ھ کو) شہر مراکش میں پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر میں شہر فاس گئے اور وہاں کے بڑے بڑے علماء سے علومِ قرآن و تجوید حاصل کیے۔ پھر مراکش کو معاودت کی۔ ۶۰۳ھ؍۱۲۰۶ء میں اندلس گئے اور وہاں کے مشاہیر علماء و فضلاء سے ملے۔ ۶۱۰ھ؍۱۲۱۳ء میں مراکش آ کر امیر المؤمنین ابو یعقوب یوسف (ثانی) کی بیعتِ خلافت میں شریک ہوئے۔ ۶۱۱ھ؍۱۲۱۴ء میں امیر المؤمنین موصوف سے ملاقات کے بعد پھر اندلس گئے۔ کچھ عرصہ اشبیلیہ میں مقیم رہے اور ۶۱۳ھ؍۱۲۱۶ء میں عازمِ مصر ہوئے۔ چند سال مصر میں گزارے۔ ۶۲۰ھ؍۱۲۲۳ء میں حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی سال مغرب اور اندلس کی سیر و سیاحت میں گزارے۔ انہوں نے سفرِ آخرت کب اختیار کیا؟ اس کے بارے میں کسی مؤرخ یا صاحبِ تذکرہ نے کچھ نہیں بتایا۔ علامہ عبدالواحد نے اپنے قیامِ مصر کے دوران میں کتاب "المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" عربی زبان میں لکھی۔ اس کتاب کی بدولت انہیں ہمہ گیر شہرت نصیب ہوئی۔ "المعجب" کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر آر۔ پی۔ اے ڈوزی نے ۱۸۴۷ء میں لندن سے شائع کیا، اس انگریزی نسخے کا اردو ترجمہ پروفیسر

محمد نعیم الرحمان نے ۱۹۲۱ء میں مدراس سے شائع کیا۔ اس کا نام "خلافتِ موحدین" ہے۔ اس کتاب میں مغرب اور اندلس کے تاریخی حالات (۶۲۱ھ تک) نہایت خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔ چونکہ علامہ عبدالواحد خود خلفائے موحدین کے درباروں سے متعلق رہے ہیں، اس لیے موحدین کے بارے میں ان کی کتاب المعجب کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اپنی بعض خامیوں اور تسامحات کے باوجود یہ ایک نہایت دلچسپ اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ علامہ عبدالواحد کی کسی دوسری تصنیف کا سراغ نہیں ملتا۔

ابوموسیٰ عیسیٰ بن عبدالعزیز الجزولی

ابوموسیٰ عیسیٰ بن عبدالعزیز بن یللبخت بن عیسیٰ بن یومریلی الجزولی کا شمار یعقوب المنصور کے عہد کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔ ان کا سالِ ولادت معلوم نہیں البتہ بعض مؤرخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مراکش میں تعلیم حاصل کی، پھر حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد قاہرہ میں نامور لغوی ابومحمد عبداللہ بن بری اور شیخ ابومحمد بن عبیداللہ سے لغت اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قاہرہ سے بجایہ گئے اور کچھ عرصہ وہاں قواعدِ عربیہ پڑھانے میں گزارا۔ ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء میں الجزائر گئے، کچھ مدت وہاں قیام کے بعد اندلس پہنچے اور چند سال المریہ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بدقسمتی سے ان کی مالی حالت ہمیشہ نہایت سقیم رہی یہاں تک کہ اپنی قیمتی کتابیں لوگوں کے پاس رہن رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے افلاس کا علم شیخ ابوالعباس المغربیؒ کو ہوا تو انہوں نے الموحد فرمانروا کے پاس ان کی سفارش کی۔ اس نے انہیں مراکش بلا بھیجا اور مراکش کی مسجدِ جامع کا خطیب مقرر کر دیا۔ انہوں نے باختلافِ روایت ۶۰۶ھ / ۱۲۰۹ء یا ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء میں وفات پائی اور مندرجہ ذیل تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں:۔

(۱) کعبؓ بن زہیر کے قصیدہ بانت سعاد کی شرح۔

(۲) القانون (المقدمۃ الجزولیہ)۔ عربی قواعد کے بارے میں ہے۔ اس

کتاب نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔

(۳) القانون کی شرح۔

(۴) ابن السراج کی "الاصول" کی شرح (نحو)

(۵) امالی فی النحو۔

(۶) ابوالفتح عثمان بن جنی کی شرح دیوان المتنبی کا اختصار۔

شیخ ابوالعبّاس احمدؒ بن جعفر الخزرجی السبتی

شیخ ابوالعبّاس احمد بن جعفر الخزرجی السبتی کا شمار یعقوب المنصور کے عہد کے سرآمدِ روزگار مشائخ میں ہوتا ہے۔ وہ ۵۴۰ھ ہجری ۱۱۴۶-۴۵ء میں سبتہ (CEUTA) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انہوں نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں ابوعبداللہ الفخارؒ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو نامور فقیہ قاضی عیاضؒ کے شاگرد تھے مختلف علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد شیخ ابوالعباس احمدؒ نے ایک "فندق" کو اپنا مسکن بنایا اور اشاعتِ تعلیم کے ساتھ ساتھ اصلاح و تبلیغ میں مشغول ہو گئے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے درس میں دور دور سے طلبہ آنے لگے۔ مخیّر لوگوں نے ان کی درسگاہ کی دل کھول کر اعانت کی لیکن شیخؒ اس آمدنی کا بیشتر حصہ غیر ممالک کے طلبہ کی ضروریات پر صرف کر دیتے تھے اور اپنے پاس صرف اسی قدر رکھتے تھے جو ان کی معمولی گھریلو ضروریات کے لیے کافی ہو۔ شیخ ایک بلند پایہ عالم اور فصیح البیان خطیب تھے۔ تلاوتِ قرآن اور عبادتِ الٰہی سے ان کو خاص شغف تھا لیکن وہ رہبانیت (یا مطلق گوشہ نشینی) کے قائل نہیں تھے بلکہ درس و تدریس کے علاوہ شہر کے گلی کوچوں میں پھر کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کیا کرتے تھے۔ اگر ان کو کوئی تارکِ صلوٰۃ نظر آجاتا تو اس کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آتے اور بعض اوقات زد و کوب سے بھی دریغ نہ کرتے۔ شیخ بیواؤں

اور یتیموں پر نہایت شفیق تھے اور دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے ان کی مدد پر کمربستہ رہتے تھے۔ ان کے زہد و اتقا نے چند سال کے اندر اندر لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا لیکن ان کے ہمعصر شیوخ نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا کیونکہ ان کو خوف تھا کہ شیخ کا طریقہ اور مسلک ان کے اپنے طریقوں پر غالب آجائے گا، تاہم شیخؒ کی وفات کے بعد اہلِ مراکش نے ان کو اپنی عقیدت کا مرجع بنا لیا۔ "دائرہ معارفِ اسلامیہ" کے مطابق شیخؒ نے بروز دوشنبہ ۶ جمادی الاخریٰ سنہ ۶۰۱ھ (مطابق ۳۱ جنوری سنہ ۱۲۰۵ء) کو مراکش میں وفات پائی اور باب تازوت کے پاس مدفون ہوئے۔ مراکشی عوام کا عقیدہ ہے کہ انہیں ہواؤں پر پورا تسلط حاصل ہے چنانچہ وہ سمندر میں طوفان کو فرو کرنے اور ہواؤں کو چلانے میں ان سے استمداد کرتے ہیں۔ مراکش میں بعض مقامات پر نئی فصل آنے پر غلے کا پہلا پیمانہ شیخؒ کے نام پر خیرات کر دیا جاتا ہے۔

چند ہمعصر فرمانروا

جس زمانے میں ابُو یوسف یعقوب المنصورؒ شمالی افریقہ اور اندلس پر بڑے دبدبہ اور شان کے ساتھ حکومت کر رہا تھا، دنیا کی بہت کم حکومتیں وسعتِ سلطنت اور قوت و شوکت کے لحاظ سے دولتِ مؤحّدین کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی تھیں۔ یہاں یعقوب المنصورؒ کے چند ہمعصر فرمانرواؤں کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(یعقوب المنصورؒ کا زمانہ حکومت ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء ہے)

خلافتِ بغداد کا سربراہ الناصر لدین اللہ احمد ابو العباس بن المستضیٔ بامر اللہ تھا۔ وہ عباسی خاندان کا چوبیسواں خلیفہ تھا۔ ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء میں پیدا ہوا، ۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء میں مسندِ خلافت پر بیٹھا اور ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں وفات پائی۔ اس کا عہدِ حکومت تمام عباسی خلفاء میں سب سے طویل تھا۔ اس کے زمانہ میں صلیبی جنگوں (THE CRUSADES) یا (HOLY WARS) کا بڑا زور رہا۔ سلطان طغرل ثانی بن شاہ ارسلان بن سلیمان شاہ بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی نے وفات پائی (۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء) اس کے ساتھ ہی عراق و کردستان میں سلجوقی خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور تاتاریوں نے بلادِ اسلامیہ پر حملے شروع کر دیئے۔ بہر صورت اس کے زمانے میں خلافت بغداد کی سطوت کا بھرم قائم رہا کیونکہ مصر، شام اور یمن کا طاقتور فرمانروا مجاہدِ اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی خلافت عباسیہ کا اطاعت گزار اور پشت پناہ تھا۔ تاریخِ اسلام کے اس بطلِ جلیل نے مصر

کی فاطمی خلافت کو ۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء میں ختم کر کے وہاں خلیفہ عباسی کا خطبہ جاری کیا۔ ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء میں یوروشلم (بیت المقدس) کو عیسائیوں سے چھین لیا اور سالہا سال تک ارض شام و فلسطین پر تمام مسیحی دنیا کی یلغار کا ایسی ہمت اور عزم کے ساتھ مقابلہ کیا کہ حملہ آوروں کے دانت کھٹے ہو گئے اور وہ خاک نامرادی چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔ صلاح الدین ایوبیؒ کے بعد اس کی اولاد اور اقربا میں سے ملک العزیز عماد الدین عثمان، محمد المنصور، ملک العادل سیف الدین ابوبکر (مصر) ملک الظاہر غیاث الدین غازی (حلب)، ملک المظفر تقی الدین عمر، ملک المنصور محمد (حماۃ) اور المجاہد شیرکوہ (حمص) یعقوب المنصورؒ کے ہم عصر تھے۔

سلاجقۂ ارض روم میں عز الدین قلیج ارسلان ثانی، قطب الدین ملک شاہ ثانی اور غیاث الدین کیخسرو یعقوب المنصور کے ہم عصر تھے۔ شمالی ہندوستان اور افغانستان پر غوری خاندان کی حکومت تھی۔ اسی زمانہ میں (۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں) شہاب الدین غوری نے تراوڑی کے میدان میں پرتھوی راج اور ۱۵۰ دوسرے ہندو راجاؤں کو فیصلہ کن شکست دی اور اس کے بعد قنوج گوالیار، بندھیلکھنڈ بہار و بنگال وغیرہ بھی فتح کر لیے۔

فارس پر سلغری خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے تکلا اور سعد یعقوب المنصور کے ہمعصر تھے۔ اسی سعد کے بیٹے ابوبکر کے دربار سے شیخ سعدیؒ وابستہ تھے۔

خوارزم (خیوا) خراسان، رے اور اصفہان پر خوارزم شاہی خاندان حکمران تھا، اس خاندان کا سلطان تکوش (۵۶۸ھ / ۱۱۷۲ء تا ۵۹۶ھ / ۱۱۹۹ء) یعقوب المنصور کا ہمعصر تھا۔

جزائر برطانیہ پر پلینٹیجنٹ (PLANTAGENT) خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کے ہنری دوم اور رچرڈ (اول) شیر دل (RICHARD THE LION HEART) یعقوب المنصور کے ہمعصر تھے۔ یہ رچرڈ اول وہی ہے جو تیسری صلیبی جنگ میں

خود شریک ہوا، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ سے شکست کھائی اور اپنی بہن کی شادی سلطان کے بھائی سے کر کے واپس ہوا۔

جرمنی پر فریڈرک اوّل کی حکومت تھی۔ وہ اپنے سرخ بالوں کی وجہ سے باربروسا (سرخ ریش) کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ اپنے آپ کو مسیحیت کا محافظ اور "جنگِ مقدس" کا مجاہد کہتا تھا۔ چنانچہ اس نے تیسری صلیبی جنگ کی قیادت سنبھالی اور ۱۱۸۹ء میں مسیحی جنونیوں کا ایک جرار لشکر لے کر شام کا رخ کیا۔ اثنائے سفر میں سلوسیا کے قریب دریائے سلاف کو عبور کرتے وقت غرق ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ہنری ششم رومن بادشاہ کی حیثیت سے جرمنی کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۱۱۹۷ء میں وفات پائی۔

ایشیائے کوچک کی یونانی سلطنت کے بادشاہ الیکزیس دوئم، اندرونکس اوّل اور اسحاق دوئم یعقوب المنصور کے ہم عصر تھے۔

فرانس پر ہیوکیپے (HUGH CAPET) خاندان حکومت کر رہا تھا۔ اس خاندان کا بادشاہ فلپ دوئم (۱۱۸۰ء تا ۱۲۲۳ء) یعقوب المنصور کا ہمعصر تھا۔ ۱۱۸۹ء میں اس نے بھی رچرڈ اوّل شاہ انگلستان اور فریڈرک باربروسا شہنشاہ جرمنی کے ساتھ مل کر تیسری صلیبی جنگ میں حصہ لیا۔ یہ مہم سراسر ناکام رہی اور یورپ کا متحدہ صلیبی لشکر صلاح الدین ایوبیؒ کے آہنی عزم و ہمت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا۔

اٹلی میں وہاں کے بادشاہوں اور پوپوں کے درمیان قوت و اقتدار کے لیے رسہ کشی ہو رہی تھی۔ اس میں صلیبی جنگوں کی وجہ سے پوپوں کا پلہ بھاری تھا۔ جنوبی اٹلی اور سسلی پر نارمن حکمران تھے۔ ان کی حکومت ۱۱۹۴ء تک قائم رہی۔ یہ لوگ بڑے طاقتور تھے اور انہوں نے اپنا دائرۂ اقتدار شمالی

افریقہ کے ساحلوں تک بڑھا لیا تھا لیکن الموحدین نے شمالی افریقہ سے ان کو بزورِ شمشیر نکال دیا۔ نارمن فرمانروا ولیم دوم (۱۱۶۶ء تا ۱۱۸۹ء)، ٹانکرڈ (۱۱۹۰ء تا ۱۱۹۲ء) اور ولیم ثالث (۱۱۹۲ء تا ۱۱۹۴ء) یعقوب المنصور کے ہمعصر تھے۔ نارمنوں کے بعد شہنشاہِ جرمنی ہنری ششم (۱۱۹۴ء تا ۱۱۹۷ء) نے سسلی پر قبضہ کر لیا۔ وہ بھی یعقوب المنصور کا ہمعصر تھا۔

ان حکمرانوں کے علاوہ دنیا کے مختلف علاقوں پر اور بھی چھوٹے چھوٹے خاندان طبل وعَلَم کے مالک تھے لیکن تاریخ میں ان کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔

کتابیات

اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں جن کتابوں سے خاص طور پر (براہِ راست یا بالواسطہ) استفادہ کیا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں :۔

(۱) تاریخ الکامل (الکامل فی التاریخ) — ابن اثیر جزری
(۲) تاریخ ابنِ خلدون
(۳) وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان — ابنِ خلکان ؒ
(۴) عیون الانباء فی طبقات الاطبّاء — ابن ابی اصیبعہ
(۵) اخبار العلماء باخبار الحکماء — جمال الدین ابو الحسن علی قفطی
(۶) البیان المغرب ابن العذاری مراکشی
اردو ترجمہ "تاریخ مغرب" مترجمہ محمد جمیل الرحمٰن
(۷) المعجب فی تلخیص اخبار المغرب — عبدالواحد مراکشی
اردو ترجمہ "خلافتِ مُوحّدین" — مترجم محمد نعیم الرحمٰن
(۸) تاریخ تمدّنِ اسلام — جرجی زیدان
(۹) دعوتِ اسلام — ڈاکٹر آرنلڈ مترجمہ مولوی عنایت اللہ
(۱۰) عبرت نامۂ اندلس — پروفیسر ائن ہارٹ ڈوزی ترجمہ عنایت اللہ
(۱۱) تمدّنِ عرب — ڈاکٹر گستاولی بان۔ مترجمہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی
(۱۲) تاریخ اندلس — سید ریاست علی ندوی

(۱۳) اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ — دانش گاہ پنجاب

(۱۴) اسلامی آرٹ اور فنِ تعمیر — ارنسٹ کنہل
مترجم مولانا غلام طیب

(۱۵) "نگار" فرمانروایانِ اسلام نمبر — مرتبہ نیاز فتح پوری

(۱۶) "نگار" علومِ اسلامی و علماءِ اسلام نمبر — مرتبہ نیاز فتح پوری

(۱۷) تاریخِ صقلیہ — سید ریاست علی ندوی

(۱۸) علماءِ سلف و نابینا علماء — نواب صدر یار جنگ
مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۹) مقالاتِ شبلی — شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۰) حکمائے اسلام — عبد السلام ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۱) سیرِ رجال — عبد الحلیم شرر

(۲۲) تاریخِ مراکش — کرنل اسمٰعیل بیگ

(۲۳) تاریخِ فلسفۂ اسلام — ڈاکٹر سید عابد حسین

(۲۴) مختصر تاریخ صحرائیانِ عرب — سید امیر علی

(۲۵) تاریخ مسلمانانِ عالم — کارل بروکلمین

(۲۶) عربوں کی مختصر تاریخ — فلپ کے حتی

(۲۷) تاریخ عالم انسائیکلوپیڈیا — مولانا غلام رسول مہر مرحوم

(۲۸) ائمۂ تلبیس — مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم

(۲۹) تاریخ اسلام — شاہ معین الدین احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۳۰) تاریخ اسلام — مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی

(۳۱) ابنِ رُشد — مولوی محمد یونس انصاری

(۳۲) تاریخ اندلس ——— عبدالرحیم درد

(۳۳) اقصائے مغرب یا تاریخ افریقہ ——— حامد علی صدیقی سہارنپوری

ان کتابوں کے علاوہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ، "فاران" کراچی "بینات" کراچی اور "المعارف" لاہور وغیرہ کے کئی پرچوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

		رُوپے
(۱)	سیرت حضرت سعدؓ بن ابی وقاص	۱۶/-
(۲)	سیرت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ	۲۰/-
(۳)	سُلطان نورُالدین محمُود زنگیؒ	۲۰/-
(۴)	الملک الظاہر بیبرسؒ	۲۰/-
(۵)	ملک شاہ سلجوقی	۱۲/-
(۶)	سیرت حضرت ابُو ایوب انصاریؓ	(زیر طبع)

قومی کُتب خانہ ○ لاہور

سیرتِ میزبانِ رسولؐ :

حضرت ابُو ایّوب انصاریؓ

سنہ ۱۲ نبوت میں جب فضائے مکہ پر مشرکین قریش کے زہرہ گداز جور و ستم اور شقاوت کی تیرہ و تار گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور انسان نما درندے خدائے واحد کے پرستاروں کو کھا جانے پر تُلے بیٹھے تھے۔ اسی سال کے موسم حج میں یثرب سے ایک قافلہ میں چھپتر نفوس قدسی مکہ پہنچے اور ایک رات رحمتِ عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ہاتھ حضورؐ کے دستِ مبارک میں دے دیے اور عہد کیا کہ آپ یثرب تشریف لائیں تو اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپ کی حفاظت اور اعانت کریں گے۔ بیعتِ عقبہ کبیرہ میں شریک ان چھپتر سعید الفطرت یثربیوں میں بنو نجار کے رئیس ابو ایوبؓ بھی تھے ——— اور ——— پھر جب سید الانبیاءؐ کی ہجرت مقدسہ کے بعد زمینِ یثرب رشکِ فلک بن گئی تو یہی **ابُو ایوبؓ** تھے جن کے گھر میں ماہِ رسالتؐ نے پورے سات ماہ ضیا باری کی اور اس طرح اُن کو اُس ذاتِ اقدسؐ کا میزبان بننے کا لازوال شرف حاصل ہوا جو باعثِ تکوینِ روزگار ہے۔ اسکے بعد حضرت ابُو ایوبؓ نے بدر سے بیعتِ رضوان تک اور فتح مکہ سے حجۃ الوداع تک ہر موقع پر رحمتِ عالمؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد بھی جہاد فی سبیل اللہ کے شوق نے انھیں گھر میں نہ بیٹھنے دیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۵۰-۵۱ھ میں جب ایک بحری مہم تسخیر قسطنطنیہ کیلیے روانہ ہوئی تو وہ اپنی ضعیف العمری کے باوجود اس میں بھی شریک ہو گئے اور میدانِ جہاد میں ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ———

یہ **کتاب** اسلام کے اسی بطلِ جلیل کی سیرت ہے۔ جناب طالب ہاشمی نے اُسے بڑی محبت، عقیدت، تحقیق اور تفحص کیساتھ قلم بند کیا ہے اور اسکو تاریخ اور سیرت کا ایک حسین امتزاج بنا دیا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے آپ بلا مبالغہ کیف و سرور کے ایک ایسے چمن زار میں پہنچ جائیں گے جس کے گلہائے رنگا رنگ سے آپ کی آنکھوں کو طراوت حاصل ہوگی اور جنکی دلآویز خوشبو آپکے مشامِ جان کو معطر کر دیگی!

ناشر: **قومی کتب خانہ۔ لاہور**